بسم الله الرحمن الرحيم

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو

مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

نگران	مقالہ نگار
پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی	احمد اقبال
شعبۂ اُردو۔ جامعہ پشاور	(ریسرچ سکالر)
	شعبۂ اُردو۔ جامعہ پشاور

ادارہ ادبیاتِ اُردو زبان، جامعۂ پشاور

۲۰۱۴۔۱۵

ترتیبِ ابواب

دیباچہ

اُردو ادب میں مستنصر حسین تارڑ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔اُنہوں نے ناول نگاری، افسانہ نگاری، صحافت، ڈرامہ نگاری غرض اُردو ادب کے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے مگر اُن کا اصل میدان سفر نامہ نگاری ہے جس میں اُن کا نام ایک درخشاں ستارے کی مانند جگمگا رہا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ وہ واحد سفر نامہ نگار ہیں جنہوں نے اُردو سفر نامے کو نہ صرف بامِ عروج پر پہنچایا بلکہ اُنہوں نے سفر نامے کو ایک ایسے رنگ، ایک ایسی منزل اور ایک ایسی جہت سے آشنا کیا جن کا وجود سر تا پا مستنصر حسین تارڑ کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے منفرد اُسلوب اور طرز تحریر کی بدولت اپنے تجربات، مشاہدات، تاثرات اور روز مرہ واقعات کی تخیّل کے امتزاج سے ایسی جاندار عکاسی کی ہے کہ پاکستان کے شمال کا ہر رنگ اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے گردو پیش کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا۔ سماج کو ایک نباض کی نظر سے جانچا اور پرکھا۔ زندگی کے تمام پہلوؤں اور جہتوں کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ زمین اور اہلِ زمین کو آسمان کی بلندیوں اور رفعتوں سے نہیں بلکہ زمین کا باسی ہو کر دیکھا پھر تلخ و شیریں تجربات اور مشاہدات کے بعد ان کو سپردِ قلم کرکے قارئین کے سامنے پیش کیا نتیجتاً ان کی ہر تحریر اور ہر تخلیق تجربات اور مشاہدات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گئی جس نے نہ صرف انسان کے قلب و ذہن کو جھنجھوڑا بلکہ اُس کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے جسم و جاں کا جزوِ لاینفک بن کر اور اس کے خمیر میں رَچ بَس کر اس کے کردار کی تعمیر و تشکیل کا ایک بنیادی عنصر بن گیا۔

مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں پر اگرچہ ایم فل کی سطح پر ایک مقالہ لکھا جا چکا ہے مگر مقالہ کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مقالہ مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا کماحقہٗ جائزہ لینے سے قاصر رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مقالہ صرف اور صرف مستنصر حسین تارڑ کے فنی محاسن کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو اُن کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کی بلامبالغہ یک رخی تصویر ہے علاوہ ازیں ایم فل سطح کا یہ مقالہ مستنصر حسین تارڑ کے لکھے ہوئے صرف نو سفر ناموں تک محدود ہے حالانکہ مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں میں ” راکاپوشی نگر، دیوسائی اور سنولیک جیسے مشہور و معروف اور ضخیم سفر ناموں سمیت کل

بارہ سفر نامے شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے خود بارہا اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ اُنہوں نے شمالی علاقہ جات کے بارے میں کل بارہ سفر نامے لکھے ہیں۔ مذکورہ مقالے میں اِن تین مشہور اور ضخیم سفر ناموں کی عدم شمولیت مقالے کی صحت و قطعیت پر سوالیہ نشان چھوڑتے ہیں۔ ان تمام نکات کو ذہن میں رکھ کر اس بات کی اشد ضرورت محسوس کی گئی کہ پی ایچ ڈی سطح پر کوئی ایسا جامع اور مبسوط مقالہ تحریر کیا جائے جس میں مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا ہر پہلو سے اس طرح تفصیلی جائزہ لیا گیا ہو کہ آج کے قاری کو کہیں پر بھی تشنگی کا احساس نہ ہو۔

مستنصر حسین تارڑ کے بارے میں میری تحقیق کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب میں نے مستنصر حسین تارڑ کی سفری تخلیقات کا شمالی علاقہ جات کی روشنی میں جائزہ لیا تو مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ موصوف نے شمالی علاقہ جات کی معاشرت، ثقافت، رسوم و رواج، برفیلی چوٹیوں، بلند وبالا کوہساروں، جھلملاتی جھیلوں، سرسبز وادیوں، یخ بستہ چشموں، گنگناتے جھرنوں اور وہاں کے باسیوں کے مزاج، نشست و برخاست، بودوباش اور طرزِ زندگی کی ہو بہو تصویریں اپنے سفر ناموں میں پیش کی ہیں جس کی تصدیق کا پیمانہ چنداں مشکل نہیں۔ ایک عام شخص بھی کسی بھی وقت شمالی علاقہ جات کی سیر کرکے اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

اِن تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے ایک محقّق کی حیثیت سے یہ ضروری جانا کہ اگر مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا شمالی علاقہ جات کی تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور اُن میں مماثلت اور مطابقت ڈھونڈ کر اُسے ثبوت کے ساتھ آج کے قاری کے سامنے پیش کیا جائے تو میرے خیال میں اِس عظیم سفر نامہ نگار سے متعلق ادب میں نئے باب کا ایک خوشگوار اضافہ ہو گا علاوہ ازیں اس تمام تحقیقی منصوبے کا مقصد یہ بھی ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کے اُس تخلیقی عمل تک پہنچنے کی کوشش بھی کی جائے کہ اُنہوں نے اپنے سفری تجربات، مشاہدات اور حقیقی زندگی کو تخیّل اور افسانوی رنگ کے امتزاج سے کیسے اور کیوں کر پیش کیا ہے کہ کہیں پر بھی حقائق کے مسّخ ہونے کا گمان نہیں گزرتا۔

میں نے اپنے اس تحقیقی مقالے بعنوان" مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح باب اوّل کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصلِ اوّل میں ' حیاتِ مستنصر حسین تارڑ' کے عنوان کے تحت اُن کی ابتدائی زندگی پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ فصلِ دوم میں اُن کی ادبی و فنی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے جس

میں اُن کی ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری بالخصوص سفر نامہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے نیز اُن کی کامیابیوں کے ضمن میں اُن کے اعزازات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

باب دوم میں ' فنِ سفر نامہ نگاری ' کا بنظرِ عمیق اور بہ نگاہِ تحقیق جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ باب تین فصلوں میں منقسم ہے۔ فصلِ اوّل میں سفر کی تعریف و توضیح، سفر نامے کی ابتدا اور تاریخی ارتقاء اور سفر کی مختلف قسموں کا بیان ہوا ہے۔ فصل دوم میں اُردو سفر نامے کی ابتدا ، سر سید اور عہد سر سید کے سفر نامے اور عبوری دور کے سفر ناموں کا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ فصل سوم میں قدیم اور جدید سفر نامہ ، سفر نامے کے فنی لوازمات و تکنیک اور دور جدید کے سفر ناموں کا تفصیلاً تذکرہ موجود ہے۔

باب سوم میں ' پاکستان کے شمالی علاقہ جات ' کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے فصل اوّل میں شمالی علاقہ جات کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ فصل دوم میں شمالی علاقہ جات کی زبانوں، اشاعتِ اسلام ، ثقافت اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ فصل سوم میں شمالی علاقہ جات کی مشہور جھیلوں، پہاڑی سلسلوں، مشہور چوٹیوں ، گلیشیئرز اور پہاڑی درّوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

باب چہارم کو بھی تین فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصلِ اوّل ' مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری کے بارے میں ہے جس میں مستنصر حسین تارڑ کے تمام سفر ناموں کا مختصراً تعارف پیش کیا گیا ہے۔ فصلِ دوم میں مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا فکری جائزہ پیش کیا گیا ہے اور " تاریخی و جغرافیائی معلومات، تہذیب و معاشرت اور ثقافت کی عکاسی، جنس نگاری، زبان و بیاں اور اُسلوب ، انسانی نفسیات کی عکاسی، حُب الوطنی اور تحیر و تجسس " جیسے ذیلی عنوانات کے تحت مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اس طرح فصل سوم میں مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور منظر نگاری، کردار نگاری، طنز و مزاح، جزئیات نگاری، شعری تراکیب کا استعمال، مبالغہ آرائی اور علم بیاں اور دیگر صنعتوں کا استعمال" جیسے ذیلی عنوانات کے تحت مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کے فنی محاسن اُجاگر کیے گئے ہیں۔

باب پنجم میں مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے اور دلیل و براہین کے ساتھ اُن کے تمام سفر ناموں کی روشنی میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ آخر میں اُن کتابوں، رسالوں، اخبارات، لغات، انٹرنیٹ ویب سائٹس کی تفصیل و فہرست پیش کی گئی ہے جن سے اِس مقالے کی تیاری اور تکمیل میں مدد لی گئی ہے۔

بفضلِ خالقِ کون و مکاں اور مالکِ دو جہاں میں نے یہ مقالہ مشفق اُستاد اور کرم فرما پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی صاحب، شعبۂ اُردو جامعہ پشاور کے زیرِ نگرانی مکمل کیا۔ موصوف کی محبت و شفقت، حوصلہ افزائی اور رہنمائی اول تا آخر میری مدد و معاون رہی اور میں یہ بات بلا مبالغہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی گراں قدر رائے، مشورے، ہدایت اور رہنمائی کی بدولت ہی مَیں تحقیق جیسے کٹھن، محنت طلب اور دشوار گزار کام سے بحسن و خوبی عہدہ بر آ ہوا۔ مَیں نے جب بھی اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کیا اُنھوں نے ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی، خوش دلی اور شفقت آمیز انداز میں نہ صرف میری معاونت کی بلکہ میری ہمت افزائی کر کے مجھے جلد سے جلد کام کرنے کی ترغیب بھی دی جس کے لیے میں دل کی گہرائیوں سے ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں۔

اس موقع پر مَیں پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین اور پروفیسر سید بادشاہ منیر بخاری صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جن کے زیرِ سایہ شعبۂ اُردو جامعہ پشاور میں مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور جن کی علمیت، تجربے، افکار اور فیضِ صحبت سے مَیں نے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

تحقیق کے دوران مواد کے حصول کے لیے مَیں نے متعدد لائبریریوں کی خاک بھی چھانی ہے جن میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پبلک لائبریری لکی مروت، شعبۂ اُردو لائبریری یونیورسٹی آف پشاور، لائبریری جامعہ قرطبہ پشاور اور آرکائیوز لائبریری پشاور بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں جامعہ پشاور کی سینٹرل لائبریری سے میں نے بطور خاص استفادہ کیا ہے یہاں مجھے اپنے مواد کے سلسلے میں کافی مدد ملی۔

تحقیقی کام کے سلسلے میں مجھے جن قریبی دوستوں کی طرف سے بھرپور تعاون ملا اُن میں پروفیسر محمد سیلم صاحب، اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج کوہاٹ، برہان اللہ صاحب اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج سکندر بالا بنوں، پروفیسر محمد یوسف خان صاحب گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج لکی مروت اور پروفیسر انور بابر صاحب گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج لکی مروت کے نام گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میں اِن احباب کا زیرِ بار ہوں جن کی تجاویز اور بعض کتب کی فراہمی نے یقیناً میرے کام کو آسان بنا دیا ہے۔

یکم اگست ۲۰۱۷ احمد اقبال

باب اوّل

مستنصر حسین تارڑ کی سوانحِ حیات

فصل اوّل

ابتدائی حالات:

مستنصر حسین تارڑ کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے کسی علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ نہیں کھولی بلکہ اُن کا تعلق ایک عام تجارت پیشہ خاندان سے تھا۔ مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ ۱۹۳۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد رحمت خان تارڑ کا تعلق گجرات کے گاؤں جھالیہ سے تھا جہاں وہ کاشتکاری کا کام کرتے تھے۔ وہ اپنے پورے خاندان میں واحد شخص تھے جنھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مستنصر حسین تارڑ کا دادا چودھری امیر بخش بھی ایک عام زمیندار تھا البتہ آپ کی دادی جان کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا جس کی وجہ سے مستنصر حسین تارڑ کے والد رحمت خان میٹرک تک تعلیم حاصل کر پائے۔

مستنصر کے والد گجرات سے لاہور منتقل ہوئے اور یہاں اُنھوں نے 'کسان اینڈ کو' کے نام سے پھلوں اور سبزیوں کے بیج فروخت کرنے کا کاروبار شروع کیا جلد ہی اس کا کاروبار پھلا پھولا اور ایک نامی گرامی کاروباری کے طور پر مشہور ہو گئے۔ مستنصر کے والد کو زراعت سے کافی لگاؤ تھا اسی رغبت اور لگاؤ کا نتیجہ ہی تھا کہ اُنہوں نے زراعت کی تکنیک اور جدید اُصولوں پر پچیس سے زیادہ کتابیں لکھیں ساتھ ہی اُنہوں نے کسانوں کی رہنمائی اور ترغیب کے لیے ایک رسالہ "کاشت کارِ جدید" کا اجراء کیا۔ اس رسالے کی وجہ سے مستنصر حسین تارڑ کی طبیعت رسالوں کی جناب مائل ہوئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ۳۴ رسالوں کا مستقل خریدار بن گیا۔ مستنصر خود بھی ان رسالوں کے لیے لطیفے، چٹکلے اور کہانیاں بھیجا کرتا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ نے اسی زمانے میں ایک دوست کے توسط سے لائبریری جانا شروع کیا جہاں وہ روسی ادب سے متعارف ہوا۔

مستنصر حسین تارڑ کا تعلق چونکہ آسودہ حال زمیندار خاندان سے تھا اور اس کے دادا امیر بخش اپنے نام کے ساتھ چودھری لکھتے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی آغاز جوانی میں اپنے نام کے ساتھ چودھری لکھنا شروع کیا وہ اکثر و بیشتر ایم۔ ایچ چودھری یعنی مستنصر حسین چودھری لکھا کرتے تھے لیکن جب ادبی میدان میں قدم رکھا تو جاٹ قوم سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ اپنے نام کے ساتھ تارڑ لکھنے لگے اور یوں وہ اُردو ادب میں مستنصر حسین تارڑ کے زندہ جاوید نام سے مشہور ہو گئے۔

مستنصر حسین تارڑ کے والد رحمت خان نے لاہور میں بیڈن روڈ پر واقع لکشمی مینشن میں گھر لیا تھا یہیں پر مستنصر حسین تارڑ کا بچپن گزرا۔ مستنصر حسین تارڑ کے پڑوس میں اُردو ادب کا عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی رہائش پذیر تھا۔ ایک بار قاسم علی نے مستنصر حسین تارڑ کا انٹرویو لیا تھا۔ یہ انٹرویو اُردو رسالہ ' ہلال میں شائع بھی ہوا تھا جس میں قاسم علی نے مستنصر حسین تارڑ سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا اُنہوں نے سعادت حسن منٹو کو اپنے پڑوس میں دیکھ کر یا اُنہیں اپنا آئیڈیل سمجھ کر ادبی دنیا سے ناطہ جوڑا تھا جس کے جواب میں مستنصر حسین تارڑ نے ادبی دنیا سے تعلق کو محض اتفاق کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "مجھے بچپن میں ادیب بننے کا قطعی طور پر کوئی شوق نہیں تھا۔ میں اگر لٹریچر یا میڈیا کی دنیا میں آیا تو یہ محض اتفاق ہے۔ میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ میں حادثاتی ہوں۔ ایک منصوبہ بند یا پلینڈ ادیب نہیں ہوں۔ بچپن میں مجھے بہت ساری چیزوں کا شوق تھا۔ میں سکے جمع کرتا تھا، ڈاک ٹکٹ جمع کرتا تھا، فلمی ہیروئنز کی تصاویر جمع کرتا تھا، ایکٹنگ کا شوق تھا۔ چنانچہ شوق تو بہت سارے تھے لیکن ان میں پڑھنے کا شوق جو تھا وہ بہت شدت سے تھا اور وہ ابھی تک شدت کے ساتھ چلا آرہا ہے"۔ ؎۱

مستنصر حسین تارڑ نے جہاں بچپن میں اپنے بہت سے شوقوں کا ذکر کیا ہے وہاں اُنہوں نے واضح طور پر بتایا ہے کہ وہ بچپن میں مطالعہ کے حد سے زیادہ شوقین رہے ہیں۔ آٹھویں جماعت سے اُنہوں نے اُردو ادب کے مشہور و معروف ادیبوں کی تصنیفات کا مطالعہ شروع کیا جب کالج میں پہنچے تو نہ صرف ذوقِ مطالعہ مزید بڑھا بلکہ مطالعہ میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُنہوں نے یورپین اور روس کے تمام ادیبوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ اپنے مطالعہ کے شوق کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ خود رقم طراز ہیں:

> "مجھے مطالعے کا شروع سے بڑا شوق رہا ہے۔ اے حمید اور اشفاق احمد کو میں نے آٹھویں جماعت سے پڑھنا شروع کیا۔ منٹو، بلونت سنگھ اور کرشن چندر میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ کالج میں یورپی ادب اور خصوصاً روسی ادب پڑھا اور تقریباً تمام بڑے ادیبوں کو پڑھ ڈالا۔۔۔۔ میرے ادبی مرشد ٹالسٹائی اور دوستوفسکی ہیں۔ میں نے دوستوفسکی سے صبر واستقامت سیکھی۔ ؎۲

مستنصر حسین تارڑ نے دوسرے بچوں کی طرح دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مسجد بھی جانا شروع کیا مگر مولوی صاحب کے سخت گیر رویے نے مستنصر حسین تارڑ کو باغی بنادیا۔ مولوی صاحب کا پر تشدد رویہ مستنصر کی یادوں سے کبھی نہ مٹ سکا۔ اس بارے میں اُنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیاہے:

"پہلے مجھے مسجد میں داخل کرادیا گیا جہاں میں نے قرآن پاک پڑھا، نماز سیکھی لیکن حسب معمول مولانا کا جو پر تشدد رویہ تھا اس نے مجھے باغی بنادیا"۔ ۳؎

اس کے بعد مستنصر کو مشن ہائی اسکول رنگ محل میں داخل کرادیا گیا یہاں کا ماحول مستنصر کے مزاج کے بالکل مطابق تھا کیونکہ یہاں اُنہیں پڑھانے کے لیے نہ صرف انگریز اُستانیاں ملازم رکھی گئی تھیں بلکہ اس سکول میں ماڈرن سکولوں کی طرح کرسی اور بینچ کی سہولت بھی میسر تھی۔ رنگ محل سکول کے بعد مستنصر کے والد گکھڑ منتقل ہوگئے اور وہاں " رچنا نرسری فارم" کے نام سے ایک سیڈ فارم قائم کیا۔ مستنصر بھی والد کے ساتھ یہاں چلے آئے اور آپ کو سرکاری سکول میں بھی داخل کر دیا گیا جو مکمل طور پر ایک ٹاٹ سکول تھا۔ گکھڑ مستنصر کا ننھیال تھا اور اس کے نانا اس علاقے کے نمبر دار تھے۔ یہاں مستنصر نے دوسال گزارے۔ کچھ عرصہ رنگ محل مشن سکول میں پڑھا اس کے بعد مسلم ماڈل ہائی سکول میں میٹرک تک پڑھتے رہے۔ جہاں اکثر بچے اُنہیں چھیڑتے تھے۔ مستنصر سکول کے زمانے کی یادوں کو دہراتا ہوا کہتا ہے :

"میرا گھرانہ معاشی طور پر قدرے آسودہ حال تھا، میرے نانا بھی نمبردار تھے چنانچہ سکول میں لٹھے کی شلوار اور اس کے اوپر چھوٹی سی اچکن پہن کر جاتا تھا جبکہ میرے کچھ ہم جماعت لمبی قمیص پہنتے تھے کہ شاید نیچے کچھ نہ پہننا پڑے۔ وہ مجھے چھیڑتے رہتے تھے اور ہمیشہ سونے کی چڑیا کہتے تھے۔ میں روتا ہوا گھر آتا تھا۔ اس کے بعد میں پھر رنگ محل مشن ہائی سکول آیا یہاں پر مجھے پینڈو کہا جانے لگا کیونکہ گاؤں میں رہنے سے میرا لہجہ پنجابی ہو گیا تھا، تو میں نے ساری عمر سونے کی چڑیا اور اس پینڈو کے درمیان گزاری ہے۔ مجھے کہیں بھی کھلے دل سے قبول نہیں کیا گیا۔ نہ شہر والوں نے کیا نہ گاؤں والوں نے کیا"۔ ۴؎

مستنصر نے میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور ایف اے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ اور یورپ کے سفر کی ٹھان لی۔ پانچ چھے سال وہاں قیام پذیر رہے۔ فلمیں دیکھتے رہے، تھیٹر سے جی بہلاتے رہے، کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ ۱۹۵۷ء میں ماسکو میں ورلڈ یوتھ فیسٹیول کا انعقاد ہو رہا تھا۔ دوسرے دوستوں کے ہمراہ مستنصر نے بھی درخواست جمع کرائی۔ خوش قسمتی سے مستنصر کا نام نوجوانوں کے وفد میں شامل ہوا۔ ماسکو دیکھنے کا تجربہ جہاں مستنصر کے لیے خوشگوار ثابت ہوا وہاں اس سفر نے اُن کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا۔ ”نوائے وقت“ کے مدیر مجید نظامی صاحب جو ان دنوں لندن میں اپنے اخبار کے نمائندہ تھے۔ اُنھوں نے مستنصر حسین کو روس کا سفر نامہ لکھنے کی ترغیب دی اور یوں مستنصر نے ”لندن سے ماسکو تک“ نامی سفر نامے کی صورت میں اپنی زندگی کی پہلی تحریر لکھی جو تین اقساط میں ”قندیل“ میں شائع ہوئی۔ مستنصر حسین تارڑ برطانیہ سے ٹیکسٹائل انجنیئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کر کے اپنے وطن واپس لوٹ آئے۔

علی اصغر عباس مستنصر حسین تارڑ کی زبانی اُن کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے گویا ہیں:

> ”ثانوی درجہ پاس کر کے تارڑ نے گورنمنٹ کالج میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں ”رتّی گلی“ سر کر ڈالی۔ لڑکپن کی اس مہم جوئی نے اس کے اندر کے طالب علم کو آوارہ گرد بنا دیا جو انگلینڈ میں ٹیکسٹائل انجنیئرنگ کا ڈپلومہ لینے گیا تو اپنا وقت گھومنے پھرنے، فلمیں دیکھنے اور تھیٹر سے لطف اندوز ہونے میں گزارنے لگا“ اُس نے بتایا: ”میں بنیادی طور پر داستان گو ہوں۔ بنجاروں کی طرح گھومتے پھرتے دنیا دیکھنے کی عادت نے مجھے بصارت اور بصیرت عطا کی۔ لندن کی آوارہ گردیوں کے دنوں میں معلوم ہوا کہ روس میں ایک انٹرنیشنل فیسٹیول ہو رہا ہے، میں نے فارم پُر کر کے بھیج دیا۔ زبانوں کے علم کے خانے میں انگریزی، اُردو، عربی، فارسی اور پنجابی کے اندراج نے مجھے نوجوانوں کے اس وفد میں شامل کرا دیا جو روس گیا۔۔۔۔ میں لندن سے واپس آیا تو ”نوائے وقت“ والے مجید نظامی صاحب نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ تم ایک ایسی دنیا دیکھ آئے ہو جس کے بارے میں جاننے کے لیے ہم بے تاب ہیں۔ تم اس سفر کی داستان لکھ ڈالو۔ میں نے سنا، غور کیا اور پھر ”لندن سے ماسکو تک“ کے نام سے مختصر سا سفر نامہ لکھا جو ”قندیل

میں تین اقساط میں شائع ہوا یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے جیسے آوارہ گرد کو سفر نامہ نگار بنانے کا "گناہ" یا "سہرا" مجید نظامی صاحب کے سر ہے"۔ [۵]

مستنصر حسین تارڑ نے دیہاتی ماحول میں بھی شب و روز گزارے ہیں اور شہری زندگی کے نشیب و فراز سے بھی آشنا ہوئے یہی وجہ ہے کہ اُس کی زبان میں اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں کا رنگ موجود ہے اور ان دونوں رنگوں کی آمیزش سے مستنصر کی طرز تحریر میں ایسی کشش اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے جس کا اعتراف سب کی زبان پر موجود ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا تعلق اگرچہ پنجابی گھرانے سے ہے مگر اس کے باجود اُنہوں نے اپنی تخلیقات کے لیے اُردو زبان کو چُنا اور اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑھ دیے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ پورے پاکستان میں سب سے زیادہ پنجابیوں نے اُردو کو اپنایا ہے اور سب کے سب کامیاب ہوئے ہیں۔ مستنصر نے بھی غالباً اسی وجہ سے اُردو زبان کو بطور تحریر اپنایا کہ اُس کے خیال میں اُردو کے مقابلے میں پنجابی میں نام پیدا کرنا مشکل معلوم ہو تا تھا۔ اُردو زبان اپنانے کے پس پردہ وجوہات کچھ بھی ہوں، حقیقت یہ ہے کہ مستنصر نے اپنی تخلیقات و تصنیفات کی صورت میں اُردو ادب کو وہ سرمایہ دیا ہے جس کا اعتراف اُردو ادب سے وابستہ ہر ذی شعور ادیب نے کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے ایک خوشحال اور آسودہ حال گھریلو زندگی گزاری ہے۔ اُس کی بیگم کا نام میمونہ ہے، مستنصر حسین تارڑ کے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام سلجوق ہے جو فارن سروس آف پاکستان میں بطور سفیر فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ آج کل یو این او سے وابستہ ہیں۔ دوسرا بیٹا سمیر ہے۔ سمیر بھی سینئر سول سروس آفیسر ہے اور ایکسائز اینڈ کسٹم میں تعینات ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی بیٹی کا نام قرۃ العین ہے جو پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہے۔ فلوریڈا میں بطور ڈاکٹر خدمات انجام دے رہی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے متعدد سفری مہمات میں اپنی بیگم اور بیٹوں کو بھی شامل کیا ہے اور ان کی آپس کی گفتگو اور نوک جھوک سے سفر ناموں کا مزہ دوبالا کیا ہے۔

فصلِ دوم

ادبی اور فنّی خدمات:

ادبی دنیا مستنصر حسین تارڑ کے نام سے بھی واقف ہے اور اُس کے کام سے بھی بخوبی آشنا ہے۔ اگر اُردو ادب سے مستنصر کا نام نکال دیا جائے تو یہ ادھورا اور نامکمل لگتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اُردو ادب کا وہ درخشندہ ستارہ ہیں جس کی چمک دمک کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں۔ اُردو ادب میں اُنہوں نے آل راؤنڈر کا کردار ادا کیا ہے اور سب سے اپنی صلاحیتوں کا، اپنی ذہانت کا اور اپنی مسحور کن شخصیت کا لوہا منوایا ہے۔ مستنصر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی تحریروں میں زندگی کا ہر رنگ پیش کیا ہے اور یہ سب رنگ اتنے جاندار طریقے سے پیش کیے ہیں کہ قاری دورانِ مطالعہ ہر طرف رنگ و نور کی کیفیات سے گزرتا ہے۔ اداکاری کا میدان ہو یا ڈرامہ نگاری کا فن ہو، ناول نگاری کا شعبہ ہو یا کالم نگاری اور سفر نامہ نویسی کا میدان ہو، مستنصر نے ہر میدان میں اپنا رنگ جمایا اور ایسا رنگ جمایا کہ آج تک اس کا رنگ نہ صرف قائم و دائم ہے بلکہ ہر گزرتے لمحوں کے ساتھ ساتھ اُس کا رنگ اور بھی گہرا ہوتا جارہا ہے۔

اداکاری وڈرامہ نگاری:

انگلستان سے واپسی کے بعد زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مستنصر کی طبیعت اداکاری کی جانب مائل ہوئی تو پی ٹی وی کا رخ کیا۔ مستنصر شکل و صورت کے لحاظ سے کافی خوبصورت اور جاذب نظر تھے لہذا پی ٹی وی میں بغیر کسی سفارش کے پذیرائی ملی۔ سب سے پہلے جس ڈرامے میں اداکاری کا موقع ملا اس کا نام '' پرانی باتیں '' تھا۔ اس کے بعد مستنصر نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تین چار سو ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھا کر ناظرین و سامعین سے خوب داد سمیٹی۔ مستنصر حسین تارڑ کو سب سے زیادہ مقبولیت پی ٹی وی کی صبح کی نشریات میں 'چاچا جی' کے زندۂ جاوید کردار سے ملی جس کی وجہ سے پاکستان کا بچہ بچہ مستنصر حسین تارڑ کو چاچا جی کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ مستنصر حسین تارڑ ۱۹۶۷ء سے پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستہ ہوئے اور اُنہوں نے بطور ڈراما نگار پہلا ڈرامہ '' آدھی رات کا سورج'' لکھا جو ۱۹۷۴ء میں پی ٹی وی سے نشر ہوا۔ اُردو اور پنجابی زبان میں بیسیوں ڈرامے، سیریز اور سیریلز میں بطور اداکار کام کیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے ریڈیو پاکستان کے لیے بھی کام کیا ہے۔ اُنہوں نے ریڈیو پاکستان لاہور سنٹر کے لیے متعدد پروگراموں کے سکرپٹ لکھے ہیں۔ مستنصر مشہور و معروف نجی چینل '' جیو'' پر ''شادی آن لائن '' کے نام سے ایک پروگرام کی میزبانی بھی کرتے رہے ہیں۔ مستنصر نے

پی ٹی وی کی صبح کی روزانہ نشریات میں پہلے اینکر پرسن کے طور پر آٹھ سال تک میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔

مستنصر حسین تارڑ نے بطور اداکار ڈرامہ " سراج الدولہ، ایک محبت سو افسانے اور ایک حقیقت سو افسانے" میں جس جاندار اداکاری کا مظاہرہ کیا اُس کی یادیں آج بھی لوگوں کی یاداشت میں موجود ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے دس بانیوں میں مستنصر حسین تارڑ کا شمار ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ اداکاری اور ڈرامہ نگاری میں بھی کامیاب رہے ہیں اور بطور اینکر پرسن بھی اُنہوں نے کامیابی سے اپنی صلاحیتوں کا جوہر دکھایا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ پر فاروق اقدس نے " ہشت پہلو شخصیت۔ مستنصر حسین تارڑ" کے نام سے ایک بڑا جامع مضمون لکھا ہے جس میں اُنہوں نے ٹی وی کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کی کارکردگی کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "۱۹۶۷ء میں اُنہوں نے بطور اداکار 'پی ٹی وی' جوائن کیا تھا اور اپنے دور کے مقبول ترین ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کیے۔ مجموعی طور پر ایسے ڈراموں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ ہے جن میں وہ ڈرامے بھی شامل ہیں جن مستنصر حسین تارڑ کا کردار، یا تکیہ کلام بلکہ ڈائیلاگ ڈلیوری کا انداز اس حد تک مقبول ہوا کہ لوگوں نے اسے اپنی عادت بنالیا۔ پھر وہ 'پی ٹی وی' سے پیش کی جانے والی صبح کی نشریات کے پہلے میزبان بنے اور سات سال تک یہ فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اُنہیں تین " الیکشن نشریات" کا میزبان ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے اور ٹی وی میزبانی کا یہ طویل سلسلہ جیو کے مقبول پروگرام " شادی آن لائن" پر جاکر ختم ہوجاتا ہے جو اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام تھا۔ مستنصر حسین تارڑ نے تقریباً سات سال تک اس پروگرام کی میزبانی کی"۔ [۶]

مستنصر حسین تارڑ نے درج ذیل قابل ذکر ڈرامے تحریر کیے ہیں:

* شہپر
* کیلاش
* ایک حقیقت ایک افسانہ
* فریب
* پرندے

* سورج کے ساتھ ساتھ
* ہزاروں راستے

سفر نامہ نگاری:

مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری کا آغاز یورپ کی سیر وسیاحت سے ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ برطانیہ میں تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ اس دوران اس نے ماسکو میں منعقدہ ایک یوتھ فیسٹیول میں شرکت کی۔ واپسی پر اس نے " نکلے تیری تلاش میں " کی صورت میں اپنا پہلا سفر نامہ لکھا جس کو قارئین کی طرف سے بے حد پذیرائی ملی۔ حوصلہ افزائی ملتے ہی مستنصر حسین کا قلم رواں دواں ہو گیا اور اس نے اگلا سفر نامہ " اندلس میں اجنبی " کے نام سے لکھ ڈالا۔ یہ سفر نامہ بھی قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ناقدین نے مستنصر حسین تارڑ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ قارئین و ناقدین کی جانب سے مثبت پیش رفت دیکھ کر مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ پر سفر نامہ لکھتے چلے گئے اور لوگ اسے پسند کرتے گئے۔ دراصل مستنصر حسین تارڑ کا انداز نگارش اتنا دلچسپ، پر مزاح اور شگفتہ ہے کہ قاری اس کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

اب تک اس نے کل تیس کے قریب سفر نامے لکھے ہیں جن میں سے بارہ سفر نامے صرف پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے بارے میں ہیں۔ پاکستان کی بلند ترین چوٹی "کے ٹو" کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ نے ایک شاہکار سفر نامہ لکھا ہے جس کی وجہ سے مستنصر حسین تارڑ کی مقبولیت کا گراف آسمان کو چھونے لگا۔ سفر نامہ " کے ٹو" کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس سفر نامے کا پہلا ایڈیشن صرف دو ہفتوں میں فروخت ہو گیا۔ اس سفر نامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سفر نامے کی تقریب رونمائی کے ٹو چوٹی کے عین اوپر قومی ایئر لائن کے ایک جیٹ طیارے میں ہوئی۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے " نانگا پربت " کو سال کا بہترین سفر نامہ قرار دیا گیا۔ اس سفر نامے پر صدر پاکستان کی جانب سے مستنصر حسین تارڑ کو " اکیڈمی آف لیٹرز ایوارڈ " سے نوازا گیا۔

شمالی علاقہ جات سے گہرے تعلق اور دلی وابستگی کی بنا پر اس علاقے میں پائی جانے والی ایک جھیل کا نام مستنصر حسین تارڑ کے نام پر " تارڑ جھیل " رکھا گیا جو مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کی مقبولیت کا ایک واضح ثبوت ہے۔

منہ وَل کعبہ شریف اور غارِ حرا میں ایک رات مستنصر حسین تارڑ کے وہ سفر نامے ہیں جس میں سرزمینِ حجاز کے سفر کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سفر ناموں میں مستنصر حسین تارڑ عقیدت و احترام کے آسمان پر جلوہ فگن نظر آتے ہیں۔

انتظار حسین مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ کے یہاں شہروں کو اُن کے ماضی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ہم بیک وقت حال میں اور ماضی قدیم میں سانس لیتے ہیں۔ اُردو میں اس قسم کی کوشش بعض اور سفر نامے لکھنے والوں نے بھی کی ہے مگر ماضی کا بیان اُن کے ہاں کتابی رنگ میں آتا ہے۔ وہ ہمیں دور دراز کے شہروں کا ماضی دکھاتے نہیں بلکہ پڑھ کر سناتے ہیں۔ تارڑ کے سفر ناموں کی خوبی یہ ہے کہ ہم شہروں کو اُن کے ماضی و حال میں سانس لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ اصل میں رویّے کی بات ہے۔ اس نئے سیاح کا رویہ اطلاعاتی نہیں بلکہ وارداتی ہے۔ اس کا مسئلہ یہ نہیں کہ شہروں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اطلاع فراہم کی جائے بلکہ یہ ہے کہ ایک شہر جس طور اُس پر وارد ہوا اُس طور اُسے دکھایا جائے۔ بیان میں تازگی اور بے ساختگی ہے"۔ [۷]

ناول نگاری:

سفر نامہ نگاری میں اپنا نام پیدا کرنے کے بعد مستنصر حسین تارڑ ناول نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ پہلا ناول " پیار کا پہلا شہر " کے نام سے لکھا۔ یہ ناول خاصا مقبول ہوا۔ اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ نے بہت سے ناول لکھے مگر ان کے ناولوں میں جو مقبولیت اور شہرت " راکھ " اور " بہاؤ" نے حاصل کی وہ کسی دوسرے ناول کو نصیب نہ ہوئی۔ ان دونوں ناولوں میں مستنصر حسین تارڑ کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ناول " بہاؤ" کا پس منظر وادئ سندھ کے ایک شہر میں قدیم دریا سرسوتی کے معدوم ہونے اور ایک پوری تہذیب کے فنا ہو جانے کا بیان ہے۔ اس ناول میں مستنصر تارڑ نے مختلف زبانوں کے امتزاج سے ایسا رنگ بھرا ہے جس نے ناول کی دلچسپی اور حسن و کشش میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ دلچسپ طرز تحریر اور منفرد اُسلوب نے اس ناول کی جاذبیت میں بے حد اضافہ کیا ہے۔

اُردو ادب کے مشہور و معروف ناول نگار عبد اللہ حسین " بہاؤ" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "اس تحریر کی پشت پر جس قدر تخیلاتی ریسرچ پائی جاتی ہے اس کا اندازہ کر کے حیرت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر یہ ناول کسی ترقی یافتہ ملک میں لکھا جاتا تو چند سال کے اندر مصنف کو کسی یونیورسٹی کی جانب سے علم بشریات کی اعزازی ڈگری پیش کی جاتی" ۸؎

ناول " راکھ " کی کہانی سقوط ڈھاکہ اور اس کے بعد کراچی میں جنم لینے والے حالات کے گرد گھومتی ہے۔ یہ وہ شاہکار ناول ہے جس پر ۱۹۹۹ء میں مستنصر حسین تارڑ کو وزیر اعظم ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا علاوہ ازیں ناول " راکھ " کو سال کا بہترین ناول اور جنوب مشرقی ایشیا کا نمائندہ ناول بھی قرار دیا گیا۔ اسی ناول پر ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی سربراہ ڈاکٹر کرسٹینا، کولمبیا یونیورسٹی، نے نیویارک میں ایک طویل مقالہ بھی پیش کیا۔ مستنصر حسین تارڑ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ بھارت میں ہونے والے ایک سروے کے مطابق مستنصر حسین تارڑ کے ناول " بہاؤ" کا شمار گزشتہ صدی میں تخلیق کیے جانے والے دس ناولوں میں ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول " پیار کا پہلا شہر " گزشتہ تین دہائیوں سے " بیسٹ سیلر" کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اب تک اس ناول کے پچاس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا پنجابی زبان میں لکھا ہوا ناول "پکھیرو" پنجابی کا پہلا جدید ناول شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ناول بھارت کی گورونانک یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

ناول "فاختہ اور " پیار کا پہلا شہر " سمیت مستنصر حسین تارڑ کی متعدد تصنیفات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ناول "قلعہ جنگی" ناول نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ "خس و خاشاک" کافی ضخیم ناول ہے جس میں دو خاندانوں کو موضوع بنایا گیا ہے جن کی کئی نسلوں کی کہانی اس ناول میں بیان کی گئی ہے۔ " اے غزال شب " میں سویت یونین کے زوال کے بعد کے حالات و واقعات زیرِ موضوع ہیں۔ ناول " خس و خاشاک "مستنصر حسین تارڑ کا لاجواب ناول ہے جس میں اس کا منفرد انداز بیاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مشہور کالم نگار مستنصر حسین تارڑ کی مقبولیت یوں بیان کرتے ہیں:

”ممتاز روسی مستشرق پروفیسر گالیناڈشنگو کے بقول ” ہم روس کے رہنے والے
پاکستان کو فیض احمد فیض کی شاعری اور مستنصر حسین تارڑ کی نثر کے حوالے سے
پہچانتے ہیں“ ۹۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول:

* پیار کا پہلا شہر
* پرندے
* جپسی
* بہاؤ
* راکھ
* پکھیرو
* خس و خاشاک
* دیس ہوئے پردیس
* قلعہ جنگی
* اے غزالِ شب
* ڈاکیا اور جولاہا
* سیاہ آنکھ میں تصویر

کالم نگاری:

سفر نامہ نگاری اور ناول نگاری کی طرح کالم نگاری میں بھی مستنصر حسین تارڑ نے اپنی ادبی اور صحافتی صلاحیتوں کا لوہا عوام و خواص سے منوایا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ایک ماہر نباض کی طرح معاشرتی بیماریوں کی نہ صرف نشان دہی کی ہے بلکہ اُن کی دوا بھی تجویز کی ہے۔ قلم میں روانی عیاں ہے۔ شگفتگی و شائستگی کے ساتھ طنز و مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی نے مستنصر حسین تارڑ کی تحریروں میں خاصی کشش پیدا کی ہے یہی وجہ ہے کہ عوام و خواص سفر ناموں اور ناولوں کی طرح مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کے بھی دیوانے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ آج کل روزنامہ ’ نئی بات‘ اور ہفتہ روزہ ’ اخبار جہاں‘ میں بڑی

باقاعدگی سے کالم لکھتے ہیں اور لوگ انھیں پسند کرتے ہیں۔ اب تک اُن کے درج ذیل کالموں کے مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی کالم نگاری کے بارے میں مشہور کالم نگار فاروق اقدس تبصرہ کرتے کہتے ہیں:

> "ملک کے ممتاز مزاح نگار اور کالم نگار ابن انشاء کے بعد یہ اعزاز بھی مستنصر حسین تارڑ کے دامن میں آیا کہ اُنہوں نے " اخبار جہاں " کے لیے ہفتہ وار کالم "کارواں سرائے " کے عنوان سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ بائیس برس سے جاری ہے۔ وہ بعض دوسرے اخبارات کے لیے بھی لکھتے ہیں اور اُن کی کالم نگاری کا عرصہ گذشتہ پینتیس سالوں پر محیط ہے"۔ ۱۰؎

مستنصر حسین تارڑ نے اب تک فکاہیہ مضامین اور کالموں کے مجموعے چھاپے ہیں اُن کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

* گزارا نہیں ہوتا (فکاہیہ کالموں کا مجموعہ۔۱۹۸۷)
* چِک چِک
* اُلو ہمارے بھائی ہیں۔
* ہزاروں ہیں شکوے (۱۹۹۸)
* گدھے ہمارے بھائی ہیں۔
* شتر مرغ ریاست
* تارڑ نامہ ۱ (۲۰۰۹)
* تارڑ نامہ ۲
* تارڑ نامہ ۳
* تارڑ نامہ ۴
* تارڑ نامہ ۵

اعزازات:

مستنصر حسین تارڑ کا نام ادب میں کئی حوالوں سے مشہور ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی ادبی و صحافتی خدمات کو نہ صرف عوام الناس نے سراہاہے بلکہ حکومتی سطح پر بھی اُن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ذیل میں اُن تمام اعزازات رکلیدی عہدوں کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے جو مستنصر حسین تارڑ کو وقتاًفوقتاًاُن کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں دیے گئے۔

* صدارتی تمغابرائے حسن کارکردگی(ادب رذرائع ابلاغ)۱۹۹۲ء
* وزیراعظم ادبی ایوارڈبطور بہترین ناول نگار(راکھ)۱۹۹۸ء
* اکادمی ادبیات پاکستان کا ہجرت ایوارڈبرائے" نانگاپربت۔،بلتستان داستان" (ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایوارڈ)۔
* مجلس فروغ اُردوادب دوحہ(قطر)کی جانب سے سلیم جعفری انٹر نیشنل ایوارڈ۲۰۰۳ء
* مختلف پاکستانی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کے نصاب میں تحریروں کی شمولیت
* الحمرا آرٹس کونسل لاہور کے بورڈ آف گورنرز کی رکنیت۔
* پنجاب ٹورزم ڈویلپمنٹ بورڈ کے بورڈ آف گورنرز کی رکنیت
* کھٹمنڈو نیپال میں یونیسف سمینار میں پاکستان کی نمائندگی۔
* چین کے دورے پر جانے والے پاکستانی ادیبوں کے وفد میں شمولیت
* مجلس فروغ اُردوادب دوحہ(قطر)کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۲۰۰۲ء

حوالہ جات

۱۔ " ہلال اُردو" ، جنوری ۲۰۱۶، قاسم علی خان بحوالہ انٹرنیٹ

۲۔ ایضاً

۳۔ "ایکسپریس" مستنصر حسین تارڑ سے ایک ملاقات۔ عمیر بن ریاض۔ وائس آف امریکہ اردو، ۱۹ فروری ۲۰۱۳ء

۴۔ 'ہشت پہلو شخصیت۔ مستنصر حسین تارڑ' ، فاروق اقدس، روزنامہ جنگ لاہور، ۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۹

۵۔ "سنڈے پاکستان" ۷ مارچ ۱۹۹۹ء، علی اصغر عباس، ص:۱۲

۶۔ 'ہشت پہلو شخصیت۔ مستنصر حسین تارڑ' ، فاروق اقدس، روزنامہ جنگ لاہور، ۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۹

۷۔ 'آزاد دائرۃ المعارف وکی پیڈیا' انتظار حسین بحوالہ مستنصر حسین تارڑ

۸۔ 'آزاد دائرۃ المعارف وکی پیڈیا' عبداللہ حسین بحوالہ مستنصر حسین تارڑ۔

۹۔ 'ہشت پہلو شخصیت۔ مستنصر حسین تارڑ'، فاروق اقدس، روزنامہ جنگ لاہور، ۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۹

۱۰۔ ایضاً

باب دوم

فنِ سفر نامہ نگاری

فصلِ اوّل

سفر کی تعریف و توضیح:

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے جب سے اِس کائنات کی تخلیق کی ہے اس وقت سے ہر چیز رواں دواں اور اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں تغیر اور حرکت و عمل کا مادہ رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان ہر لحہ نِت نئ چیزیں دیکھنے اور ہر گھڑی نئ نئ دنیائیں دریافت کرنے میں لگا رہتا ہے اور کائنات کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے میں دلچسپی لیتا رہتا ہے گویا سفر وسیاحت انسان کا فطری و جبلی ذوق ہے اور وہ اس ذوق کی تسکین کی خاطر قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، ملک ملک گھومتا ہے اور سمندروں، دریاؤں، صحراؤں، جھرنوں، جھیلوں اور انسانی زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہی حاصل کرکے نہ صرف اپنے فطری ذوق اور جذبۂ تجسس کو تسکین پہنچاتا ہے بلکہ اپنی قلبی کیفیات و واردات اور مشاہدات و تجربات میں دوسروں کو بھی شریک کرتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ دراصل انسان کی متلون مزاجی کی پیداوار ہے۔

سفرنامہ ایک ایسی دستاویز ہے جو سفر کے حالات وواقعات، انسانی مشاہدات وتاثرات اور مختلف کوائف و معلومات پر مشتمل ہوتا ہے۔ عموماً سفرنامہ نگار سفر کے دوران یا سفر سے واپس ہونے پر اپنے مشاہدات و تاثرات، تجربات و احساسات کو زیبِ قرطاس کرتا ہے مگر یہ سفرنامہ محض تجربات و مشاہدات کا عکس نہیں ہوتا بلکہ یہ انسان کی داخلی وخارجی زندگی کا پورا منظرنامہ ہوتا ہے جس میں سفرنامہ نگار پوری دیانتداری اور خلوص نیت سے ادبیت کا رنگ بھر کر دوسرے لوگوں کی رہنمائی ، آگاہی، معلومات اور تجزیے وجائزے کے لیے پیش کرتا ہے۔کشاف تنقیدی اصطلاحات میں 'سفرنامے' کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

> "ایک سیاح جب اپنے جغرافیائی اور سماجی گردوپیش سے نکل کر کسی دوسرے مقام پر پہنچتا ہے تو اسے وہ تمام چیزیں جو اس کے اپنے مؤلد ومنشاء کے مانوس ماحول سے مختلف ہوتی ہیں ۔اختلاف ماحول اور اختلاف معاشرت کے باعث دلچسپ اور استعجاب انگیز نظر آتی ہیں اور وہ باتیں جو مشترک ہوتی ہیں وہ اپنے اشتراک کے

باعث دلچسپ معلوم ہوتی ہیں وہ انھیں دوسروں بالخصوص اپنے ہم وطنوں کے لیے قلم بند کرلیتا ہے۔ایسی تحریر کو ادبی اصطلاح میں سفر نامہ کہتے ہیں"۔ ا؎

اُردو ادب کے بہت سے نامور نقادوں اور تجزیہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں سفر نامے کی تعریف و توضیح کی ہے اس ضمن میں چند ایک کے اقوال کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید سفر نامے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سفر نامے کا شمار اُردو کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ سفر نامہ چونکہ چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے اس لیے سفر اس کی شرط ہے بادی النظر میں سفر کے ساتھ انجانے دیسوں کی سیر، نئی فضاؤں سے واقفیت اور انوکھے مناظر کے مشاہدے کا تصور وابستہ ہے اس لیے سفر میں تخیّل کا عنصر فطری طور پر شامل ہوتا ہے اور یہ تحرّز انسان کو سفر پر اُکساتا ہے۔ ۲؎

ڈاکٹر خالد محمود سفر نامے کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"سفر نامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات واحساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے۔ ۳؎

سفر نامہ اگرچہ کسی سفر نامہ نگار کے بصری مشاہدے پر مشتمل ہوتا ہے مگر اس بصری مشاہدے میں سفر نامہ نگار کسی علاقے، شہر یا ملک کی علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور جغرافیائی حالات پر بھی گہری نظر رکھتا ہے اور جب ان تمام حالات و واقعات اور معلومات کی روشنی میں اپنا سفر نامہ پیش کرتا ہے تو قارئین کی جانب سے خوب پذیرائی اور حوصلہ افزائی ملتی ہے۔

تحسین فاروقی سفر نامے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"جہاں تک سیر وسیاحت کے محرکات کا تعلق ہے تو عہد قدیم سے لے کر اب تک تجارت، حصول علم و عبرت، تبلیغ دین، سیاسی مقاصد براری، تلاش معاش وزیارت مقامات مقدسہ وغیرہ وہ چند مقاصد ہیں جنھوں نے نسل انسانی کے پاؤں میں چکر ڈال رکھا ہے اور یوں ان متنوع مقاصد کے حامل اسفار نے مختلف سفر ناموں کو جنم دیا ہے جو دیس دیس کی تاریخ، تہذیب، تمدن، تصورِ کائنات، عادات، رسوم، رواج، رجحانات، معتقدات، میلانات اور علوم کا ایک وسیع خزانہ سمیٹے بیٹھے ہیں اور جو بعض

صورتوں میں تاریخ اور تہذیب و تمدن کا سب سے اہم اور بنیادی مآخذ سمجھے جاتے ہیں" ۴؎

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحۂ رواں میں آنکھ، کان، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شے نظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشۂ نغمہ و نکہت کا ہر صورت و رنگ، لفظوں کی امیجری میں جمع ہو کر بیان کو مرقعِ بہاراں بنادے اور قاری ان تمثالوں کے اندر جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنالے"۔ ۵؎

سفر نامہ محض خشک اور بے کیف معلومات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ زبان و بیان کی چاشنی کے لیے اس میں ادبیت اور افسانویت کا رنگ ضرور ملانا چاہیئے تاکہ پڑھتے وقت قارئین کی دلچسپی برقرار رہے اور کہیں پر بھی بوریت اور عدم دلچسپی کا شکار نہ ہوں۔ جس طرح ایک ناول یا ڈرامے میں کردار متحرک نظر آتے ہیں اور اس میں ہر لحہ بدلتی کیفیات اور ہر گھڑی بدلتے مناظر قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں اسی طرح سفر نامے میں بھی ڈرامے کی سی ہمہ رنگی اور ناول کا سا تغیر و تبدل مد نظر رکھنا چاہیئے تاکہ سفر نامہ کی خشکی اور بے کیفی بھی محسوس نہ ہو اور اس کا ادبی اور اصلی رنگ بھی برقرار رہے۔

اس بارے میں ظہیر صدیقی اپنے خیالات یوں بیان کرتے ہیں:

"اچھا سفر نامہ وہ ہے جس میں داستان کی سی طرازی، ناول کی سی ناول سازی، ڈرامہ کی سی منظر کشی، کچھ آپ بیتی کا سا مزا، کچھ جگ بیتی کا سا لطف اور پھر سفر کرنے والا جزو تماشا ہو کر اپنے تاثرات کو اس طرح پیش کرے کہ اس کی تحریر پر لطف بھی ہو اور معلومات افزا بھی"۔ ۶؎

میری نظر میں سفر نامہ زندہ و تابندہ اور خالص ادبی صنف ہے۔ سفر نامہ محض سفری حالات و واقعات اور خوب صورت مناظر کی منظر کشی تک محدود نہیں بلکہ یہ ایسا جاندار اور متحرک صنف ہے جو انسانی زندگی کی نِت نئی گرہیں کھولتا ہے، گرد و پیش کی نئی پرتوں سے روشناس کراتا ہے۔ انسانی اقدار و روایات کو منظر عام پر لاتا ہے۔ ذہنی، قلبی، سماجی اور روحانی بالیدگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ کائنات کے سربستہ رازوں کو انسان کے سامنے منکشف کرکے انھیں پرکھنے، برتنے اور استعمال کرنے کا سلیقہ سکھاتا

ہے۔ مختلف علاقوں، شہروں، ملکوں کے رسم ورواج، عقائد و عبادات، طرز معاش و معاشرت سے انسان کو نہ صرف متعارف کراتا ہے بلکہ ان کی اہمیت اور افادیت بیان کر کے انسان کی معاشی و معاشرتی زندگی میں بہتری لانے کا سامان کرتا ہے۔ اسلاف اور اکابرین کے کارناموں کے بارے میں جانکاہی حاصل کر کے شعوری اور لاشعوری طور پر تفاخر کے جذبات پنپتے ہیں بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔

سفر نامہ ایک آئینے کی طرح ہے جس میں انسان اپنا اور گردوپیش کا نظارہ کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار اس علاقے سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور معاشرتی نشیب و فراز کا موازنہ کرتا ہے جس کی وہ سیاحت کر رہا ہوتا ہے۔ وہ اُن کی اچھی اور مفید باتوں کو قبول کرتا ہے اور اس کی روشنی میں اپنی خامیوں اور نقائص کی اصلاح کرتا ہے۔ تنزلی اور ترقی کا معیار مقرر کرتا ہے اور یہاں سے اچھے تاثرات کو لے کر اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔

سفر نامہ نہ صرف علمی و ادبی اور تاریخی ورثہ ہے بلکہ اس کے اندر سوانحی و جغرافیائی معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ سفر نامہ ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس سے آنے والی نسلیں خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔

آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد سفر نامے کی انسانی زندگی پر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''سفر ناموں میں انسانی زندگی کی اُن کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو تاریخ، ادب اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں میں تاریک چھوڑ دیے گئے ہیں جیسے معاشرتی طور طریق، رواج و عقائد، مذہبی تعلقات، تجارتی و صنعتی خصوصیات، فرقے، زبانیں، شکل و صورت، سفر ناموں کی ایسی خصوصیات ہیں جس نے اس کو جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے منفرد کر دیا ہے''۔ ۷

سفر نامے کی ابتدا اور تاریخی ارتقاء

سفر ناموں کی ابتدا مسافروں کی سفر بیتیوں اور اُن کے بیان کردہ زبانی قصوں سے ہوتی ہیں۔ ان سفری قصوں میں حد سے زیادہ مبالغہ ہوا کرتا تھا اور واقعات کو ناقابل یقین حد تک توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا تھا۔ بعد میں یہی قصے، کہانیوں، روزناچوں اور خطوط کی صورت میں سفری داستانوں کی شکل میں ڈھلنے لگے۔ سب سے پہلے بحری سفر کے قصے ڈائریوں اور گائیڈ بکوں کی شکل میں سامنے آئے کیونکہ ان میں مختلف علاقوں کی تفصیلات، دشوار گزار راستوں کا تعین، بحری سفر کے دوران ممکنہ حادثات کی نشان دہی اور ان سے بچاؤ کے طریقے درج ہوتے تھے۔ یہاں سے سفر نامے کی ابتدائی نقوش ظاہر ہوئے اور اس ضمن سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ دیگر جہازرانوں کے سفری قصے بھی مشہور ہوئے۔

محققین نے قدیم ترین تحریری سفر ناموں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں بیشتر قیاس آرائیاں کی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب مسافر سفر کے بعد گھروں کو واپس لوٹتے تو وہ اپنے گھر والوں کے سامنے سفری واقعات کا تذکرہ کرتے۔ یہی تذکرے اور سفری روداد تحریری سفر ناموں کی صورت میں نمودار ہوئے۔ یورپی محققین کے نزدیک یونانی سیاح ہیروڈوٹس (Herodotus) سب سے پہلا سفر نامہ نگار ہے۔ شپلے (Shiply)لکھتا ہے:

> ”ہیروڈوٹس(۴۲۵۔ق م) بابائے تاریخ کہلاتا ہے۔ اسے بابائے سفر نامہ کی بھی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اپنے تجربوں پر سفر ناموں کی عمارت تعمیر کرتا ہے اور اُن ملکوں کا حال معلوم کرتا ہے جو اُس وقت یونان کے علم میں تھے۔ اس طرح وہ سب سے پہلے ہمیں تاریخ کے عظیم شعور سے آشنا کراتا ہے۔ وہ سفر کے حالات نہیں بلکہ ایسے نتائج بیان کرتا ہے جو جغرافیہ کی نشان دہی کرتے ہیں“۔ [۸]

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان، مصر اور ہندوستان دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے محور اور تعلیم و تمدن کے روشن چراغ تھے۔ جہاں تشنگانِ علم کی ہمہ وقت آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ یونان کی تہذیبی و تاریخی قدامت مسلّم ہے۔ رعایا خوشحال اور ان کی دل بستگی کا سامان میسر تھا۔ ملازمین، طالب

علم، تاجر، کھلاڑی غرض ہر شعبے سے وابستہ افراد سفر وسیاحت کرنے میں آزاد تھے مگر یہاں سفری روداد قلم بند کرنے کا کسی کو خیال تک نہیں آیا تھا۔

یونان کی طرح ہندوستان بھی مرجع سفر وسیاحت تھا۔ چونکہ یہاں علم وادب کا کافی چرچا تھا اس لیے اکثر وبیشتر طلباء کی آمد ورفت جاری رہتی تھی۔ تعلیم کے ساتھ ہندوستان اُس زمانے میں ایک بہت بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے کاروباری حضرات تجارت کی غرض سے اکثر وبیشتر یہاں کا رخ کرتے تھے۔ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتابوں ' رامائن اور مہابھارت' میں سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے ساتھ ساتھ قرب وجوار کے سفری واقعات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اگرچہ یہ سفر تفریحی مقاصد کے لیے نہیں ہوتے تھے۔ کبھی جنگی مہمات کے سلسلے میں سفر ہوا کرتے تھے کبھی تجارت اور کبھی تحصیل علم کے لیے لوگ آجایا کرتے تھے اور عموماً یہ سفر کاروانوں اور قافلوں کی صورت میں کیے جاتے تھے کیونکہ راستے پر خطر ہوا کرتے تھے اور ڈاکوؤں اور لٹیروں کا سامنا ہونے کا بھی ڈر ہوتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا انسان نے اپنے سفر کو محفوظ اور باسہولت بنانے کے لیے نِت نئے طریقے ایجاد کیے۔ موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہاز کی ایجاد سے انسان سفر کی تمام صعوبتیں بھول گیا۔ وہ نسبتاً کم عرصے میں دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کرنے لگا اور اپنی جبلّی تسکین کے ساتھ اپنی دیگر ضروریات زندگی کے لیے بھی انسان دنیا کے ہر خطے میں جانے لگا۔ نقل وحمل میں آسانی پیدا ہونے سے لوگ ایک دوسرے کے خیالات اور نظریات سے بھی مستفید ہونے لگے اور تاجروں اور سیاحوں کی بدولت یہ ترقی یافتہ خیالات و نظریات دوسرے ممالک مثلاً مصر، روم اور ہندوستان منتقل ہونے لگے۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دنیا کے قدیم ترین سفرناموں میں ہندوستان کا ذکر بڑے تزک واحتشام سے ملتا ہے جس سے اس زمانے میں ہندوستان کی عظمت اور اس کی توقیر واہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود کہتے ہیں:

> ''جب ہم دنیا کے قدیم ترین تحریری سفرنامے کی تاریخ کا سراغ لگاتے ہوئے ماضی کے اوراق پلٹتے ہیں تو دنیا کے پہلے سفرنامے کی تخلیق کے اعزاز میں یونان کے ساتھ ہندوستان بھی اس طرح شریک نظر آتا ہے کہ یونانی سیاح **میگستھینز** کا لکھا ہوا دنیا کا اولین دریافت شدہ باقاعدہ سفرنامہ " India "(سفرنامہ ہند) ہندوستان کے احوال سفر ہی پر مشتمل ہے''۔ 9

میگستھینز یونان کے بادشاہ سکندر اعظم کے جانشین سیلوقس کے سفیر کی حیثیت سے ۳۰۲ قبل مسیح میں ہندوستان آیا۔ اس وقت چندر گپت موریا ہندوستان کا فرمانروا تھا۔میگستھینز نہایت دانشور اور جہاں دیدہ سفیر تھا۔ اس نے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کا انتہائی باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ سفیر کی حیثیت سے اسے دربار اور دربار کے جملہ عہدیداروں تک رسائی حاصل تھی۔ اس نے عوام و خواص کو نہایت قریب سے دیکھا اور اُن کی فطرت کا بغور مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میگستھینز کا سفر نامہ چندر گپت موریہ کے زمانے کا ایک مستند اور تاریخی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔ یہ سفر نامہ دراصل ایک آئینہ ہے جس میں چوتھی صدی قبل مسیح کا ہندوستان اپنی تمام تر تہذیب و معاشرت، سیاست و معیشت اور تعلیم و سماج کے ساتھ جگمگاتا نظر آتا ہے۔

فاہیان جب ہندوستان آیا تو اس وقت ہندوستان پر مہاراجہ بکرماجیت کی حکمرانی تھی۔ فاہیان بدھ مت کا پیروکار تھا۔ اس کے ہندوستان آنے کا مقصد بدھ مت کے قدیم مراکز 'کپل وستو، پاٹلی پتر، ویشالی اور کشتی نگر وغیرہ کو تلاش کرنا تھا۔ فاہیان نے یہاں کے حالات کا قریب سے مطالعہ کیا۔ مہاراجہ بکرماجیت کی غریب پروری اور اس کی سخاوت، رحم دلی اور انصاف کی دل کھول کر نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اپنی کتاب "بدھ مت حکومت کے حالات" میں مہاراجہ بکرماجیت کے عہدِ حکومت کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ فاہیان نے اپنے سفر نامے میں اس دور کی مکمل تاریخ قلم بند کی ہے۔ میگستھیز کے سفر نامے کی طرح فاہیان کا سفر نامہ بھی قدر و قیمت اور معلومات و احوال کے حوالے سے کسی بھی طرح کم تر نہیں۔ اکثر مؤرخین نے ان دونوں سفر ناموں سے بے حد استفادہ کیا ہے۔

مہاتما بدھ کے دور میں اگرچہ بدھ مت کو کافی فروغ حاصل رہا مگر برہمن واد جو کہ ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہی سیاسی اور سماجی قوت کی علامت تھا، نے رفتہ رفتہ بدھ مت کے اثر و نفوذ کو بالکل ختم کر دیا مگر اس کے باوجود ہندوستان بدھ مت کے لوگوں کی عقیدت کا مرکز تھا۔ بدھ مت کے بے شمار عقیدت مند زائرین کی آمدورفت یہاں بدھ مت کے مراکز اور مقدس مقامات کی زیارت کے لیے جاری رہتی تھی۔ اِن زائرین میں ایک چینی سیاح ہوین سانگ بھی شامل تھا جس نے تقریباً پندرہ سال ہندوستان میں گزارے۔ اس زمانے میں ہرش چندر تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز تھا۔ ہوین سانگ نے اپنے سفر نامے میں اگرچہ مذہبی حوالے سے گفتگو کی ہے مگر اس کے باوجود اس نے ہرش چندر کی طرز حکمرانی کی بہت زیادہ تعریف کی ہے اور اُن کی خوبیاں گنوائی ہیں۔ ہرش چندر کا یہ سفر نامہ فی الواقع ایک

مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے اس میں نہ صرف عوامی زندگی کی ترجمانی کی ہے بلکہ عوام کے مذہبی عقیدے اور رجحانات، توہم پرستی، تہذیب و معاشرت، تعلیم، جادوٹونے، عبادت کے طریقے، رسوم و رواج غرض ہر پہلو پر کماحقہ' بحث کی ہے۔ انہی خوبیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر گستاولی باون اس سفر نامے کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"عرب سیاحوں سے بہت پہلے بدھ مت کے چینی زوّار اس ملک میں آچکے تھے اور ہیونگ سانگ کا سفر نامہ ہمارے لیے ایک بڑا ذخیرہ اس زمانے کی معلومات کا ہے" ١٠

چھٹی اور ساتویں عیسوی کا زمانہ مسلمانوں کا عہدِ زریں کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں مسلمان تاجر، حصولِ علم کے شائق نوجوان اور مبلغین حضرات سرزمین عرب سے نکل کر دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے اور اسلام کا نام ہر سو گونجنے لگا۔ دوسرے ممالک کی طرح مسلمانوں نے ہندوستان کا بھی رخ کیا۔ گجرات اور مالابار کے ساحل اس بات کے گواہ ہیں کہ عرب تاجروں کے جہاز یہاں متعدد بار لنگر انداز ہوئے۔ انہی عرب تاجروں نے ہندوستان کی معاشرتی اور مذہبی زندگی کو قریب سے دیکھا جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔ انہی مسلمان عرب تاجروں میں سلیمان کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے ۲۳۷ھ میں "سلسلۃ التواریخ" کے نام سے سفر نامہ لکھا جس میں سلیمان نے نہ صرف ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں کی طرز حکمرانی، عوام کی طرز زندگی اور معاشرتی اونچ نیچ کا ذکر کیا بلکہ چین کے حالات و کوائف سے اس کا موازنہ بھی کیا۔

تیسری صدی ہجری میں ابوزید حسن ایک سیاح تاجر گزرا ہے جس کا تذکرہ معین الدین ندوی نے یوں کیا ہے:

"(ابوزید حسن) تیسری صدی ہجری کا ایک سیاح اور تاجر ہے اور خلیج فارس کی مشہور بندرگاہ سیراف کا رہنے والا تھا۔ یہیں پر مشہور مؤرخ اور سیاح مسعودی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ سیراف سے ہندوستان اور چین کے درمیان بحری اور تجارتی سفر کیا کرتا تھا۔ اس نے سلیمان تاجر کے سفر نامے کا پچیس تیس برس بعد تکملہ لکھا جس میں ہندوستان کے رسم و رواج، تہذیب و معاشرت، مذہبی اعتقادات اور راجاؤں کے حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی

معلومات کی بنیاد یا تو چشم دید واقعات ہیں یا مشرقِ اقصیٰ کا سفر کرنے والے
دوسرے سوداگروں کے بیانیات ہیں۔اس کا یہ تکملہ بھی سلیمان کے سفر نامے
کے ساتھ پہلی مرتبہ پیرس میں ۱۸۴۵ء میں چھپا۔ ۱۱؎

تاریخ میں بغداد کا ایک مشہور سیاح، تاریخ داں، جغرافیہ داں اور تاجر ابوالحسن مسعودی گزرا ہے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر وسیاحت میں گزارااور عراق، شام، افریقہ، تبت، سوڈان، روم، ایشیائے کوچک، سری لنکا اور ہندوستان کا سفر کیا۔ اس نے اپنی مشہور و معروف تصنیف " مروّج الذہب و معاون الجواہر" میں اقوام عالم کے حالات لکھے ہیں۔ اسی کتاب میں ہندوستان کے تذکرے کے ساتھ اس کے شہروں، پہاڑوں اور دریاؤں کے متعلق نہایت بامعنی اور اہم معلومات درج ہیں۔

احمد بن فضلان، ابو اسحٰق ابراہیم طنجری، ابو النیا نشاری، حکیم ناصر خسرو بلخی ، البیرونی، ابن جبیر، شیخ ابو عبداللہ المعروف ابن بطوطہ ، مارکو پولو کے نام سیاحت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے جنہوں نے نہ صرف تاریخ وسیاحت کے میدان میں نام پیدا کیا بلکہ اُنھوں نے آنے والی نسل کے لیے ایسی بلند تصانیف چھوڑی ہیں جن کی قدر و قیمت کا ہر زمانہ معترف رہا ہے۔

اقسامِ سفر

سفر نامہ ادب میں ایک غیر افسانوی صنف ہے جو اپنے موضوع، مواد، مقاصد اور محرکات کے اعتبار سے متنوع صفات کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں روز مرہ زندگی کی دلچسپیاں بھی پائی جاتی ہیں اور کسی خطے یا علاقے سے متعلق جملہ معلومات اور تفصیلات بھی درج ہوتی ہیں جن سے عام اور خاص ہر دو قسم کے قاری خاطر خواہ استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ سفر نامہ کسی ملک ، علاقے یا خطے کی جغرافیائی حالات، معاشرتی اقدار، تاریخی اور مذہبی معلومات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سفر نامہ تحریر کرتے وقت اس بات کو خاص طور پر مدنظر رکھنا چاہیئے کہ ادبی لطافتوں اور حسنِ بیان کے ساتھ ساتھ سفر نامہ مقصدی اور افادی پہلوؤں کا بھی حامل ہو۔

موضوعاتی اعتبار سے سفر نامے کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ مذہبی سفر نامے:

مذہبی سفر ناموں میں اُن سفر ناموں کو بے انتہا شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے جو مقاماتِ مقدسہ اور زیاراتِ متبرکہ کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔اس قسم کے سفر نامے زائرینِ مقامات مقدسہ کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان سفر ناموں میں حج بیت اللہ، مکۃ المکرمہ، مدینۃ المنورہ، حرمین شریفین، مزارات و متبرک مقامات اور مذہبی اجتماعات کے بارے میں ایسی تفصیلی معلومات ہوتی ہیں جنھیں سن کر اور پڑھ کر نہ صرف انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے بلکہ ہر شخص کو اپنے مطلب کی کماحقہٗ معلومات مل جاتی ہے۔مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں لکھے جانے والے بیشتر سفر نامے ایران، عراق، حجاز اور ترکی وغیرہ جیسے اسلامی ممالک کے پس منظر و پیش منظر کا احاطہ کرتے ہیں۔ان سفر ناموں میں جغرافیائی معلومات کے ساتھ ساتھ تہذیبی، معاشرتی اور مقامی رنگ کے مناظر بھی بیان کیے جاتے ہیں اور ان میں عقیدت و احترام کی ایک روحانی فضا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ممتاز مفتی کا سفر نامہ " لبیک" حسن نظامی کا سفر نامہ " مصروشام و حجاز" عبادت بریلوی کا" دیارِ حبیب میں چند روز" غلام الثقلین رضوی کا سفر نامہ "ارضِ تمنا" اور مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ " منہ وَل کعبے شریف" مذہبی سفر ناموں کے زمرے میں آتے ہیں۔

۲۔ مشرقی سفر نامے:

مشرقی سفر ناموں میں مشرقی ممالک بشمول ایران، عرب، مصر، شام اور قسطنطنیہ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان سفر ناموں میں عموماً جہاں مذہبی عقیدت کا رنگ پایا جاتا ہے وہاں علمی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی اور سیاحتی تفصیلات بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مشرقی سفر نامے مشرقی روایات، اسلامی تہذیب و تمدن، طرز معاشرت اور سماجی و سیاسی اقدار کے امین ہوتے ہیں۔ان سفر ناموں میں جہاں مختلف تہذیبوں کے تصادم اور موازنہ کا تصور ملتا ہے وہاں مقامی نظامِ حیات اور معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔سید سلیمان ندوی کا سفر نامہ " اسیر افغانستان" محمد علی قصوری کا" مشاہداتِ کابل و یاغستان" اور حسرت موہانی کا سفر نامۂ عراق " اس قبیل کے سفر نامے ہیں۔

۳۔ مغربی سفر نامے:

اردوادب کے سفر ناموں کی فہرست اگر کھنگالی جائے تو ان سفر ناموں کا بیشتر حصہ مغربی ممالک خصوصاً یورپ و امریکا کے سفر ناموں پر مشتمل ہو گا۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بر صغیر پاک وہند کئی دہائیوں تک مغرب کے زیر تسلط رہا ہے جس کی وجہ سے یورپی زبان و کلچر کے مقابلے میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت دب کر رہی ہے۔ سفر نامہ نگاروں نے یورپ و امریکہ کے سفر نامے لکھ کر گویا اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔ان سفر ناموں کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح طور پر تہذیبی تصادم اور سیاسی کشمکش کا پتہ چلتا ہے ساتھ ہی ساتھ ان سفر ناموں میں اس بات کا بھی ذکر ملتا ہے کہ یورپی اقوام نے کیسے ترقی و عروج کی منزلیں طے کی ہیں اور اتنی جلدی اُنھوں نے اقوام عالم سے اپنی صلاحیتوں کالوہا کیسے منوالیا ہے باالفاظ دیگر یورپی اقوام پر لکھے گئے سفر ناموں کی بدولت ہندوستان کے لوگ اُن کے خیالات و نظریات سے نہ صرف آگاہ ہوئے بلکہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے اُن سے استفادہ بھی کیا۔ جمیل الدین عالی کا سفر نامہ " تماشا مرے آگے" شورش کاشمیری کا" یورپ میں چار ہفتے" اختر ممونکا کا" پیرس ۲۰۵ کلومیٹر" مرزا نثار علی بیگ کا" سفر نامۂ یورپ" شریف فاروق کا"وفاقی جمہوریہ جرمنی" پطرس بخاری کا" سفر انگلستان"پروفیسر حمید احمد خان کا" انگلستان کے کتے" بیگم اختر ریاض الدین کا" دھنک پر قدم" مغربی ممالک پر لکھے گئے سفر نامے ہیں جن سے ان ممالک پر لکھے گئے سفر ناموں کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

۴۔ مقامی سفر نامے:

مقامی سفر ناموں میں وہ سفر نامے شامل ہیں جو اندرونِ ملک مختلف شہروں، علاقوں اور سیاحتی مقامامات کے بارے میں تحریر کیے گئے ہیں جن میں پنجاب، کراچی، لاہور، پشاور، بلوچستان، سندھ، پشاور، کشمیر، گلگت، چترال، ہنزہ، بلتستان اور رتی گلی وغیرہ شامل ہیں۔ان سفر ناموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جہاں اِن علاقوں کے حسین قدرتی مناظر اور مقامی حسن وجمال اور مقامی ثقافت کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے وہاں ہمیں بر صغیر پاک و ہند کی تہذیب و معاشرت، تاریخ ،لوگوں کی طرز زندگی، بودوباش و لباس وپوشاک، طرزِ تعمیر اور تعلیم کی موجودہ صورت حال کے بارے میں کماحقہ تفصیلات و معلومات ملتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے " رتی گلی، چترال داستان، ہنزہ داستان، اعجاز حسین کا سفر نامہ " سفر نامۂ

بلوچستان" مبارک حسین عاجز کا" کہساروں کی زمین میں چند روز" اشفاق احمد کا 'سفر در سفر' اور مختار مسعود کا" سفر نصیب" کا شمار مقامی سفر ناموں میں ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ سفر نامے نہیں ان مقامی علاقوں کی تاریخ ہے تو ایسا کہنا بالکل مبالغہ نہیں ہوگا۔

موضوعاتی اعتبار سے سفر ناموں کی مختلف اقسام کے بعد ذیل میں اب مواد کے اعتبار سے بھی سفر ناموں کی مختلف اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ سفر نامے کے متعلق ایک عام قاری کو بھی اِس کی مبادیات کا علم ہو سکے۔

مواد کے اعتبار سے سفر ناموں کی درج ذیل قسمیں بنتی ہیں۔

ا۔ حقیقی سفر نامے:

حقیقی سفر ناموں میں ایسے سفر نامے شامل ہیں جن میں کسی ملک، شہر یا علاقے کی تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ابتدا میں جتنے بھی سفر نامے لکھے گئے اس میں یہی طرز اپنایا گیا البتہ بعد میں وقت گرزنے کے ساتھ ساتھ دیگر طرز کے سفر نامے لکھنے کا بھی رواج پڑ گیا۔یوسف کمبل پوش کا سفر نامہ " عجائباتِ فرنگ اور ابن بطوطہ کا سفر نامہ " عجائب الاسفار" حقیقی سفر ناموں کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں۔

۲ : سیاسی یا سرکاری سفر نامے:

اس قسم کے سفر نامے عموماً وہ لوگ تحریر کرتے ہیں جو سرکار کی طرف سے کسی وفد کی صورت میں بیرون ملک سفر کرتے ہیں یا کسی سرکاری کام سے کسی دوسرے ملک کو بھیجے جاتے ہیں یا حکومت کی طرف سے بطور سفیر کسی ملک میں تعینات ہوتے ہیں۔ایسے سفر عموماً خیر سگالی کے طور پر یا دوسرے ممالک سے تعلقات استوار کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ عموماً سفر سے واپسی پر سفر نامہ نگار سفر نامے کی صورت میں اپنے سفر کا احوال پیش کرتا ہے۔مثال کے طور پر مرزا ادیب کا" ہمالہ کا اُستاد" ،شریف فاروق کا" دیارِ دوست" اور ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کا"چین بجبین" وغیرہ

۳۔ مہماتی سفر نامے:

مہماتی سفر نامے ایسے سفر نامے ہیں جن میں سفر نامہ نگار اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر کسی مہم کو سر کرنے نکلتا ہے۔جو لوگ ایڈونچر پسند ہوتے ہیں انھیں ایسے سفر میں مزہ آتا ہے حالانکہ ایسے

سفری مہم جان لیوا ہوتے ہیں اور عام حالات میں کوئی بھی ذی شعور ایسے سفر پسند نہیں کرتا مگر مہم جو لوگ کسی خطرے کو در خور داعتنا نہیں سمجھتے اور بلا خوف و خطر اپنے سفر کا آغاز کر دیتے ہیں۔ مہماتی سفر کے حوالے سے ابن بطوطہ، واسکوڈے گاما اور کرسٹوفر کولمبس کے نام بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

۴۔ فکاہیہ سفر نامے:

یہ سفر ناموں کی وہ صنف ہے جس میں سفر نامہ نگاریوں تو سفر کے حالات و واقعات بیان کرتا ہے مگر حالات و واقعات بیان کرنے کے لیے ایسے الفاظ و کلمات کا سہارا لیتا ہے جو طنز و مزاح سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اس طرح کے طرز تحریر سے سفر نامہ نگار کے سامنے دو مقصد ہوتے ہیں ایک تو سفر میں پیش آنے والے احوال سے قاری کو متعارف کراتا ہے دوسرا وہ اپنی طرز تحریر اور اُسلوب سے اپنی تحریر کو اتنا جاذب نظر اور پر کشش بنا دیتا ہے کہ قاری اُس کا بیان مکمل سنے بغیر سفر نامہ کو چھوڑتا نہیں ہے۔ کرنل محمد خان کا سفر نامہ " بزم آرائیاں " ابن انشاء کا " چلتے ہو تو چین کو چلیئے " اور " دنیا گول ہے " صدیق سالک کا " تادمِ تحریر " ڈاکٹر آفتاب عالم صدیقی کا سفر نامہ ' ہزار داستان " اور شفیق الرحمٰن کا " دجلہ " وغیرہ فکاہیہ سفر ناموں کے ذیل میں آتے ہیں۔

۵۔ علمی سفر نامے:

علماء و فضلائے کرام اور تشنگانِ علم تحصیلِ علم کی غرض سے دوسرے ممالک جاتے ہیں یا دوسرے شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ کتب خانوں میں مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اہلِ علم سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کی محفلوں میں بیٹھتے ہیں۔ یہ سارا احوال علمی سفر ناموں میں بیان کیا جاتا ہے۔ شبلی نعمانی کا سفر نامہ " سفر نامہ روم و مصر و شام " اور سر سید احمد خان کا سفر نامہ " سفر نامۂ پنجاب " کا شمار علمی سفر ناموں میں ہوتا ہے۔

٦۔ خیالی یا تصوراتی سفر نامے:

اس قسم کے سفر ناموں کی بنیاد خیالی اور تصوراتی دنیا پر ہوتی ہے۔ انسان اپنی آنکھوں کے سامنے ایک حسین دنیا آباد کر لیتا ہے۔ وہ اس حسین دنیا میں اپنی یادوں کا تاج محل سجائے بہت دور نکل جاتا ہے اور راستے میں آنے والے گل و بوٹے اور حسین مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں نے بے شمار خیالی اور تصوراتی سفر کر کے اُردو ادب کا دامن بے حد خوبصورت

سفر ناموں سے بھر دیا ہے۔ان میں قدرت اللہ شہاب کا سفر نامہ " تو ابھی راہگزر میں ہے "۔ مستنصر حسین تارڑ کا" اندلس میں اجنبی"، محمد اختر ممونکا کا سفر نامہ " پیرس ۲۰۵ " وغیرہ شامل ہیں۔

۷۔ تفریحی سفر نامے:

تفریحی سفر ناموں میں بعض سفر نامے ایسے ہوتے ہیں جس میں چھوٹی موٹی تفریحات کا بیان ہوتا ہے جیسے کوئی پکنک منانے چلا گیا ہو یا کسی چھوٹے ٹور پر نکل گیا یا کہیں اور سیر سپاٹے کی نیت سے گیا ہو جبکہ بعض سفر ایسے ہوتے ہیں جو خالصتاً سیاحت کی نیت سے اختیار کیے گئے ہوں۔اس قسم میں سفر نامہ نگار باقاعدہ سیاح کا روپ دھار کر کسی جگہ کے لیے عازم سفر ہو گیا ہو اور اس کی روداد سفر نامے کی شکل میں بیان کی ہو۔

۸۔ میکانکی سفر نامے:

میکانکی سفر ناموں کی بنیاد دراصل وہ مواد ہے جسے سفر نامہ نگار کہیں نقشوں، بروشروں اور تصویروں سے اخذ کرلیتا ہے اور کہیں دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے سفر کی روداد کی شکل میں ڈھال لیتا ہے جس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار بذاتِ خود سفر کی کھٹنائیوں اور صعوبتوں سے آگاہ نہیں ہے نیز گردو پیش میں آنے والے مناظر کا وہ خود گواہ اور شاہد نہیں ہوتا۔سبوحہ خان کا سفر نامہ " اپنا دیس اپنے لوگ" اور عبید اللہ کا دریا دریا وادی وادی" اسی قبیل کے سفر نامے ہیں۔

۹۔ سفری سفر نامے:

سفری سفر ناموں میں سفر نامہ نگار سفر کے حالات وواقعات اور اپنے مشاہدات و تاثرات کو من وعن شروع سے لے کر آخر تک بیان کرتا ہے۔ان سفر نامہ کا ایک فائدہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ انہیں "گائیڈ بک" کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا "دی امریکن ڈائری" مستنصر حسین تارڑ کا "نکلے تیری تلاش میں" اور شفیع صابر کا "حج زیارات" وغیرہ۔

۱۰۔ پلاؤ سفر نامے:

ادیبوں کو عموماً بیرون ملک مختلف مذاکروں، مشاعروں، دعوتوں اور ادبی محافل میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔اس قسم کے بہت سے محافل مغربی ملکوں میں منعقد کیے جاتے ہیں۔شعرا و ادبا سفر سے واپسی پر اپنے تاثرات و مشاہدات سفر ناموں کی صورت میں قلم بند کرتے ہیں اس لیے ایسے

سفر ناموں کو پلاٹ سفر نامے کہا جاتا ہے۔مثال کے لیے امجد اسلام امجد کا سفر نامہ " وہ سات دن" پیش کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ رہائشی سفر نامے:

اردو ادب میں متعدد سفر نامے ایسے بھی ملیں گے جنہیں سفر نامہ نگار نے کسی ملک میں دورانِ قیام قلم بند کیے ہیں۔ایسے سفر نامے چند دنوں یا چند مہینوں میں ظہور میں نہیں آتے بلکہ سفر نامہ نگا رایک طویل مدت تک کسی جگہ قیام کرتا ہے اور اس جگہ کے چپ و راست سے واقف ہوتا ہے۔عطاء الحق قاسمی کا سفر نامہ "شوق آوارگی" اور کرنل محمد خان کا " بجنگ آمد" وغیرہ اسی نوعیت کے سفر ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔

سفر اور سیاحت میں فرق

مسافر کے سفر اور سیاح کی سیاحت کے درمیان کافی واضح فرق پایا جاتا ہے۔مسافر جب گھر سے کہیں باہر جانے کا قصد کرتا ہے تو اُس کے پیش نظر کوئی منزل ہوتی ہے اور وہ اپنی منزل تک جلد پہنچنے کی لگن میں گردو پیش سے بے خبر رہتا ہے۔اسے نہ تو گل و بوٹے کا حسن کھینچتا ہے اور نہ مظاہر قدرت کی رنگینیاں اسے متاثر کرتی ہیں۔اُس کے ذہن پر بس منزل تک پہنچنے کی دھن سوار رہتی ہے۔مسافر کے بر عکس سیاح کا کردار یکسر مختلف ہوتا ہے۔سیاح کی نظر جہاں ٹکتی ہے وہی اس کی منزل قرار پاتی ہے۔وہ گردو پیش کے مناظر اور فطرت کی رعنائیوں میں اتنا کھو جاتا ہے کہ اس کا اپنا وجود ان ہی مناظر میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔وہ کسی نظام الاوقات کا پابند نہیں رہتا۔اس کا واحد مقصد اکتساب مسرت اور حصول مسرت ہے۔اسی مسرت کے حصول میں اس کے جسم کا انگ انگ فطرت کے حسین مناظر میں غرق رہتا ہے۔اس کی نظر میں سفر زحمت نہیں بلکہ رحمت کا ایک وسیلہ بن جاتی ہے۔وہ اس رحمتِ خداوندی سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہونے کے لیے اپنی تمام حسیّات کے ساتھ اپنے گردو پیش کے ماحول سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سیاح اور مسافر کے درمیان حدِ فاصل کھینچتے ہوئے کہتا ہے:

> "سیاح کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیشے سے قطعاً منقطع ہو کر کسی غیر مادی شے کی طرح سبک اور لطیف ہو جاتا ہے اور بندھنوں اور حد

> بندیوں کو تج کر ایک آوارہ جھونکے کی طرح آزاد روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔
> مسافر کی حالت تو اس پتنگے کی سی ہے جو مکڑی کے جالے میں قید ہو اور جالے
> کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور ایک منزل سے دوسری منزل
> تک جالے کی ڈور سے بندھا ہوا بڑھتا چلا جائے لیکن سیاح مکڑی کے جالے سے
> یکسر آزاد ہے۔گھر کی دیواروں اور منزل کے دھاگوں سے بھی اسے کوئی
> سروکار نہیں۔سیاح تو اپنا راستہ خود بناتا ہے اور مسافر حرکت کرتے ہوئے بھی
> حرکت کی نفی کرتا ہے"۔ ۱۲؎

اس مختصر تفصیل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مسافر کے سفر اور سیاح کی سیاحت میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ سیاح کو سیاحت کے دوران کسی قسم کی عجلت نہیں ہوتی۔ وہ جلد بازی میں چیزوں پر سطحی نظریں نہیں ڈالتا۔ اُنہیں جہاں بھی کشش نظر آتی ہے وہیں اُس کی منزل ٹھہرتی ہے جبکہ مسافر کو اپنی منزل تک پہنچنے کی اتنی عجلت اور جلد بازی ہوتی ہے کہ وہ پر کشش مقامات اور حسین و جمیل مناظر پر محض سطحی نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ مسافر جب تک اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ نہیں جاتا اُس وقت تک اُس کی سانس اٹکی رہتی ہے اور وہ پارے کی طرح بے قرار رہتا ہے۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جو ایک سیاح اور مسافر کے درمیان خط فاصل کھینچتا ہے۔

فصلِ دوم

اُردو سفر نامے کی ابتدا

اُردو میں نثری ادب کی ابتدا اُٹھارہویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے چونکہ ہندوستان میں فارسی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اس لیے اہلِ علم اور شعراء اپنی تصنیفات اکثر و بیشتر فارسی زبان میں تصنیف کرتے تھے تاہم شعراء کا ایک طبقہ اُردو زبان میں بھی طبع آزمائی کرلیتا تھا۔اسی زمانے میں ہندوستانیوں کا رخ مغرب کی جانب ہوا۔اس ضمن میں بہت سے سفر نامے لکھے گئے۔ نیز حج بیت اللہ کے سفر نامے بھی رقم کیے گئے۔ اگرچہ ان ابتدائی سفر ناموں کی زبان فارسی تھی مگر ان ہی سفر ناموں سے اُردو سفر نامہ لکھنے کی راہیں ہموار ہوئیں۔

تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو سفر نامے کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی میں ہوا تاہم اس کی جڑیں اٹھارہویں صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اُس زمانے میں انگریزوں کو ہندوستان میں انتظام سلطنت چلانے میں دشواری پیش آرہی تھی لہٰذا اُنھوں نے انگریز افسروں کو مقامی زبانیں سکھانے کے لیے فورٹ ولیم کالج کی صورت میں ایک ادارہ قائم کیا تاکہ مقامی لوگوں کے ساتھ ربط و تعلق میں اُنھیں کوئی دشواری نہ ہو چونکہ مقامی زبانوں میں اُردو زبان بھی شامل تھی اس لیے کالج میں اُردو زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ بنایا گیا۔ فورٹ ولیم کالج نے بالواسطہ طور پر اُردو زبان و ادب کی ترویج میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

فورٹ ولیم کالج کے روحِ رواں ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے جو اُردو زبان کے پرستار تھے۔ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی زیر سرپرستی ادیبوں کی ایک جماعت نے اُردو زبان میں بے شمار داستانوں کے تراجم کیے۔ اِن ترجمہ شدہ داستانوں میں سفر نامے کے خدوخال اور عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر امن کی " باغ و بہار " کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں چار درویشوں کے سفری حالات و واقعات سامنے آتے ہیں۔ حیدر بخش حیدری کی " آرائش محفل " میں سات سیاحتوں کا احوال سفر نامے کی ابتدائی تانے بانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خلیل خان اشک کی " داستان امیر حمزہ " میں مافوق الفطرت عناصر کی سفری داستانیں اور نہال چند لاہوری کی " مذہب عشق " میں گل بکاؤلی کی تلاش میں شہزادے کے طویل سفر کا بیان سفر نامے کے ابتدائی نقوش کی کہانی سناتے ہیں۔

اس بحث سے فقط یہ بتلانا مقصود ہے کہ اُردو سفر نامے کا نقشہ اُبھارنے اور اس کا راستہ ہموار کرنے میں ان خیالی سفری رودادوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہی نقشوں، خاکوں اور سفری رودادوں کو مد نظر رکھ کر اُردو میں سفر نامہ نگاری کا آغاز ہوا۔ اس بارے میں قطب النساء ہاشمی لکھتی ہیں:

"سفر نامہ کی ابتداء ضمنی طور پر داستان اور کہانی کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ سفر نامے کے مصنف کا مقصد یہ ہر گز نہیں رہا تھا کہ وہ سفر نامہ لکھے۔ البتہ اس کا ابتدائی کردار زیادہ دیر تک اور زیادہ دور تک باقی نہیں رہا بلکہ جلد اس کو عملی پشت پناہی حاصل ہو گئی۔ قوتِ عمل اور قوت تسخیر کے زیرِ اثر وجود میں آنے والی یہ صنفِ ادب کئی دوسرے شعبۂ ہائے علوم کی مدد گار ہوئی۔" ۱۳

اُردو سفر ناموں کی طویل فہرست میں جس سفر نامے کو اولیت کا شرف حاصل ہے وہ یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ "تاریخِ یوسفی" المعروف "عجائباتِ فرنگ" ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:

"تاحال دریافت شدہ سفر ناموں کی طویل فہرست میں یوسف خان کمبل پوش کا "تاریخِ یوسفی" المعروف "عجائباتِ فرنگ" اردو کا اولین سفر نامہ قرار پاتا ہے۔ یوسف خان کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا سفر کیا تھا۔ یہ سفر نامہ اسی سفر کی روداد ہے۔" ۱۴

"عجائباتِ فرنگ" صرف اولین سفر نامہ ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس میں اسلوب کا رنگ بھی موجود ہے اور سفر نامے کے بہت سے لوازمات کا بھی اس میں لحاظ رکھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۳ء میں تحسین فاروقی نے اسے از سر نو ترتیب دے کر اسے ایک جامع تبصرے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا۔ تحسین فاروقی لکھتے ہیں:

"کمبل پوش کی "تاریخِ یوسفی" یا عجائبات فرنگ" اُردو کا پہلا سفر نامہ ہی نہیں سفر نامے کا اہم ترین سنگ میل بھی ہے اور اس پر جدید سفر نامے کی اصطلاح کا اطلاق بھی بہت حد تک ہوتا ہے۔ جہاں تک سفر یورپ کا تعلق ہے اُردو میں اب تک اس باب میں ۳۰۔۳۵ سفر نامے لکھے جاچکے ہیں، جن کا سلسلہ کمبل پوش سے عطاء الحق قاسمی تک پھیلا ہوا ہے لیکن "عجائبات فرنگ" ان میں اولیت

کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اُسلوب اور لوازمے کے اعتبار سے بھی ایک بے مثل سفر نامہ ہے"۔ ۱۵؎

پروفیسر جمیل احمد انجم " عجائبات فرنگ " کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"عجائباتِ فرنگ اُردو کا پہلا سفر نامہ اس اعتبار سے قرار دیا جاسکتا ہے کہ یہ پہلی تصنیف ہے جس پر سفر نامہ کی شرائط کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ سفر نامہ ڈائری کی طرز کا ہے کیونکہ مصنف نے سفر کے تمام واقعات تاریخ وار تحریر کیے ہیں۔ یوسف خان کمبل پوش نے اپنے مذہب، اپنے مشاغل، مے نوشی، دورانِ سفر کے مصائب، انگریزوں سے حسنِ سلوک اور اُن کے تہذیب وتمدن پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے"۔ ۱۶؎

یوسف خان کمبل پوش کو سیر وسیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اسی شوق کی تکمیل کی خاطر اُنھوں نے انگلستان کا رخ کیا اور مشہور و معروف مقامات کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ وہ شعوری طور سفر نامہ نہیں لکھ رہا تھا مگر اُس کے قلبی وجدان نے اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ساتھ ساتھ سفر کا احوال بھی قلم بند کرتا رہے۔ پروفیسر منور رؤف سفر نامے کے آغاز کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"بڑی دلچسپ بات ہے کہ یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ بھی غیر شعوری طور پر ہی اُردو کا اولین سفر نامہ بن گیا۔ وہ خود سفر نامے کے بنیادی تقاضوں سے ناآشنا تھے۔ بس اُن کے مزاج کی آزادی نے دورانِ سفر انھیں ایک بے فکر اور آزاد سیاح بنائے رکھا جس نے نہ صرف انگلستان اور فرانس کی مادی زندگی کی چکاچوند اور تماشے دیکھے بلکہ ہندوستان کی زبوں حالی پر بھی گہری نظر ڈالی اور ان سب یاداشتوں کو نہایت دلچسپ اور شگفتہ انداز میں سپردِ قلم کر دیا"۔ ۱۷؎

"عجائبات فرنگ" بیانیہ طرز کا سفر نامہ ہے۔ اس میں داستان کی چاشنی بھی ہے اور افسانے کا سا لطف وجاذبیت بھی۔ سلاست بھی ہے اور کہیں رنگینیٔ بیاں کا رنگ بھی موجود ہے۔ مقفیٰ و مسجع جملوں، محاورات اور ضرب الامثال نے اس کے حسن ودلکشی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

اُردو ادب کے قدیم سفر ناموں میں نواب کریم خان کا تحریر کردہ سفر نامہ " سیاحت نامہ " بھی محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ یوسف خان کمبل پوش کے ہم عصر تھے۔ مارچ ۱۸۴۰ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ یہ

سفر دراصل نواب کریم خان نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے جھجھّر کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔نواب کریم خان روزمرہ کے حالات و واقعات کو بڑی باقاعدگی سے اپنی ڈائری میں قلم بند کرتے۔ اُنھوں نے نہ صرف سفری واقعات کو ڈائری میں لکھا ہے بلکہ مشرق و مغرب کا بڑی باریک بینی اور مہارت سے موازنہ بھی پیش کیا ہے۔

سید فدا حسین کا " تاریخ افغانستان" ، مرزا ابو طالب خان اصفہان کا" سفر فرنگ"مولوی مسیح الدین علوی کا سفر نامہ "تاریخ انگلستان" اُردو کے قدیم سفر ناموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔اس کے بعد سر سید کی اصلاحی تحریک کا آغاز ہوتا ہے اور سفر نامہ کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس میں سفر نامہ کو باقاعدہ ایک صنف کا درجہ مل جاتا ہے۔

سر سیّد اور عہدِ سر سید کے سفر نامے

سر سید احمد کے دور میں ہندوستان کا سیاسی، مذہبی اور تہذیبی منظر نامہ مکمل طور پر تبدیل ہو رہا تھا۔مشرقی تہذیب پر گھٹاٹوپ اندھیرے چھا رہے تھے جبکہ مغرب کا سورج اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ نظروں کو خیرہ کر رہا تھا۔جدید علوم کا ہر طرف شہرہ تھا۔سائنسی ایجادات کی مقبولیت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا اور لوگ مغرب کو بڑی رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔اسی دور میں سرزمینِ انگلستان کی کشش نے بے شمار ہندوستانی سیاحوں کو اپنی جانب کھینچا۔سب سے پہلے یوسف خان کمبل پوش کو سرزمینِ انگلستان بہت بھائی اور وہاں جاکر اپنے تجربات و مشاہدات میں اضافہ کیا۔یوسف خان کمبل پوش کے بعد تو سیاحوں کی ایک قطار لگ گئی یہاں تک کہ سر سید احمد خان نے بھی انگلستان کے لیے رختِ سفر باندھا۔دراصل سر سید احمد خان اپنی قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔یہی جذبہ اسے انگلستان کھینچ لایا۔وہ انگلستان کی تعلیمی حالت اور انگریزوں کی ترقی کا راز جاننا چاہتے تھے تاکہ آگاہی حاصل کر کے وہ ہندوستان میں اس کو رواج دے۔

بلامبالغہ سر سید احمد خان ایک مصلح قوم تھے۔وہ ہندوستانیوں کی زبوں حالی کو ترقی میں بدلنے کے خواہاں تھے۔اس کے سفر انگلستان کے پیچھے بھی یہی راز پنہاں تھا۔سر سید کے سفر نامہ " مسافرانِ لندن" سے اس کا ثبوت واضح طور پر ملتا ہے۔

اس بارے میں مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

"جس دھن میں سر سید نے یہ سفر کیا تھا۔ اس کا ثبوت سفر نامے میں نہایت
وضاحت سے ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفر نامہ لکھنے والا وطن اور قوم کی
خیر خواہی اور ہمدردی میں شرابور ہے۔ ۱۸؎

مبصرین اور ناقدین سر سید احمد خان کے "سفر نامہ لندن" کو بہت اہمیت دیتے ہیں کیونکہ سر سید احمد خان کا یہ سفر محض ایک سیاح کا سفر نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے اصلاح قوم اور تعمیر قوم کا ایک عظیم مقصد پنہاں تھا۔ اُس کے دل میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ اپنی قوم کو تعلیمی میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑا کرے۔ مغرب نے جس طرح مادی اور تعلیمی میدان میں انقلاب برپا کیا ہے۔ یہی مادی ترقی اور یہی تعلیم و تربیت اُن کے ہم وطنوں کا بھی مقدر بنے۔ غرض اُن کی سوچ کا محور و مرکز صرف اور صرف اپنی قوم کو تعلیمی لحاظ سے ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کرنا تھا۔ سیاحت کے دوران اُنھوں نے انگلستان کو نہایت قریب سے دیکھا۔ اُن کی خوبیوں، خصوصیات کو انتہائی گہرائی سے مشاہدہ کیا جس سے وہ حد درجہ متاثر نظر آئے۔ وہ اپنے ہم وطنوں میں بھی ایسی خصوصیات دیکھنے کے خواہاں تھے۔ سر سید احمد خان کا انگلستان جانے کا ایک دوسرا مقصد بھی تھا۔ وہ سر ولیم میور کی گستاخانہ اور گمراہ کن کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنا چاہتے تھے۔ انگلستان میں رہ کر سر سید احمد خان نے یہ دونوں مقاصد حاصل کیے۔

"سفر نامہ لندن" کے بارے میں محمد اسماعیل پانی پتی نے بجا تبصرہ کیا ہے۔
وہ لکھتے ہیں:

"جن مقاصد کے لیے سر سید احمد خان نے یہ سفر کیا اور جن حالات و واقعات
سے دورانِ سفر اُن کا سابقہ پڑا۔ اُن میں سے ہر واقعہ سر سید کے لیے ایک
مستقل اذیت بن گیا جب وہ کسی خوشی کی محفل میں شریک ہوتے۔ معاً اُن
کے سامنے مسلمانوں کی بدحالی کی تصویر کھینچ گئی اور آہ بھر کر خاموش
ہوگئے۔۔۔ جب کوئی رنج و غم کا موقع اُن کے سامنے آیا تو فوراً اُن کو اپنی قوم
کی نکبت اور فلاکت یاد آئی اور وہ سخت پژمردہ اور مضمحل ہوگئے"۔ ۱۹؎

مولانا الطاف حسین حالی سر سید کے سفر لندن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”سر سید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو آئندہ بہبود کے لیے ضروری سمجھا تھا ان کے لیے انگلستان کا سفر ضروری تھا۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی، جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں اُنس اور میل جول پیدا نہ ہو گا، اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ ۲۰؎

سر سید احمد خان کے دل میں عرصہ دراز سے انگلستان جانے کی خواہش تھی مگر مالی مشکلات کی وجہ سے وہ اپنی خواہش پوری کرنے سے قاصر تھے۔ حسنِ اتفاق سے سرکار نے سر سید احمد خان کے بیٹے سید محمود کو ولایت جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ مقرر کیا تو سر سید کی خواہش کی تکمیل بھی ممکن ہوئی اور یوں وہ اپنے دونوں بیٹوں سید محمود اور سید حامد کے ہمراہ لندن پہنچے۔

سر سید احمد خان نے انگلستان میں رہ کر بچشم خود جو کچھ دیکھا اور حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا وہ اُن تمام تجربات و مشاہدات کو خطوط کی صورت میں ہندوستان بھیجتا رہا جو سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کے اخبار میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا تھا مگر بعض مخالفین کی شر انگیزی کو دیکھ کر سر سید نے خطوط کی اشاعت کا یہ سلسلہ موقوف کر دیا۔ بعد میں سر سید احمد خان اپنے دوستوں کو خطوط لکھ کر اپنے سفری حالات و مشاہدات بھیجتے رہے مگر اس میں ربط و ضبط کا فقدان تھا۔ سر سید کی وفات کے بعد شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے ان منتشر اور ادھورے خیالات کو سفر نامہ کی شکل دی تاہم یہ سفر نامہ مکمل و مربوط سفر نامہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

سر سید کا دوسرا سفر نامہ ” سفر نامہ پنجاب “(۱۸۸۴ء) ہے جسے اُن کے شریکِ سفر مولوی سید اقبال نے قلم بند کیا ہے۔ اس سفر نامے کے پس پردہ بھی وہی تعلیمی جذبہ ہے جس کے زیر اثر وہ انگلستان پہنچا تھا۔ مغربی پنجاب کے لوگ مالی لحاظ سے آسودہ حال تھے۔ سر سید احمد خان اُن میں تعلیمی جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی مقصد کے پیش نظر سر سید احمد خان نے مختلف شہروں میں جا کر اُن کے سامنے تقریریں کیں اور اُنھیں جدید تعلیم کی تحصیل پر اُبھارا۔ یہ سفر نامہ فی الواقع سر سید احمد خان کی عزم و ہمت کی یادگار ہے۔

سر سید کے زمانے کا ایک اہم سفر نامہ ’’سفر نامۂ یورپ‘‘ ہے جسے نثار علی بیگ نے قلم بند کیا ہے۔ نثار علی بیگ نے ۱۸۸۵ء میں یورپ کا سفر کیا اور اپنے سفر کے تمام احوال کو روزنامچے کی صورت میں لکھتے رہے یہاں تک کہ سفر نامہ تیار ہو گیا۔ اگرچہ یہ سفر بھی کسی مقصد سے خالی نہیں تھا مگر اس کے باوجود سیاحت کی غرض وغایت بھی موجود تھی۔ بلاشبہ نثار علی خان نے ایک محقق اور ناقد کی حیثیت سے لندن کو دیکھا، پرکھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے سپرد قلم کیا۔ چونکہ اس سفر کا تعلق تعلیم سے تھا اس لیے اس نے لندن کے تمام تعلیمی اداروں کا بغور جائزہ لیا اور ہندوستان کے تعلیمی اداروں سے اس کا موازنہ بھی کیا۔ بحیثیت مجموعی ’’سفر نامہ یورپ‘‘ معلومات کے ایک زبردست خزانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شبلی نعمانی کا سفر نامہ ’’سفر نامہ روم و مصر و شام‘‘ اسلامی ممالک کے سفر کے احوال پر مشتمل ہے۔ شبلی کو تحقیق اور ادب و تاریخ سے خاص نسبت تھی۔ اپنی علمی تحقیق کے دوران مولانا شبلی پر منکشف ہوا کہ یورپ کے مؤرخین نے انتہائی تنگ نظری اور تعصب سے کام لے کر اسلام کو دنیا کے سامنے غلط رنگ میں پیش کیا ہے جس کی وجہ سے لوگ اسلام سے بہت زیادہ متنفر اور بیزار ہو گئے تھے۔ مولانا شبلی نے سفر نامہ روم و مصر و شام تحریر کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا کیونکہ اس سفر نامے میں مولانا نے ملت اسلامیہ کا صحیح رنگ دنیا کے سامنے پیش کیا اور مغربی مصنفین کی ریشہ دوانیوں اور تعصب کا منہ توڑ جواب دیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں اسلام کی قد آور شخصیات اور جلیل القدر ہستیوں کی سوانح حیات لکھنے کا خیال سوجھا۔

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ’’جس زمانے میں مجھے ’’ہیروز آف اسلام‘‘ لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا، یہی خیال تھا کہ جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی، یہ یقین تھا کہ مصر وروم میں اسلامی تعلیمات کا جو بقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک ایسا سلسلہ تالیف ضرور تیار ہو سکتا ہے‘‘۔ ۲۱؎

مولانا محمد حسین آزاد کے دو یادگار سفر نامے "وسط ایشیا کی سیر" اور "سیر ایران" ہیں جو اُن کی موت کے بعد شائع ہوئے۔ سفر نامہ "وسط ایشیا کی سیر" دراصل مولانا کے اس سفر کی روداد ہے جو اس نے ایک سرکاری وفد کے رکن کی حیثیت سے وسط ایشیا کے حالات معلوم کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ سفر سے واپسی کے بعد اس کے دل میں ایران کی سیر کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک تو مولانا صاحب وہاں سے کچھ ضروری کتابیں لانا چاہتے تھے دوسرا وہ فارسی زبان کی لغت تیار کر کے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل چاہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا سفر نامہ "سیر ایران" کافی اہمیت کا حامل ہے۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفر نامہ "کالا پانی" جزائر انڈمان کے احوال و واقعات اور تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں انگریزوں کے ظلم و بربریت کو آشکارا کر کے اُنھیں نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ سفر نامہ جہاں فرنگی ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے وہاں ہندوؤں کے متعصبانہ رویے سے بھی دنیا کو آگاہ کرتا ہے۔ "تواریخ عجیب" موسوم بہ "کالا پانی" خود نوشت سوانح کے انداز میں لکھا ہوا سفر نامہ ہے۔

سفر نامہ "بلاد اسلامیہ" مولوی عبد الرحمن امر تسری کا سفر نامہ ہے جس میں اس نے روم، مصر، شام کی سیاحت کا احوال قلمبند کیا ہے۔ اس سفر نامے میں مولوی صاحب نے ان ملکوں کی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج کو بطور خاص بیان کیا ہے اور ہر ہر قدم پر اور ہر نئے تجربے میں قاری کو بھی اپنے ساتھ شریک سفر بنالیا ہے۔

ڈاکٹر شاہ علی سبز واری کا سفر نامہ "خوفناک دنیا" رام پور کے نواب حامد علی خان کا سفر نامہ "سیر حامدی" لالہ تیج ناتھ ایڈیشنل جج سہارن پور کا سفر نامہ "انگلینڈ اور انڈیا" اور مولوی عبد الخالق موحدی کی سفری روداد "سیر برہما" ایسے سفر نامے ہیں جنھوں نے بدرجہ اولیٰ اُردو سفر نامے کا دامن موتیوں سے بھر دیا ہے اور جن کی بدولت اُردو ادب میں اُردو سفر نامے کی ایک علیحدہ پہچان اور شناخت بن گئی ہے۔

عبوری دور کے سفر نامے

بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر تقسیم ہند تک کا دور اُردو سفر نامے کا عبوری دور کہلاتا ہے۔ یہ عرصہ تقریباً چالیس برس پر محیط ہے۔ یہ اُردو زبان و ادب کا ارتقائی دور بھی تھا۔ اس دور میں بعض ادیبوں نے انگلستان کا رخ کیا اور ہندوستانی عوام کے استفادہ کے لیے وہاں کے مشاہدات و تجربات کو اپنے سفر ناموں میں بیان کیا۔ سر سید احمد اور اُن کے رفقاء نے بھی اُردو ادب کے گلستان میں چار چاند لگائے۔ کلکتہ میں قائم فورٹ ولیم کالج نے بھی اُردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔ اخبارات و رسائل بھی اس خدمت میں پیش پیش تھے۔ اسی دور میں سفر نامے کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ابتدا میں سر سید، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ نے اپنے سفری حالات و واقعات اور تجربات و مشاہدات روزنامچوں اور ڈائریوں کی شکل میں بیان کیے۔ بعد میں یہی روزنامچے سفر ناموں کا راستہ ہموار کر گئے۔ عبوری دور کے سفر نامہ نگاروں میں سب سے پہلا نام منشی محبوب عالم کا ہے۔ اُنھوں نے " سفر نامۂ یورپ " اور "سفر نامہ بغداد" کی صورت میں دو سفر نامے یادگار چھوڑے ہیں۔ "سفر نامہ یورپ" انگلستان، فرانس، روم، شام اور مصر کی سیاحت پر مشتمل ہے جو محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء میں یہ سفر کیا تھا۔ " سفر نامۂ بغداد" میں بغداد کے حالات و تجربات رقم کیے گئے ہیں۔ محبوب عالم چونکہ خود اخبار سے وابستہ تھے اس لیے اُنھوں نے دورانِ سفر ایک صحافی کی آنکھ سے ایک ایک چیز کو دیکھا، پرکھا اور پھر اس کے متعلق اپنی کیفیات کا ذکر کیا۔ منشی محبوب عالم کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے ایک غیر جانبدار منصف کی طرح جو کچھ دیکھا بلا کم و کاست بیان کیا ہے جس کی وجہ سے اُن کے سفر ناموں کی اہمیت و وقعت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

نواب فتح علی خان ریاست علی رضا آباد لاہور کے رئیس تھے اور سیر و سیاحت کے دلدادہ تھے۔ چونکہ صاحب حیثیت تھے اس لیے اپنے شوق کی تکمیل میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ پہلے پہل حجاز مقدس گئے اور حج بیت اللہ کا فریضہ انجام دیا اس کے بعد اٹلی، فرانس، انگلستان، سسلی اور بلغاریہ کی سیاحت کی مگر ان کو زیبِ قرطاس نہ کر سکے۔ اُنھوں نے صرف ایک سفر نامہ " سیاحتِ فتح خانی" کے نام سے قلم بند کیا ہے جو انگلستان کے سفر کی یادگار ہے۔

"روزنامچہ سیاحت" غلام الثقلین کا سفر نامہ ہے جس میں اُنھوں نے روس، ایران، عراق، قسطنطنیہ اور عرب کا جغرافیائی اور تاریخی تناظر میں بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ سفر نامہ نگار کا خاصہ یہ ہے کہ مختلف اشیاء کا ایسی دور بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف خود بلکہ قاری کو بھی اس چیز کے سیاق وسباق تک پہنچادیتے ہیں۔ یہ اُنہی کا خاصہ ہے کہ وہ بہت جلد ہر چیز سے بے تکلف ہو جاتے ہیں اور یہی بے تکلفی اُن کی تحریر میں بھی آجاتی ہے جس کی وجہ سے اُس کی تحریر میں ایک جادوئی اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کے بیان سے اپنی تحریر میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتے ہیں اور سفر کے واقعات کا نتیجہ اخذ کرنے کے بجائے یہ ذمہ داری قارئین کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اُردو ادب میں مصور فطرت کے لقب سے مشہور ہیں اور یہ لقب انھیں بے جا نہیں ملا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مناظرِ فطرت اور مظاہرِ فطرت کی جس خوبصورت اور متنوع انداز میں عکاسی کی ہے اور اپنے منفرد قلم کا جو جادو جگایا، اس نے اُنھیں صحیح معنوں میں اس لقب کا مستحق قرار دیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے متعدد سفر کیے ہیں جن میں ہندوستان کے جنوب میں بمبئی، گجرات، کاٹھیاواڑ، سفر حجاز مقدس، سفر افغانستان، سفر مصر، فلسطین و شام وغیرہ شامل ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ہر سفر کی تفصیلات کو تاریخ وار روزنامچے کی شکل میں لکھا پھر اسی روزنامچے کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے سفر نامہ بنادیا۔ اُنھوں نے سفر کے واقعات کو ایسے فطری انداز میں بیان کیا ہے جیسے کوئی سچ مچ حقیقی زندگی پر بنی فلم دیکھ رہا ہو۔ خواجہ صاحب کے سفر نامے میں روانی بھی ہے اور جادو بیانی بھی، جذباتی رنگ بھی موجود ہے اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مولوی محمد علی قصوری کا سفر نامہ "مشاہداتِ کابل و یاغستان" آپ بیتی کے انداز میں لکھا ہوا سفر نامہ ہے۔ یہ ایک سیاسی سفر تھا جو حکیم اجمل خان، مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام کے مشورے پر کیا گیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری نے اگرچہ مغربی تعلیم سے استفادہ کیا تھا اور انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی میں ماسٹر کیا تھا مگر اُس کا دل خالصتاً مشرقی تھا اور انھیں مشرقی روایات اور رسم ورواج عزیز تھیں۔

سفر نامہ "کابل میں سات سال" وہ سفر نامہ ہے جسے مولانا عبید اللہ سندھی نے تحریر کیا ہے یہ دراصل مولانا صاحب کے انقلاب آفرین سیاسی سفر کا احوال ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے دیوبند

مدرسہ سے علم حاصل کیا۔ وہ دوسرے اساتذہ کرام کے ساتھ ساتھ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے بھی شاگرد رہے۔ اپنے اُستاد کے حکم پر کابل گئے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ سفر کا مقصد یہ تھا کہ کابل کی حکومت انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے اور وہاں اسلامی حکومت کا ڈول ڈالنے میں معاونت کرے۔ چونکہ مولانا عبید اللہ سندھی ایک زیرک، دانا، صاحب بصیرت اور صاحب کردار انسان تھے اس لیے اس کام کے لیے آپ کو چُنا گیا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی چونکہ ایک خاص مشن اور ایک خاص مقصد لے کر افغانستان گئے تھے اس لیے وہ کھل کر سفر نامہ میں ہر چیز کا اظہار نہیں کر سکے ہیں البتہ اس نے ریشمی رومال تحریک اور انگریزوں کے خلاف دوسری بہت سی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا صاحب کا سفر نامہ ایک سیاسی نما ڈائری ہے جس میں خود نوشت سوانح عمری کے اجزاء بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اندازِ بیاں دلچسپ اور واقعات جاذبیت سے خالی نہیں ہیں۔

سید سلیمان ندوی نے " سیر افغانستان " کی صورت میں افغانستان کے سفر کی روداد بیان کی ہے اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بادشاہ نادر شاہ کے آزاد افغانستان میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سید سلیمان ندوی کابل کے بادشاہ نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان گئے تھے۔ اس سفر میں ڈاکٹر علامہ اقبال اور سر راس مسعود بھی ہمراہ تھے۔ سید سلیمان ندوی نے یہ سفر نامہ رسالہ "معارف" کے لیے تیار کیا تھا جس میں یہ قسط وار چھپتا رہا۔ سید سلیمان ندوی نے اگرچہ صرف چار دن افغانستان میں قیام کیا مگر اس قلیل عرصے میں بھی اُنھوں نے افغانستان کی تاریخی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی، مذہبی اور تعلیمی حالت کو قریب سے جان کر اپنے سفر نامے میں اِس کی بہت خوب صورت انداز میں عکاسی کی ہے۔

سید سلیمان ندوی کا دوسرا سفر نامہ " بریدِ فرنگ " ہے جو اُن خطوط سے مرتب کیا گیا ہے جو اُنھوں نے سفر یورپ کے دوران اپنے دوست احباب کو لکھے تھے۔ اس میں یورپ کے متعلق اُن کی ذاتی زاویہ نگاہ کا بہ احسن وخوبی پتہ چلتا ہے۔

قاضی عبد الغفار کا سفر نامہ " نقشِ فرنگ " انگلستان کے سفر کا احوال ہے۔ ایشیا کے مسائل اور تحریک خلافت کے موضوع کے سلسلے میں ایک وفد ۱۹۲۱ء میں انگلستان کی دعوت پر گیا تھا۔ اس وفد میں قاضی عبد الغفار بھی شامل تھے۔ قاضی عبد الغفار نے گوروں کو نہایت قریب سے دیکھا اور کالے گورے کی تفریق واضح طور پر محسوس کی جس کا اظہار نے اُنھوں نے سفر نامے میں بھی کیا ہے۔ قاضی عبد الغفار کا

سفر نامہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اگر ایک طرف گرد و پیش کا احوال اور تاریخی حقائق کا تذکرہ ملتا ہے تو دوسری طرف جذبات و تاثرات کا اظہار بھی موجود ہے۔

والئی افغانستان غازی امان اللہ اپنے ملک افغانستان کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے اس سلسلے میں آپ نے مختلف ممالک کا سفر کیا اور وہاں تجربات اور مشاہدات کو بروئے کار لا کر اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو گئے۔ سفر کے دوران یورپی ممالک کی سیر سے آپ بے حد متاثر ہوئے۔ ''سفر نامہ شاہِ افغانستان ''ہندوستان، مصر، عدن، اٹلی، جرمنی، روس ، فرانس اور انگلستان کے سفر و سیاحت کی روداد ہے۔

''سفر نامہ اُندلس'' قاضی ولی محمد کا سفر نامہ ہے۔ سپین جو کسی زمانے میں اُندلس کہا جاتا تھا مسلمانوں کے شاندار ماضی کا امین تھا۔ اُندلس کا دارالخلافہ غرناطہ (میڈرڈ) علم و فن کا مرکز اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا مگر مسلمانوں کا یہ گہوارہ تباہی و بربادی سے دوچار ہوا اور آج یہ غیروں کے قبضے میں ہے۔ قاضی ولی محمد اُندلس جا کر اس کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں وہ چار مہینے وہاں قیام پذیر رہے اور تاریخی مآخذات اور مستند حوالے جمع کر کے اس نے '' سفر نامہ اُندلس'' ترتیب دیا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ہمراہ ایک بار افغانستان گئے تھے اور متعدد بار یورپ کا سفر بھی کیا تھا اور ان سفروں کا احوال اپنے قریبی دوستوں کو خطوط میں بیان کر کے بھیجتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف اخبار و رسائل میں بھی آپ کے سفری روداد کے متعلق بیانات شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس تمام مواد کو یکجا کر کے اور اُن کو ترتیب دے کر سفر ناموں کی شکل میں شائع کیا گیا۔ پروفیسر حق نواز نے 'سیاحت اقبال'' اور محمد حمزہ فاروقی نے '' سفر نامہ اقبال'' کے نام سے علامہ اقبال کے تمام اسفار کے حالات و واقعات مرتب کیے ہیں۔

''سفر نامۂ حجاز''اور ''سفر نامہ عراق'' نشاط النساء المعروف بہ بیگم حسرت موہانی کے سفر نامے ہیں۔ آپ صرف خاتون خانہ نہیں تھیں بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں اور ہر سفر میں اُن کے ہمراہ دوش بدوش موجود رہتی تھیں۔ آپ کے سفر ناموں کو پڑھ کر نہ صرف آپ کی ذہنی بالیدگی کا پتہ چلتا ہے بلکہ اُمورِ سیاست کی جانکاری کا ثبوت بھی بہم ملتا ہے۔ سر رضا علی پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ وہ متعدد بار روس اور یورپ کے سفر پر گئے۔ ہندوستانیوں کے حالات جاننے کے لیے جنوبی افریقہ گئے۔ جنوبی افریقہ میں وہ انگریز سرکار کی جانب سے بطور ہائی کمشنر

مقرر ہوئے اور وہاں تین چار سال قیام کیا۔" اعمال نامہ " میں انہی سفروں کا احوال بیان ہوا ہے۔یہ سفر نامہ کم اور آپ بیتی زیادہ لگتا ہے کیونکہ سفر کی ساری باتیں اُن کی ذات کے گرد ہی گھومتی ہیں تاہم جنوبی افریقہ کے سیاسی حالات،وہاں کی تہذیب و معاشرت،ہندوستانیوں کی بودوباش،اُن کی حیثیت،ان تمام چیزوں کا بالتفصیل بیان ہوا ہے۔

عبوری دور کے ان سفر ناموں کے علاوہ شیخ عبد القادر کا" مقام خلافت اور سیاحت نامہ یورپ"، مرزا حسین احمد بیگ کا" پردیس کی باتیں "نواب محمد ظہیر الدین کا" سیاحت نامہ "شوکت عثمانی کا سفر نامہ ' میری روس یاترا" محمد فضلی کا سفر نامہ " حقیقتِ جاپان "شاہ بانو کا سفر نامہ "سیاحتِ سلطانی" محترمہ نازلی رفیعہ سلطان بیگم کا"سیر یورپ" قاضی ولی محمد کا" سفر نامہ اُندلس" وغیرہ اہم سفر نامے ہیں۔

فصلِ سوم

قدیم اور جدید سفر ناموں میں فرق

اگر قدیم سفر ناموں اور جدید سفر ناموں کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا جائے تو اُن میں کافی زیادہ بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ سفری سہولیات کے فقدان کی وجہ سے قدیم زمانے کا سفر نامہ ایک محدود اور مخصوص علاقے میں مقیّد نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ نگار کی سوچ بھی سفر نامے کی طرح حد بندیوں میں بٹی ہوئی لگتی ہے۔ اگر قدیم زمانے کے سفر نامہ نگار اور جدید دور کے سفر نامہ نگار کا بنظرِ عمیق اور بہ ارادۂ تحقیق جائزہ لیا جائے تو اُن میں ذہنی، فکری، تہذیبی، علمی، مجلسی اور سماجی لحاظ سے بہت فرق نظر آتا ہے۔ جو کشادہ قلبی اور رفعتِ نظر جدید سفر نامہ نگار کا طرۂ امتیاز ہے۔ قدیم سفر نامہ نگار اس سے کوسوں دور تھا یہی وجہ ہے کہ دونوں زمانوں کے سفر ناموں اور سفر نامہ نگاروں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔

قدیم زمانے میں زندگی بے حد محدود تھی۔ لوگوں کے پاس کسی بات کی تصدیق کے لیے نہ تو معلومات ہوتی تھی اور نہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے اُن کے پاس وسائل ہوتے تھے۔ سفر نامہ نگار جو کچھ بیان کرتا، اپنے تخییل سے جو سماں باندھتا اور جو فرضی اور حقیقی معلومات لوگوں تک پہنچاتا، قدیم زمانے کا قاری اُنھیں مِن و عَن تسلیم کرتا تھا مگر پرانے زمانے کی بہ نسبت آج کا قاری زیادہ بیدار مغز، زیادہ معلومات رکھنے والا اور کسی حد تک وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ وہ کسی بھی وقت سفر نامہ نگار کے بیان کو جانچ سکتا ہے اور اُن کی تصدیق کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کے سفر نامہ نگار کا کام بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ آج کا سفر نامہ نگار محض فرضی داستان سنا کر یا اپنے تخییل کے زور پر کوئی کہانی گھڑ کر آج کے قاری کو نہ تو ٹرخا سکتا ہے اور نہ اُنھیں اندھیرے میں رکھ سکتا ہے لہٰذا آج کے سفر نامہ نگار کا کام ماضی کے سفر نامہ نگار کے مقابلے میں کافی مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔

قدیم سفر ناموں کی تصنیف کے پس پردہ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور کار فرما ہوتا تھا جو سفر نامے کی ادبی روح کو مجروح کرتا تھا۔ بیشتر سفر ناموں کا مقصد معلومات فراہم کرنا ہوتا تھا نتیجتاً سفر نامہ، سفر نامہ نہ رہتا بلکہ تاریخ و جغرافیہ کی کوئی کتاب بن کر رہ جاتی۔ علاوہ ازیں تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، سیاست و تعلیم وغیرہ جیسے پہلوؤں پر بھی خامہ فرسائی دیکھنے کو ملتی جبکہ جدید سفر نامے میں اجتماعیت کی

بجائے انفرادیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ سفر نامہ نگار دوسروں سے زیادہ خود اپنے لیے زیادہ لکھتا ہے۔ اس میں جہاں تخلیقیت کا مادہ پایا جاتا ہے وہاں اس میں مقصدیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو جدید دور کا سفر نامہ، سفر نامہ نگار کی ذاتی واردات اور قلبی تاثرات کا ایک اظہار نظر آتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے ماضی کے سفر نامہ نگار کی بڑی واضح تصویر پیش کی ہے۔ لکھتا ہے:

"ماضی کا سیاح واقعات کو ضبطِ تحریر میں لاتے وقت اپنی ذات کو خارج کر دیتا تھا اور یوں وہ شہروں کا، واقعات کا غیر جذباتی اور غیر تخلیقی بیان بن جاتا ہے" ۲۲۔

قدیم سفر نامے کی ایک خامی یہ بھی ہے اس میں افسانویت زیادہ اور تخلیقیت کم ہوتی ہے بلکہ سفر نامہ نگاروں نے سفر نامے کم اور افسانے زیادہ تخلیق کیے ہیں حالانکہ افسانے کے فنی لوازمات اور تقاضے سفر نامے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ سفر نامہ ظاہر سے باطن کی طرف سفر کرتا ہے اور تاثرات و کیفیات کی شکل میں اپنا بیان کرتا ہے جبکہ افسانہ مختلف واقعات کے ظہور سے جنم لیتا ہے اور مختلف کرداروں کے توسط سے آگے بڑھتا ہے۔

جدید سفر نامہ اس عیب سے مبرّا ہے۔ اس میں سارا ماحول اور گردو پیش کے مناظر سفر نامہ نگار کے گرد گھومتے ہیں۔ اس میں کردار صرف سفر نامہ نگار ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو محور بنا کر اور گردو پیش کے مناظر کو اپنی روح میں سما کر اس کی باطن سے جو اخراج ہوتا ہے۔ وہ رنگین بیانی اور حقیقت بیانی کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

ایسا کہنا کہ قدیم زمانے کے سارے سفر نامے کم معیار کے ہیں، بے جا ہو گا کیونکہ اس ضمن میں یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ "عجائبات فرنگ" ایک معیاری اور اعلیٰ پایے کا سفر نامے ہے کیونکہ سفر نامہ پڑھتے ہوئے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مکمل طور پر خود کو لندن کے حوالے کر دیا ہے۔ ایسے سفر نامے بہر حال اور بھی موجود ہیں جن میں تخلیق کا رنگ اور اس کی دلکشی بدرجہ اتم موجود ہے۔

قدیم سفر نامے کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ وہ حرکت و عمل کے لحاظ سے بالکل گونگے انسانوں جیسے ہیں۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتا ہے اور جن جن مناظر کو بیان کرتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب بے جان اشیاء کا ذکر کر رہا ہو حالانکہ یہی باتیں جب جدید سفر نامہ نگار بیان کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کائنات کی ہر چیز بزبانِ خود بول رہی ہو اور اپنا تعارف آپ کر رہی ہو۔

قدیم سفرناموں میں ایسے سفرنامے بھی بکثرت ملتے ہیں جو بے آب و گیاہ ریگستان کی طرح خشک بھی ہیں اور بے کیف بھی۔ چونکہ ایسے مصنفین لکھنے کے سلیقے سے عاری ہوتے ہیں اس لیے اُن کی تخلیقات میں ایک عام قاری کے لیے لذت کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اُس میں جذبات کی فراوانی نے تخلیق کی روح کو مجروح کیا ہے اگرچہ مقررہ پیمانے سے کم جذبات نگاری بھی تخلیق کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ تخلیق میں اعتدال پسند رویہ رکھنا ہی کسی سفرنامے کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور حد سے زیادہ مبالغہ ایک سفرنامے کو معیار کی بلندی سے گرا سکتا ہے۔ مصنف کا قلم جب اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اپنائے گا تو اس کی تحریر اور تخلیق کو قبول عام حاصل ہوگی۔

قدیم سفرنامہ نگار جب بھی کسی غیر ملک کی سفر سے واپس آتا ہے تو وہ فوراً رہبر و رہنما کا روپ دھار لیتا ہے جس کی وجہ سے وہ سیاح کم اور ایک مصلح و مبلغ زیادہ نظر آتا ہے۔ جدید سیاح نے اس غلطی سے حتی الوسع اپنے دامن کو بچایا ہے اور کہیں پر بھی وہ رہبر یا مبلغ کے روپ میں خود کو پیش نہیں کر رہا ہے اور نہ کہیں پر وہ ناصح کے روپ میں نظر آتا ہے۔

قدیم سیاح خارجی اشیاء سے بس نام کی حد تک واقفیت رکھتا ہے۔ وہ خارجی اشیاء کے مخفی لمس سے بالکل نا آشنا رہتا ہے۔ جدید سیاح خارجی اشیاء کو اپنی باطن میں سمو کر اور خارج و باطن کو آپس میں ہم آہنگ کر کے جو کچھ کہتا ہے۔ اس میں رنگوں کا ایک حسین امتزاج اُبھر آتا ہے۔ گردو پیش کے تمام اشیاء اور تمام رنگ اُس کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں جنھیں کسی بھی صورت میں الگ اور علیحدہ نہیں دیکھا جاسکتا۔

مشفق خواجہ اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں :

> "روایتی سفرنامہ ہمیں مقاماتِ سفر سے متعارف کراتا ہے اور غیر روایتی سفرنامہ کیفیاتِ سفر سے۔ مقاماتِ سفر کی تفصیل لکھنے والا زمان و مکان کا اسیر ہوتا ہے جبکہ کیفیاتِ سفر قلمبند کرنے والا زمان و مکان سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہی چیز اس کے سفر کو معلومات کا گنجینہ بنانے سے بچاتی ہے اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے" ۲۳؎

جدید سفر نامے کے فنی لوازمات

ہر صنف ادب کے لیے ماہرین نے کچھ فنی لوازمات اور اُصولوں کا تذکرہ کیا ہے۔ چونکہ سفر نامہ بھی اب باقاعدگی سے اُردو ادب کا حصہ بن کر قارئین سے داد سمیٹنے لگا ہے اس لیے ماہرین نے کامیاب سفر نامہ لکھنے کے لیے اس ضمن میں چند نکات کی نشان دہی کی ہے جن پر عمل پیرا ہو کر کسی بھی سفر نامہ کو اعلیٰ معیاری ادب کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اُن فنی لوازمات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قوتِ مشاہدہ:

ہر صنف ادب میں کسی نہ کسی حد تک مشاہدہ کا کردار ہوتا ہے مگر سفر نامہ میں مشاہدہ جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک کامیاب سفر نامہ نگار وہی ہوتا ہے جس کا قوت مشاہدہ تیز اور گہرا ہو کیونکہ مشاہدہ کی گہرائی سے سفر نامہ نگار بڑی سے بڑی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر بھی نظر رکھتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدہ کے بل پر نہ صرف گرد و پیش میں موجود اشیاء کا خارجی مطالعہ کرتا ہے بلکہ گہرے قوت مشاہدہ کا مالک شخص اس کے باطن میں بھی جھانکتا ہے اور اپنے مطلب کی چیز اخذ کرتا ہے۔ سطحی قوتِ مشاہدہ رکھنے والا سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے سے کماحقہٗ انصاف نہیں کر سکتا ہے۔ غرض قوتِ مشاہدہ کسی بھی سفر نامہ کے لیے بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

واقعات کا انتخاب:

ناول اور افسانے میں ایک مربوط پلاٹ کا تصور پایا جاتا ہے جبکہ سفر نامہ اس سے بالکل عاری ہوتا ہے۔ سفر نامہ کی کہانی مختلف واقعات کے ربط و بُنت سے آگے بڑھتی ہے۔ سفر نامے میں واقعات کا انتخاب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے سفر نامہ نگار کو واقعات کے انتخاب میں مہارت اور ہنر مندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ صرف ایسے واقعات کو سفر نامے میں جگہ دیتا ہے جس سے فی الواقع سفر نامے کے حسن و تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ غیر ضروری واقعات، بے ترتیب واقعات یا واقعات کی بے جا بھرمار سے سفر نامہ کا حسن متاثر ہوتا ہے اچھا سفر نامہ نگار واقعات کے انتخاب میں انتہائی احتیاط اور باریک بینی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ موقع محل اور اثر و تاثیر کے مطابق واقعات کا انتخاب کرتا ہے جس کا نتیجہ سفر نامے کی کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اعتدال و توازن:

ادب کی ہر صنف چاہے وہ ناول ہو یا افسانہ، ڈرامہ یا انشائیہ سب میں اعتدال و توازن کا ہونا از حد ضروری ہے مگر سفر نامہ میں اعتدال و توازن کا ہونا اس کی بنیادی ضرورت میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اگر سفر نامہ اعتدال و توازن کا لحاظ نہ رکھا جائے تو سفر نامہ اپنی حدود سے متجاوز ہو کر تاریخ و جغرافیہ کی کتاب بن جائے گی اور یوں سفر نامہ کی روح گھائل ہو کر اپنی ادبی حیثیت کھو بیٹھی گے۔لہذا ضروری ہے کہ سفر نامہ لکھتے وقت یہ بات ہمہ وقت ذہن نشین رہے کہ واقعات و مشاہدات کو زیبِ قرطاس کرتے وقت اعتدال و توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے کیونکہ اسی پر ہی سفر نامہ کے حسن و تاثیر اور معیار کا دارومدار ہوتا ہے۔

تحیر و تجسس:

تحیر و تجسس، سسپنس اور دلکشی و دلچسپی ادب کے ہر نثر پارے کے لیے ضروری ہے کیونکہ خشک، پھیکے، بے کیف اور دلچسپی سے خالی تحریریں بہت جلد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہیں۔کامیاب اور اچھے سفر نامہ کے لیے ضروری ہے کہ سفر نامہ نگار ہر لمحہ قاری کی دلچسپی کو مد نظر رکھے۔واقعات کے انتخاب، انکشاف اور پیشکش میں بطور خاص اس بات کا خیال رکھے کہ اس میں قارئین کے جذبہ تجسس کو مہمیز ملے۔سفر نامہ میں ہر پل اور ہر لمحہ بدلتی صورت حال قاری کے تحیر و تجسس کو بڑھاتا جائے۔ آغاز سے لے کر انجام تک سفر نامہ نگار اپنی شگفتہ طرز تحریر اور پل پل بدلتی صورت حال سے قاری کا دل و دماغ اپنی گرفت میں رکھے۔جب تک سفر نامہ نگار اپنی تحریر میں تحیر و تجسس اور دلچسپی کا عنصر بر قرار رکھے گا اس وقت تک قاری اس کی تحریر کے اثر سے مسحور رہے گا۔لہٰذا اچھے اور معیاری سفر نامے کا یہ لازمی عنصر ہے کہ اس میں تحیر و تجسس کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہو۔

شگفتہ اُسلوب :

ہر ادبی تحریر شگفتہ بیانی کا متقاضی ہوتا ہے۔سفر نامہ کے لیے بھی زبان و بیان کی شستگی، شائستگی اور شگفتگی از حد ضروری ہے۔سفر نامہ نگار قاری کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں قاری تخیل کی آنکھ سے سفر نامہ نگار کے ساتھ چلتا پھرتا ہے اور مختلف مناظر و مقامات کی سیر کا لطف اُٹھاتا ہے۔ایسی صوت حال میں لازم ہے کہ سفر نامہ نگار کے لب و لہجے میں شہد جیسی مٹھاس ہو، اُس کی طرز تحریر میں

مقناطیس کی طرح جاذبیت اور کشش ہو اور اُس کی زبان و بیان میں ایسازور ہو جو قاری کے دل و دماغ پر حاوی ہو بصورت دیگر قاری سفر نامہ نگار کے ساتھ چند قدم اُٹھا کر اُکتاہٹ کا شکار ہو جائے گا نتیجتاً سفر نامہ نگار اپنے سفر میں یک و تنہا رہ جائے گا ظاہر ہے ایسی صورت میں اسے ناکام سفر نامہ نگار ہی کہا جائے گا۔ شگفتہ اُسلوب جہاں نثر پارے کے ادبی مقام کا تعین کرتا ہے وہاں وہ سفر نامہ نگار کے قد کاٹھ کا بھی تعین کرتا ہے۔ کامیاب سفر نامہ نگار وہ ہے جو اپنی شگفتہ تحریر اور طلسماتی اندازِ بیاں سے قاری کی اجنبیت ختم کرکے اُسے اپنے ماحول سے مانوس کرنے کے قابل بناتا ہے۔

غیر جانبداری:

سفر نامہ نگار منصف اور غیر جانب دار ہوتا ہے۔ وہ حقائق کو مسخ کرنے کی بجائے اپنی اصل روح میں پیش کرتا ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے جس علاقے سے گزرتا ہے اور جس ماحول میں رہتا بستا ہے اُس کا قلم اُس پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ اُس کی اپنی پسند ناپسند نہیں ہوتی۔ وہ کسی ملک، شہر یا کسی علاقے کے واقعات، رسم و رواج، بود و باش، طرز گفتار و کردار اور اُن کی سیاسی، مجلسی اور معاشرتی زندگی پر بلا تعصب رائے زنی کرتا ہے اور جو سچ ہوتا ہے وہی بیان کرتا ہے غیر ضروری لفاظی اور حقائق کو توڑنے مروڑنے سے اجتناب کرتا ہے گویا سفر نامہ نگار کا مقام ایک جج جیسا ہوتا ہے جو اپنی صائب رائے سے دلائل و براہین کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے۔

منظر نگاری:

منظر نگاری ایک فن ہے۔ اس میں الفاظ کی مدد سے کسی منظر کا ایسا خاکہ کھینچا جاتا ہے جو ہو بہو کیمرے کی تصویر کی مانند ہوتا ہے۔ اگر یہ خوبی کسی سفر نامہ نگار میں نہ ہو تو پھر اسے سفر نامہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اچھا اور ماہر سفر نامہ نگار وہی ہوتا ہے جو خاموش فضا اور کائناتی مناظر کو نطق و گویائی دے کر قاری کے سامنے ایسے انداز سے پیش کرے جنھیں قاری سفر نامہ نگار کی آنکھ سے خود دیکھے اور وہ بنفسہٖ اُن سے باہم ہم کلام ہو۔ یہ صفت نہ صرف سفر نامہ کی جاذبیت میں اضافے کا باعث بنتی ہے بلکہ سفر نامہ نگار کو بھی اچھے ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کر دیتی ہے۔

جدید سفر نامے کی تکنیک

اگر سفر نامے کی تکنیک کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سفر نامے کی کوئی خاص اور متعین تکنیک نہیں اور نہ ہی سفر نامہ نگار کسی خاص اُصول کا پابند ہوتا ہے بلکہ سفر نامہ نامہ نگار کا اپنا مزاج اور تحریری برتاؤ سفر نامے کی تکنیک کے لیے پل کا کام دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خالد اپنی کتاب " اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ " میں لکھتا ہے :

> "سفر نامہ کسی مخصوص تکنیک یا کسی خاص اُصول کا پابند نہیں۔ سفر نامہ نگار کا مزاج اور تحریری برتاؤ ہی سفر نامے کا اُصول، اُسلوب اور تکنیک ہے۔ ایک اچھا تخلیق کار جب سفر نامہ لکھتا ہے تو اُس کے تخلیقی تجربات سفر نامے کے لیے ایسا اُسلوب وضع کر لیتے ہیں جن کی سفر نامے کو ضرورت ہوتی ہے یا وہ سفر نامے کے مطالبات کو اپنے مخصوص طرز نگارش کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ گویا سفر نامہ نگار آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنے تجربات سفر تحریر کرے مگر یہ خیال ضرور رہے کہ سفر نامے کو سفر نامہ ہی رہنے دے، داستان، ناول یا افسانہ بنانے کی کوشش نہ کرے" ۲۴۔

اگر فنی لحاظ سے سفر نامے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سفر نامہ ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں تکنیک کے حوالے سے نِت نئے تجربات کی گنجائش کم ہی نظر آتی ہے۔ قدیم زمانے کے سفر نامے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اُن تمام سفر ناموں میں بیانیہ تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ آج کے سفر نامہ نگار نے بھی اُس تکنیک سے سر مُو انحراف نہیں کیا ہے۔ اگر چہ اس میں نئے نئے تجربات ہوئے ہیں تاہم آج کا سفر نامہ بیانیہ تکنیک میں لکھا جا رہا ہے۔ سفر نامہ میں چونکہ سفر نامہ نگار اپنے تاثرات و مشاہدات زیب قرطاس کرتا ہے اس لیے سفر نامہ کسی حد تک آپ بیتی سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار سفر نامے کا مرکزی کردار ہوتا ہے جو واحد متکلم ہوتا ہے اور خود اپنی زبان سے اپنے سفر کا احوال بیان کرتا ہے۔

سفر نامہ نگار اپنے سفر کی روداد کو محفوظ بنانے کے لیے مختلف طریقے اور تدابیر اپناتا ہے کبھی ایسا کرتا ہے کہ تمام واقعات کو ذہن نشین کرلیتا ہے اور جب سفر نامہ لکھنے بیٹھ جاتا ہے تو ایک ایک بات یاد کرکے ذہن کی پلیٹ سے کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیتا ہے۔

سفر نامہ لکھنے کا دوسرا بڑا طریقہ خطوط کی تکنیک ہے۔اس طریقے میں سفر نامہ نگار اپنے کسی دوست کو بالواسطہ ہم سفر بنالیتا ہے۔وہ جہاں جہاں کی سیر کرتا ہے اور جن جن مقامات سے لطف اندوز ہوتا ہے سب کی تفصیل واحوال خط کی صورت میں اپنے دوست کے نام لکھ لیتا ہے جب وہ سفر سے واپس آتا ہے تو پھر ان خطوط کی مدد سے اپنی یادداشت تازہ کرکے انھیں سفر نامے کی شکل میں ڈھال لیتا ہے۔

سفر نامہ لکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سفر نامہ نگار سفر کی روداد ایک ڈائری یا روزنامچے کی شکل میں محفوظ کرلیتا ہے اور پھر سفر سے واپسی پر انھیں سفر نامہ کی شکل میں ترتیب دے دیتا ہے۔سفر نامہ لکھنے کا یہ طریقہ کافی حد تک اچھا ہے کیونکہ اس طریقے میں مختلف النوع واقعات نہ صرف ایک تسلسل اور ترتیب کے ساتھ لکھ لیے جاتے ہیں بلکہ تمام واقعات و مشاہدات اپنی تمام تر سچائی اور اصلیت کے ساتھ قلم بند ہوجاتے ہیں جس میں ایک قاری کے لیے بہت زیادہ دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔ڈاکٹر خالد محمود سفر نامہ کی تکنیک کے بارے میں کہتے ہیں :

> ”ایک سیاح جب یہ سوچ کر سفر کرتا ہے کہ سفر کے ساتھ ساتھ اسے ایک سفر نامہ بھی لکھنا ہے تو وہ اپنی پسند اور سہولت کے مطابق تکنیک وضع کرلیتا ہے۔اس کی قوت باصرہ جس قدر تیز ہوتی ہے اسی قدر تیزی کے ساتھ وہ اپنے گردوپیش کا جائزہ لے کر کام کی چیزوں پر زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے۔ مناظر و واقعات کا یہی انتخاب اسکی بصیرت کا امتحان ہوتا ہے۔ کس چیز کو نظر انداز کرنا ہے اور کس چیز پر زیادہ توجہ صرف کرنی ہے۔ کیا بات اہم ہے اور کون سی غیر اہم ہے۔ یہ فیصلہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق کرتا ہے اور اسی فیصلے پر سفر نامے کے عمومی تاثر کا انحصار ہوتا ہے۔۲۵؎

ایک اچھا سفر نامہ لکھنے کے لیے شرطِ اولین یہ ہے کہ اس میں ادبی حسن موجود ہو کیونکہ اس کے بغیر سفر نامے کی حیثیت ایک سفری بیان سے زیادہ نہ ہو گی۔ سفر نامے میں ادبی چاشنی کی موجودگی قاری کے دل و دماغ کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے اوراسے اس دنیا کی سیر پر مجبور کرلیتی ہے جسے سفر نامہ نگار

دکھانا چاہتا ہے۔ادب اور تخلیقیت سے محروم سفر نامہ قاری کی توجہ حاصل کرنے میں ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔

دورِ جدید کے سفر نامے

اُردو سفر نامہ مختلف ادوار سے گزر کر اور مختلف منزلیں طے کر کے جدید دور میں داخل ہوا ہے۔ گذشتہ دور کے سفر ناموں کے مقابلے میں جدید دور کا سفر نامہ کئی صورتوں میں اپنے ماقبل سفر ناموں سے مختلف اور منفرد انداز میں اُفقِ ادب پر تابندہ و درخشاں نظر آتا ہے۔ گذشتہ دور کا سفر نامہ کہیں تو تاریخ و جغرافیہ کی جکڑبندیوں کا شکار نظر آتا ہے تو کہیں سفر نامہ نگار کی ذاتی زندگی کے گرد گھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ کہیں یہ دستاویزی کتاب کی صورت نظر آتا ہے تو کہیں محض سفر کی صعوبتوں اور راستے کی کھٹنائیوں کی دلدوز داستان دکھائی دیتا ہے مگر جدید سفر نامہ اس کے بالکل برعکس جاذبیت اور دلچسپی کو اپنے اندر سموئے ایک نئے رنگ میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جدید سفر نامے میں جدت و تنوّع بھی ہے اور یہ سفر نامہ نگار کے جذبات و احساسات کا ترجمان بھی ہے۔ عصرِ حاضر کے سفر نامے میں سفر نامہ نگار مشاہدات، تجربات اور واقعات کو کچھ ایسی خوبی اور ہنر مندی سے بیان کرتا ہے کہ قاری کی ذات محض سننے اور پڑھنے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی سفر نامہ نگار کے ساتھ ہم رکاب ہو کر ہر واقعہ اور منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہر آواز اپنی آنکھوں سے سنتا ہے اور ہر کیفیت اور احساس اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔

اگرچہ فنی لحاظ سے سفر نامے کی ہیئت میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔ آج بھی زمانۂ گذشتہ کی طرح سفر نامہ لکھنے کے لیے یاداشتوں، روزناچوں اور خطوط کا سہارا لیا جاتا ہے البتہ جدید سفر ناموں میں تخلیقی رنگ اور اختراعی قوت ہر جگہ اپنا رنگ جمائے نظر آتی ہے۔قدیم سفر ناموں میں تاریخ و جغرافیہ، تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور دیارِ غیر کے اشجار و انہار کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ قاری گھر بیٹھے ان معلومات سے مستفید ہوتا تھا مگر آج حالات یکسر تبدیل ہو گئے ہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے ایک نہیں بیسیوں ذرائع ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کا سفر نامہ خارج سے زیادہ باطن کی تشریح کرتا نظر آتا ہے اور ذاتی تاثرات اور جذبات و احساسات کو بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے۔

جدید دور کے سیاح کی ایک خصوصیت اس کی ادبی قدو قامت میں بدرجہا اضافہ کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس نے بے جان اشیاء کو گویائی عطا کی ہے۔ پہاڑ، ندی نالے، درخت، کھائیاں، سڑکیں، ستارے، آسمان، پھول، کانٹے، گلیاں، چوبارے، آبادیاں، ویرانیاں حتیٰ کہ تنہائیاں بھی بولتی ہوئی نظر آتی ہیں

جس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ سفر نامہ محض مشاہدات و واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک سیاح کی فکری اور روحانی واردات کا ایک حسین امتزاج بن گیا ہے۔

جدید دور کے پیش رو سفر نامہ نگاروں میں جس شخص کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے وہ خواجہ احمد عباس ہیں۔ خواجہ احمد عباس ادیب اور صحافی ہونے کے علاوہ نظریاتی طور پر اشتراکی تھے جس کا پرچار انھوں نے اپنے سفر میں قدم قدم پر کیا ہے۔ خواجہ احمد عباس ۱۹۳۸ء میں نیویارک میں ورلڈ یوتھ کانفرنس میں شرکت کرنے گئے تھے۔ وہاں سے واپس ہونے کے بعد اُنھوں نے "مسافر کی ڈائری" کے نام سے اپنا سفر نامہ تحریر کیا تھا۔ اس سفر نامے میں تقریباً سترہ ممالک کی سیاحت کا احوال موجود ہے۔ نیویارک، لاس اینجلس، کولمبو، ہانگ کانگ، ٹوکیو، انگلستان، ترکی، فرانس، کینیڈا، عراق اور ایران وغیرہ میں خود گھومے پھرے، ہر ایک چیز کو ایک ادیب کی نظر سے دیکھا اور پھر اسے " مسافر کی ڈائری" میں لکھ دیا مگر اس کا اشتراکی نظریہ ہر چیز پر غالب رہا اور تو اور لندن کے بارے میں اس کی نقطہ نظر تو ملاحظہ کریں جس کی تعریف و توصیف میں سیاحوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

> "مجھے لندن آئے پورا ایک مہینہ گذر گیا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے نہ یہ شہر پسند آیا اور نہ میں نے اس کو اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔۔۔ ممکن ہے لندن کی زندگی میں بہت سی دلچسپ خصوصیات ہیں مگر میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں جبکہ زیادہ تر وقت میں نے اپنے کمرے میں گزارا"۔ ۲۶؎

"ساحل اور سمندر" سید احتشام حسین کا سفر نامہ ہے جس میں انھوں نے امریکہ، پیرس اور لندن کی سیاحت کی روداد بیان کی ہے۔ احتشام حسین کا یہ سفر نامہ دس مہینوں پر محیط ہے۔ وہ جس جگہ کی سیر کرتے تو ساتھ ساتھ ڈائری میں وہ تمام نکات بھی درج کرتے تھے۔ اُنھوں نے بڑی باریکی سے ہر چیز کا جائزہ لیا ہے اور اس سے متعلق مثبت یا منفی رد عمل کا اظہار بھی کیا ہے۔ احتشام حسین چونکہ ذہنی لحاظ سے کمزور، ڈرے ہوئے اور احساس کمتری میں مبتلا انسان تھے اس لیے وہ یورپ اور امریکہ سے حد سے زیادہ مرعوب نظر آتے ہیں نتیجتاً خود اعتمادی کے فقدان نے اُنھیں سفر سے زیادہ لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا نام بحیثیت نقاد محتاج تعارف نہیں۔ اُنھوں نے اپنی اس خصوصیت کا فائدہ سیاحت میں بھی اُٹھایا ہے۔ اُنھوں نے درس و تدریس کے سلسلے میں ۱۹۶۲ء میں لندن کا سفر کیا تھا۔ تقریباً

پانچ سال وہاں پر رہائش پذیر رہے۔ لندن کو بہت قریب سے دیکھا، ہر زاویے سے پرکھا اور تنقیدی نظروں سے ایک ایک شئے کا جائزہ لیا اور پھر اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات کا " ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک " کی صورت میں اظہار خیال کیا۔ اُنھوں نے جہاں لندن کی خوبیوں اور کمالات کا ذکر کیا وہاں اُن کا قلم مغرب کی بے راہ روی اور بد اخلاقی کو بیان کرنے میں کبھی پس و پیش کا شکار نہیں ہوا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے " ترکی میں دو سال " کے نام سے ایک دوسرا سفر نامہ بھی لکھا ہے۔ اس کا پس منظر بھی درس و تدریس ہے۔ ترکی میں دو سال قیام کیا۔ ترک تہذیب و معاشرت کا قریب سے مشاہدہ کیا اور اُنھیں بڑی محبت سے اپنے سفر نامے میں بیان کیا ہے۔ ترکی کے بہت سے شہر اُن کو بہت بھائے ہیں اس لیے اُن کی تعریف میں کبھی کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ انقرہ کے بارے میں کہتے ہیں۔

> " انقرہ پھولوں کا شہر ہے، موسم بہار میں یہاں پھول کھلتے بھی ہیں اور دکانوں پر بھی بِکتے ہیں۔ جس زمانے میں انقرہ کا موسم خراب ہوتا ہے اور باغوں میں پھول نہیں ہوتے تو پھول باہر سے منگوائے جاتے ہیں"۔ ۲۷۔

مرزا ادیب کا مقبول عام سفر نامہ " ہمالہ کے اُس پار " ہے جو اُنھوں نے اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے ۱۹۸۲ء میں چین کا سفر کیا تھا، یہ سفر نامہ اسی سفر کا احوال ہے۔ مرزا ادیب نے کل پندرہ دن چین میں قیام کیا تھا اگرچہ یہ مختصر سفر چین کی سیاحت کے لیے ناکافی تھا تاہم مرزا ادیب نے بساط بھر ہر چیز پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے چونکہ مرزا ادیب ایک تجربہ کار ادیب اور منجھے ہوئے لکھاری ہیں اس لیے اُنھوں نے اس سفر نامے سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ سفر نامے کا آغاز ڈائری کی بیانیہ تکنیک میں کیا ہے لیکن اختتامیہ میں خطوط کا خطابانہ انداز موجود ہے۔ اُنھوں نے واقعات کے بیان میں قاری کو اپنا ہم نوا بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ جذباتی مناظر کا بیان قاری کی توجہ اپنی طرف راغب کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی مرزا ادیب سفر نامے کو پر کشش، جاذب نظر اور مسحور کن بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

" نظر نامے " کے خالق محمود نظامی وہ پہلے سفر نامہ نگار ہیں جنھوں نے سفر نامے کا رخ خارج کی بجائے داخل کی جانب موڑ لیا ہے۔ " نظر نامہ " ظاہر کی کہانی بیان نہیں کرتا بلکہ یہ باطن میں اُتر کر سچائیاں تلاش کرتا ہے اور چشمِ تصور سے نئی نئی دنیائیں دریافت کرکے قاری کو اُن کی سیر کراتا ہے۔ " نظر نامہ " محض کسی جگہ کے جغرافیہ تک محدود نہیں بلکہ اس میں تاریخ اپنے پورے شعور کے

ساتھ جلوہ گر ہے۔ محمود نظامی ۲۲/اکتوبر ۱۹۵۲ء سے ۲۴/اپریل ۱۹۵۳ء تک مصر، لندن، پیرس، روم اور میکسیکو کی سیاحت کرتے رہے اور جن جن مقامات اور مناظر نے اُن کے دل کے تاروں کو چھیڑا۔ اُن سب کا اُس نے بڑی طاقت و توانائی سے اظہار کیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُس نے اپنے احساسات کو سفر نامے کی شکل میں ڈھالا ہے تو بے جانہ ہو گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ " نظر نامہ " پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ محمود نظامی نے حال کی بجائے ماضی کی کہانی لکھی ہے اور جب بھی اُس کی نگاہوں کو کوئی منظر بھایا ہے تو وہ فوراً حال سے ماضی کی جانب روانہ ہو گیا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کار کی روشنی کے سامنے بارش کا پانی جھالر بن کر آسمان سے زمین پر معلق نظر آرہا تھا، میں سوچنے لگا، گلابی جھاڑے کے اس سمے میں لاہور کتنا حسین ہوتا ہے، شام کے وقت اس کے بازار اور گلیاں، باغات اور پارک کس قدر زندہ اور جاندار ہوتے ہیں ، وطن کا خیال آتے ہی میرے کانوں میں موچی دروازے کے پُل پر پنجابی بیت بازی، دودھ کی دوکانوں پر بے فکروں کی خوش گپیاں، گنڈیری اور ریوڑی فروشوں کی خوش آئند صدائیں، تانگے والوں کے مخصوص نعرے گونجنے لگے اور دل اُس پر ہول فکر میں ڈوب گیا کہ آئندہ پانچ سال کا طویل عرصہ اسی لاکھ انسانوں کے اس بھیانک ویرانے میں کس طرح بسر کروں گا"؟۲۸۔

"نظر نامہ" ایک بیانیہ سفر نامہ ہے جس میں حال اور ماضی کا کچھ ایسا امتزاج پیش کیا گیا ہے اور اس پر مستزاد اس کے اسلوب نگارش نے کچھ ایسا جادو جگایا ہے کہ "نظر نامہ" سفر نامہ سے زیادہ افسانہ بن کر رہ گیا ہے جس نے اگرچہ سفر نامے کی روح کو کچھ حد تک مجروح تو کیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس نے قاری کے قلب و ذہن پر اَنمٹ نقوش بھی چھوڑے ہیں۔

بیگم اختر ریاض الدین اُردو سفر نامے میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اُس کے دو سفر نامے "دھنک پر قدم" اور " سات سمندر پار" اُردو ادب میں جگمگاتے ہیروں کی مانند ہیں۔

سات سمندر پار ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا جس میں یوں تو چھے شہروں کی سیاحت کا احوال ہے مگر بیگم اختر ریاض الدین نے اپنی دلچسپی کے مد نظر تین شہروں " ٹوکیو، ماسکو اور لینن گراڈ کے حالات و

واقعات بطور خاص بیان کیے ہیں۔اس طرح آپ کا دوسرا سفر نامہ " دھنک پر قدم" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ لندن، میکسیکو، ہوائی اور ہانگ کانگ کی سیاحت کے بارے میں ہے۔

اختر ریاض الدین کے شوہر ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے بیر ونِ ملک دورے کرتے تھے۔ اختر ریاض الدین بھی اُن کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ جاپان، میکسیکو، ماسکو، نیویارک، ہوائی اور لندن کے اسفار میں اختر ریاض الدین شوہر کے شانہ بہ شانہ موجود رہی ہیں۔

اختر ریاض الدین چونکہ انگریزی صحافت سے بھی وابستہ رہی تھیں اس لیے اس تجربے نے اُس کی تحریر میں نہ صرف نکھار پیدا کیا بلکہ سفر نامے پر اُس کی گرفت کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ اُنھوں نے حال اور ماضی کو ایسے انداز میں یکجا کیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد نہیں بلکہ باہم دوست معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخ پر گرفت مضبوط ہونے کی وجہ سے حال اور ماضی کا رشتہ اتنا قریب تر ہو گیا ہے کہ دونوں میں چنداں فرق معلوم نہیں ہوتا۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے نظریات کو اپنے فن پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے اور ایک غیر جانبدار سیاح کی طرح ہر چیز بلا کم و کاست بیان کی ہے۔ یہ اُن کے قلم کی خوبی ہے کہ بے جان اور غیر متحرک چیزیں بھی جاندار اور حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کی نثر سلیس بھی ہے اور اس میں پرکاری بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انوکھے اور نادر و نایاب تشبیہات نے اُن کی تحریر کو فی الواقع زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

دھنک پر قدم سے ایک اقتباس ملاحظہ ہے :

> "میرے لیے اس جزیرے (ہوائی) کی سب سے بڑی خوبی اس کی آزادی تھی۔ ایک روحانی اور ذہنی آزادی۔ اس گمنامی کی آزادی جسے پانے والا ہی جانتا ہے یہاں کوئی نہ بیگم جانے اور نہ مادام، کسی کو آپ کے نام اور کام سے واسطہ نہیں۔ سب اپنی تفریح، اپنی اپنی تفتیش میں مست، یہاں عمر کا تفرقہ مٹ جاتا ہے۔ ذات پات کا امتیاز مٹ ہو جاتا ہے۔ یہاں بڈھے بھی جوان ہیں اور سیاحوں میں زیادہ تعداد اُن کی ہوتی ہے جو ستر پار کر چکے ہیں۔۲۹؎

جمیل الدین عالی نے " تماشا میرے آگے " اور " دنیا میرے آگے " کی شکل میں اردو سفر نامے میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ " دنیا میرے آگے " جمیل الدین عالی کا پہلا سفر نامہ ہے جس میں اُنھوں نے فرانس، برطانیہ، مصر، روس، ایران، لبنان اور دہلی کے سفر کی روداد قلم بند کی ہے جبکہ "

تماشا میرے آگے" میں ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، جرمنی اور امریکہ کے سفر کا احوال بیان کیا ہے۔ان سفرناموں کو پڑھ کر قاری گویا آدھی دنیا کی سیر کرلیتا ہے۔ یہ سفرنامے نہ صرف معلومات کا گنجینہ ہیں بلکہ اس میں عام قاری کے لیے بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ جمیل الدین عالی ایک زندہ دل انسان تھے اور یہی زندہ دلی اس کے سفرناموں کا وصفِ خاص ہے۔

سفرنامے کے میدان میں ابن انشاء کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اُنھوں نے " چلتے ہو تو چین کو چلیئے " "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" " دنیا گول ہے" اور نگری نگری پھرا مسافر" جیسے زندۂ جاوید سفرنامے چھوڑے ہیں جو نہ صرف معلومات کے لحاظ سے اپنی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ شگفتگی و تازگی کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر آپ کو جدید سفرنامہ نگاری کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کیونکہ آپ نے سفرناموں کا ایک ایسا شگفتہ اور اچھوتا انداز اور اُسلوب متعارف کرایا ہے جس کی مثال آپ سے پہلے ملنی مشکل ہے۔ آپ کی سیاحت کی خوبی یہ ہے کہ آپ اپنے ساتھ قاری کو خود گھماتے ہیں۔ اُن کو شہر شہر، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں کی سیر کراتے ہیں اور اُنھیں اپنی جادوبیانی سے مسحور کرلیتے ہیں کہ قاری کو کہیں دوسری جگہ دیکھنے کی فرصت تک نہیں ملتی۔ طنز و مزاح کا عنصر جتنا آپ کے ہاں گہرا ہے اُتنا اردو ادب میں کسی اور کے پاس موجود نہیں۔ درج ذیل عبارت سے طنز کی شدت خوب واضح ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

> "چین میں چار ہفتے کے قیام کے بعد ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہاں آزادی کی سخت کمی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی جو اپنے ساتھ پان لے کر گئے تھے، بار بار فرماتے تھے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں سڑکوں پر تھوک بھی نہیں سکتے۔ زیادہ دن یہاں رہنا پڑے تو زندگی حرام ہو جائے۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ یہاں کوئی دیوار ایسی نظر نہیں آئی جس پر لکھا ہو کہ " یہاں پیشاب کرنا منع ہے"۔۔۔۔ ہوٹل کے بیروں کو بخششیں لینے اور مسافروں کو بخشش دینے کی آزادی نہیں۔ بسوں اور کاروں کے اختیارات محدود ہیں۔ آپ اپنی بس کو فٹ پاتھ پر نہیں چڑھا سکتے، نہ کسی مسافر کے اوپر سے گزار سکتے ہیں اور تو اور بجلی کے کھمبے سے ٹکرانے تک کی بھی آزادی نہیں اور بھی کئی آزادیاں جو آزاد دنیا کا خاصہ ہیں وہاں مفقود نظر آئیں، گداگری ممنوع، نائٹ کلب

ممنوع، جوئے پر قدغن، کام نہ کرنا اور مفت کی روٹیاں توڑنا خارج از امکان، لڑائی ، دھینگا مشتی، چاقو زنی، اغوا وغیرہ کی وارداتیں نہ ہونے کے باعث اخبارات سخت پھیکے سیٹھے ،ملک کیا ہے اچھا خاصا جماعت خانہ ہے" ۳۰؎

اُردو ادب کے جدید سفر نامہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر کا نام بھی شامل ہے۔ اُن کے سفر نامے " جہانِ دیگر" اور " دکھلائیے لے جاکے اسے مصر کا بازار" حقیقت اور تخیّل کا بہترین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ " جہانِ دیگر" میں امریکہ کے کھوکھلے معاشرے کی بے دردی سے قلعی کھولی ہے اور " دکھلائیے لے جاکے اسے مصر کا بازار" میں مصر کا قدیم وجدید رنگ پیش کیا ہے۔ تجسس اور تحیر سفر نامے کی جان ہے اور جزئیات نگاری اس کی بنیادی خاصیت ہے۔

"عرشِ منّور" " سفر در سفر" اور " چنگوہ پاچستان" اشفاق احمد کے سفر نامے ہیں ۔ان سفر ناموں میں افسانوی رنگ نمایاں ہے کیونکہ اشفاق احمد بنیادی طور پر افسانہ نگار گزرے ہیں۔ سفر نامے میں کرداروں کی شمولیت اس بات کی غماز ہے کہ آپ سفر نامہ لکھتے ہوئے غیر شعوری طور پر افسانہ لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ سفر ناموں میں ماضی اور حال کے درمیان ایک واضح رشتہ وربط و تعلق نظر آتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اُردو سفر نامے کو جمالیاتی حسن اور نکھار کی چاشنی دے کر ایک الگ اور نیا انداز سفر نامے میں متعارف کرایا ہے۔ آپ نے بہت سے سفر نامے لکھے ہیں۔ " شوقِ آوارگی" میں یورپ، ترکی اور امریکہ کی سیاحت کی روداد ہے۔ "گوروں کے دیس میں" برطانیہ، کوپن ہیگ اور اوسلو کا ذکر ہے۔ " دنیا خوبصورت ہے" آسٹریلیا اور سنگاپور کا سفر نامہ ہے۔ " دلی دور است" میں بھارت جانے کا احوال ہے۔ان سفر ناموں میں آپ ایک ایسے سیاح کے روپ میں نظر آتے ہیں جو عزم وہمت کے نئے جہاں دریافت کرنے پر مائل ہیں۔ان سفر ناموں کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اِن میں رومانی قصے اور عشقیہ انداز اپنا گیا ہے جو اُردو سفر ناموں میں ایک نئی چیز ہے۔

اُردو سفر نامہ مستنصر حسین تارڑ تک آکر ایک نئی منزل اور نئے رنگ سے آشنا ہو جاتا ہے۔ یہاں سفر نامہ نہ صرف مقصدیت سے آزاد ہو جاتا ہے بلکہ سفر خود مقصود بالذات بن جاتا ہے۔ سفر نامہ تصور و تخیل کے امتزاج سے خارج سے داخل کی جانب سفر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ افسانہ نگار بھی ہیں، اداکار بھی ہیں، ناول نگار بھی ہیں اور صحافی اور

سفر نامہ نگار بھی ہیں حقیقت یہ ہے کہ آپ کے سفر نامے میں ہر رنگ نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں میں قارئین کے لیے رنگینی کا سامان موجود ہوتا ہے۔

اُردو ادب میں جتنے سفر نامے مستنصر حسین تارڑ نے لکھے ہیں شاید ہی کسی اور نے لکھے ہوں۔ اب تک بیس کے قریب سفر نامے زیب قرطاس ہو چکے ہیں۔ ان میں زیادہ مقبول سفر نامے "نکلے تیری تلاش میں" (سفر نامہ ایران، ترکی، یورپ) اُندلس میں اجنبی (سفر نامہ اُندلس) کے ٹو کہانی (سفر نامہ شمالی علاقہ جات) خانہ بدوش (افغانستان، ترکی، بلغاریہ، ایران) دیوسائی (شمالی علاقہ جات) نانگا پربت (سفر نامہ گلگت و بلتستان) کالاش (سفر نامہ ہندوستان) سفر شمال کے (سفر نامہ سوات و خنجراب) تتلی پیکنگ کی (سفر نامہ چین) ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی شخص ناول یا افسانہ پڑھ رہا ہو کیونکہ اس سفر ناموں میں آغاز، عروج اور پھر اختتام بالکل واضح نظر آتا ہے جو عموماً ناولوں یا افسانوں میں برتا جاتا ہے۔ سفر ناموں میں مختلف کرداروں سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔ مختلف دوشیزاؤں سے ملاقاتیں بھی کرائی جاتی ہیں جو اجنبی سیاحوں کی منتظر ہوتی ہیں۔ ایسے ہی رنگوں اور کرداروں کے امتزاج سے مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر ناموں کو جاندار اور رنگین بناتے ہیں جنھیں اُن کے قارئین چٹخارے چٹخارے لے لے کے پڑھتے ہیں۔

> "میرے ساتھ بیٹھی ہوئی پست قد اور قابل رشک صحت کی مالک لڑکی نیلے رنگ کی چست پتلون اور کالے سویٹر میں ملبوس تھی۔ سویٹر لمبائی میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے پتلون تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ وہ بازو اور سویٹر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر سویٹر اور پتلون کے درمیان کے فاصلے کو پُر کرنے کی کوشش کرتی مگر ہاتھ ہٹاتے ہی جسم کے بالائی حصے کے کھنچاؤ کی وجہ سے سویٹر سکڑ کر پھر اپنی پرانی حالت پر آجاتا اور پتلون کی بیلٹ کے عین اوپر اس کا سفید پیٹ نظر آنے لگتا۔ دوسری لڑکی نے جس کا چہرہ لمبوترا تھا اپنے کندھوں پر ایک کھیس نما شال اوڑھ رکھی تھی۔" ۳۱؎

مستنصر حسین تارڑ کو قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کا سلیقہ آتا ہے اس لیے وہ سفر نامے میں ایسے واقعات اور کردار سامنے لاتے ہیں جن کے بارے میں قاری جاننے کا مشتاق نظر آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ قاری کے اس اشتیاق کو اور بھی ہوا دیتے ہیں جن کی وجہ سے قاری جب تک پورا سفر نامہ پڑھ

نہیں لیتا تب تک اسے چین نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے منفرد اور شگفتہ انداز بیاں کی وجہ سے نہ صرف قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا ہے بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اُن کے قارئین کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔

جدید سفر نامہ نگاروں میں عمران اقبال (پردیس میں کبھی کبھی) سید ناصر الدین (سفر نامہ چین، بھارت، نیپال) بلقیس ریاض (سفر نامہ انوکھا سفر) سلمٰی اعوان (سندر چترال) ہاتف سعید (سفر نامہ بیروت رنگ) محمد داؤد طاہر (منزل نہ کر قبول) قمر علی عباس (اور دیوار گر گئی) قدرت اللہ شہاب (اے بنی اسرائیل اور تو ابھی راہ گزر میں ہے) مولانا کوثر نیازی (ایک ہفتہ چین میں) ڈاکٹر وزیر آغا (بیس دن انگلستان میں) ڈاکٹر اعجاز راہی (راستے میں شام) محمد طفیل (مسافتیں کیسی کیسی) اور محمد حمزہ فاروقی (آج بھی اس دیس میں) ایسے نام ہیں جنھوں نے اُردو سفر نامے کا دامن نگینوں سے بھر دیا ہے اور اُردو سفر نامہ الگ مقام اور شناخت بنانے کے قابل ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات — ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتّب) — ص:۱۰۰

۲۔ اُردو ادب میں سفر نامہ — ڈاکٹر انور سدید — ص:۴۷

۳۔ اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر خالد محمود — ص:۲۲

۴۔ عجائبات فرنگ (مقدمہ) — مرتب تحسین فاروقی — ص: ۲۸، ۲۷

۵۔ سفر زمینِ حافظ وخیام (پیش لفظ) — مقبول بیگ بدخشانی — ص:۸

۶۔ " سخن چند" دیکھ لیا ایران — افضل علوی — ص:۹

۷۔ سیر ایران — مولانا محمد حسین آزاد — ص:۷

۸۔ Dictionary of World Literature — P.592

۹۔ اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ" از ڈاکٹر خالد محمود — ص:۶۵

۱۰۔ "تمدن ہند" ڈاکٹر گستاولی باون — مترجم: مولوی سید بلگرامی — ص:۱۷۲

۱۱۔ " ہندوستان عربوں کی نظر میں" — معین الدین ندوی — ص:۵۶

۱۲۔ "اوراق" (رسالہ) — شمارہ جنوری، فروری ۱۹۷۸ء — ص:۲۷

۱۳۔ اردو سفر نامے بیسویں صدی میں — ڈاکٹر قدسیہ قریشی — ص:۴۸

۱۴۔ اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر خالد محمود — ص:۹۳

۱۵۔ مقدمہ " عجائبات فرنگ" — مرتب تحسین فاروقی — ص:۴۷

۱۶۔ "مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں تکنیک کے تجربات"
(پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ مقالہ) اپریل ۱۹۰۴ء، سلمٰی اسلم چترالی — ص۔۱۲

۱۷۔ ایضاً — ص۔۱۲

۱۸۔ "مسافران لندن'' — سر سید احمد خان — ص۔۸

۱۹۔ ایضاً — ص۔۲۰

۲۰۔ "حیاتِ جاوید'' — مولانا الطاف حسین حالی — ص:۲۰۱

۲۱۔ "سفر نامہ روم و مصر و شام" — مولانا شبلی نعمانی — ص:۷

۲۲۔ اوراق (رسالہ) شمارہ جنوری فروری ۱۹۷۸ء ص:۲۴

۲۳۔ دیباچہ " موسموں کا عکس" مشفق خواجہ ص:۱۰

۲۴۔ اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر خالد محمود ص : ۲۳۔۲۴

۲۵۔ ایضاً ص:۲۴

۲۶۔ "مسافر کی ڈائری" خواجہ امجد عباس ص:۵۹

۲۷۔ "ترکی میں دو سال" ڈاکٹر عبادت بریلوی ص:۶۷

۲۸۔ "نظر نامہ" محمود نظامی ص:۱۴۷

۲۹۔ "دھنک پر قدم" بیگم اختر ریاض الدین ص:۴۱

۳۰۔ "چلتے ہو تو چین کو چلیئے" ابنِ انشاء ص:۶۳۔۶۴

۳۱۔ "اندلس میں اجنبی" مستنصر حسین تارڑ ص:۱۹

باب سوم

پاکستان کے شمالی علاقہ جات

فصلِ اوّل

شمالی علاقہ جات کی تاریخی وجغرافیائی اہمیت

شمالی علاقہ جات پاکستان کے شمال میں واقع علاقوں کو کہتے ہیں۔ ۷۲۹۷۱ مربع کلومیٹر کے وسیع وعریض رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ابتدا میں یہ علاقہ کئی ریاستوں پر مشتمل تھا اور یہاں پر قبائلی نظام رائج تھا۔ ہر خطہ اپنی سیاسی اور سماجی روایات کے تحت اپنے طور پر آزاد اور خود مختیار زندگی گزار رہا تھا۔ تاریخی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اس خطے کو دردستان بھی کہا جاتا رہا ہے۔ اس علاقے کے رہنے والے بنیادی طور پر آزاد پسند طبیعت کے مالک رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی کی حکمرانی بھی قبول نہیں کی ہے۔ جب انگریزوں نے برصغیر پاک وہند پر قبضہ جمالیا تو اس وقت بھی یہ قبائل آزاد حیثیت سے زندگی گزارتے رہے۔ جب پاکستان قائم ہوا تو اس وقت یہ خطہ اگرچہ ڈوگرہ حکمرانوں کی عملداری میں تھا مگر اس کے باوجود بھی اندرونی معاملات اور آپس کی تنازعات خود حل کرنے میں آزاد تھے۔ جب پاکستان اور ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو یہاں کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے عوام کی مرضی جانے بغیر بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق کر دیا اس وقت یہ علاقہ کشمیر کے زیر نگیں تھا۔ اس علاقے کے غیور اور بہادر عوام نے اپنی جانوں پر کھیل ایک آزاد ریاست کی بنیاد رکھی جس کا نام اُنہوں نے " اسلامیہ جمہوریہ پاکستان رکھا" ۔۱۹۴۸ء میں حکومت پاکستان اور یہاں کے عوام کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے بعد یہاں کے عوام نے اپنی مرضی سے پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ اس کے بعد اس علاقے کو" شمالی علاقہ جات "کا نام دیا گیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی علاقہ جات پر مختلف سلطنتوں کی حکمرانی رہی ہے جس پر اجمل سعید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> "اگر شمالی علاقہ جات کی قدیم تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ خطہ مختلف ادوار میں مختلف سلطنتوں کے تصرف میں رہا ہے۔ کبھی یہاں کی زمامِ کار چین کے ہاتھ رہی تو کبھی ترکستان کے پاس۔ کبھی اہل ایران یہاں کے مالک بنے رہے تو کبھی تبت وکشمیر کے حکمران۔ اگرچہ یہاں مقامی طور پر مضبوط و مستحکم حکومتوں کا اکثر فقدان رہا ہے تاہم یہاں تاریخ کے چند ادوار ایسے ضرور گزرے ہیں جب مقامی حکمرانوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر طاقتور حکومتوں

کی بناڈالی ان میں آذر جمشید، ملکہ نور بخت، ملکہ جوار خاتون، علی شیر آنچن اور راجہ
گوہر امان کے نام قابل ذکر ہیں۔ پہلے تین حکمرانوں کا تعلق گلگت کے مشہور ترہ
خان قبیلے سے تھا جبکہ علی شیر آنچن سکردو کے مقپون خاندان کا چشم و چراغ تھا۔
راجہ گوہر امان کا تعلق خاندانِ خوش وقتیہ سے تھا"۔ ا۔

تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہاں شین قبیلے کی حکمرانی تھی جس کا آخری حکمران گلگت کے راجہ اگر تھم کا بیٹا شری بدت تھا۔ شری بدت کو چونکہ کم عمری میں اقتدار ملا تھا جس کا بد خواہوں نے فائدہ اُٹھایا اس طرح شری بدت ایک ظالم حکمران کے روپ میں ظاہر ہوا۔ وہ اپنی بیٹی نور بخت کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ نور بخت کا خاوند آذر جمشید تخت نشین ہوا۔ جس کا خاندان تاریخ میں " ترہ خان " کے نام سے مشہور ہوا۔ آذر جمشید ایک نیک، ایمان دار، منصف مزاج اور رعایا پرور حکمران تھا اس لیے عوام میں ۸ بہت مقبول تھا۔ اس خاندان نے کافی طویل مدت تک شمالی علاقہ جات پر حکمرانی کی۔ آذر جمشید ایک دن شکار کو گیا ہوا تھا کہ وہیں کہیں گم ہو گیا۔ اس کی گمشدگی کے بعد اس کی بیوی نور بخت نے بڑے طمطراق سے حکومت کی۔ "خاندانِ ترہ" میں ملکہ نور بخت کے بعد جوار خاتون نے بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کی۔ گلگت، چلاس، داریل، تانگیر اور کوہستان تک کا علاقہ اس کی عملداری میں شامل تھا۔

علی شیر خان انچن شمالی علاقہ جات میں ایک عظیم فاتح اور ایک کامیاب حکمران گزرا ہے۔ اس بارے میں اجمل سعید پراچہ یوں رقم طراز ہیں:

"شمالی علاقہ جات کے حکمرانوں میں علی شیر خان انچن کا نام ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے آج بھی پہچانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق سکردو کے مقپون خاندان سے تھا۔ اس کے اقتدار میں آنے سے پہلے سکردو ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس پر چلاس اور استور کی طرف سے اکثر پیش قدمی ہوتی رہتی تھی۔ علی شیر خان انچن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف ان حملوں کا بڑی جواں مردی سے مقابلہ کیا بلکہ چلاس اور استور کو فتح کر کے اسے اپنی ریاست کا باقاعدہ حصہ بنالیا۔ ان فتوحات نے اس کے حوصلے بلند کر دیے کہ اس نے گلگت اور چترال پر بھی لشکر کشی کر دی اور ان پر قبضہ کر لیا۔ ایک روایت کے مطابق علی

> شیر خان انچن نے بروشال کے مقام پر پن چکی کا ایک پاٹ اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر چنار کے ایک درخت میں پرو دیا تھا۔ بعض روایات کے مطابق وہ آج بھی موجود ہے"۔ ۲ے

شمالی علاقہ جات کی تاریخی حیثیت پر بہت سفر نامہ نگاروں نے روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک نے اپنی اپنی معلومات کے مطابق اپنے سفر ناموں میں اس کی تاریخ کو مختصر دہرایا ہے۔ البتہ ایک بات مسلّم ہے کہ یہاں کے رہنے والے لوگ خود کو سکندر اعظم کی اولاد کہتے ہیں۔ سفر نامہ " شندور کی کالی جھیل" کے مصنف شمیم حسن خان نے بھی چترال اور اس کے ملحقہ علاقوں کا تاریخی تناظر میں تعارف پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ساڑھے تین ہزار سال قبل یہاں آریہ قوم آباد تھی ۔ پھر ایران کے دارا عظم کی افواج آئیں۔ اس کے بعد چینیوں نے یہ علاقہ فتح کر کے اپنے ایک صوبے کاشغر میں شامل کر لیا اس لیے قشقار کے نام سے موسوم ہوا۔ قریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل یہاں بدھ مت کے ماننے والے آباد تھے۔ ۲۷۔۳۲۳ ق۔م میں سکندر اعظم نے یہاں قدم جمائے۔ اس کی فوجوں اور ایک جرنیل سیلوکس نے یہاں بسیرا کیا اور کالاش قبیلے کی صورت میں اپنی انمٹ نشانیاں چھوڑیں۔ ۳ے

شمالی علاقہ جات پاکستان کا وہ واحد خطہ ہے جس کی سرحدیں تین ملکوں سے ملتی ہیں۔ نیز پاکستان اپنے ہمسایہ ملک بھارت سے تین جنگیں ۴۸ء کی جنگ، کارگل جنگ اور سیاچین جنگ اسی علاقے میں لڑا ہے۔ اس وجہ سے یہ علاقہ دفاعی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نیز یہیں سے تاریخی شاہراہ ریشم گزرتی ہے۔

۲۹ر اگست ۲۰۰۹ء کو پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں اس علاقے کو خود مختیاری دی گئی۔ قمر زمان کائرہ پہلے گورنر مقرر ہوئے۔ شمالی علاقہ جات کا نیا نام گلگت بلتستان رکھا گیا۔ گلگت بلتستان دو ڈویژنز گلگت اور بلتستان پر مشتمل ہے۔ اول الذکر ڈویژن گلگت، غذر، دیامیر، استور، ہنزہ نگر کے اضلاع پر مشتمل ہے جبکہ بلتستان ڈویژن سکردو اور گانچے کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے اس خطے کی بے پناہ اہمیت ہے ۔ اس کی سرحد جنوب میں آزاد کشمیر سے ملتی ہے۔ مغرب میں صوبہ خیبر پختونخوا سے، شمال میں افغانستان کی واخان پٹی سے، شمال مشرق میں چین کے صوبے سنکیانگ سے اور جنوب میں

بھارت کے زیر تسلط علاقہ جموں و کشمیر سے ملتی ہے۔یہ علاقہ یکم نومبر ۱۹۴۸ء کو پاکستان میں شامل ہوا۔اس کا دار خلافہ گلگت ہے اور اہم ترین شہر سکردو ہے۔یہ خطہ انتظامی خود مختیاری رکھتا ہے اس لیے اس کی اپنی قانون سازاسمبلی ہے جس کے گورنر میر غضنفر علی اور وزیر اعلیٰ حفیظ الرحمٰن ہیں۔۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق اس خطے کی کل آبادی تقریباً۸۷۹۷۲۲ا نفوس پر مشتمل ہے جبکہ ۱۷-۲۰۱٦ کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی تقریباً ساٹھ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔اسمبلی سیٹوں کی تعداد ۳۳ ہے۔اس خطے کی بڑی زبانوں میں بلتی، شینااور بروشسکی شامل ہیں۔

شمالی علاقہ جات کے انتظامی امور کے سلسلے میں "پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا" میں یوں مذکور ہے:

> "اس وقت شمالی علاقے پانچ اضلاع پر مشتمل ہیں۔ہر ضلع کا انتظامی سربراہ ڈپٹی کمشنر ہوتا ہے جبکہ چیف سیکرٹری پانچوں اضلاع کے انتظامی امور کا نگران اعلیٰ ہوتا ہے۔گلگت ان علاقہ جات کا دارالخلافہ ہے۔یہ علاقے براہ راست وفاق پاکستان کے ماتحت ہیں اور وزیر امور کشمیر و شمالی علاقہ جات ان کا انتظامی سربراہ ہے۔قانون ساز کونسل شمالی علاقہ جات کا سب سے بڑا سیاسی اور جمہوری ایوان ہے۔وفاقی وزیر امور کشمیر و شمالی علاقہ جات کو قانون ساز کونسل کے چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت حاصل ہے جبکہ ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو قانون ساز کونسل شمالی علاقہ جات کے ارکان میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔"[۴]

شمالی خطے کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ پاکستانی دریاؤں، جہلم اور سندھ کا منبع ہے۔اس علاقے کے پہاڑ بہت سی خصوصیات اور نعمتوں سے مالا مال ہیں۔یہاں پھلوں اور باغات کی کثرت ہے یہاں کے لوگ محنتی اور جفاکش ہیں۔یہ علاقہ پاکستان کو چین اور بھارت سے ملاتا ہے۔جغرافیائی اہمیت کے علاوہ یہاں کی ایک مخصوص تہذیب اور ثقافت ہے جو اسے ملک کے دوسرے حصوں سے ممتاز کرتی ہے۔یہاں کی ثقافت کی بنیاد مذہب پر ہے۔بلتستان کی اکثریت شیعہ مسلمانوں پر مشتمل ہے جبکہ گلگت میں ملی جلی آبادی رہائش پذیر ہے۔یعنی بعض علاقوں میں شیعہ مسلمانوں کی آبادی ہے جبکہ بعض علاقوں میں اہلِ سنت رہائش پذیر ہیں۔

گلگت کی وجہ تسمیہ:

گلگت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بعض مؤرخین کے خیال میں یہ "گری گرت" سے نکلا ہے جس کا معنی ہے "پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا علاقہ" بعد میں یہ گری گرت سے گلگت بن گیا۔ بعض کے خیال میں آبی طوفان سیلاب سے پہلے گلگت پہلے گلگشت یعنی سیر چمن تھا جو انتہائی زرخیز تھا اور ہر طرف پھول ہی پھول کھلے نظر آتے تھے اس وجہ سے اسے گلگشت کا نام دیا گیا جو بعد میں گلگت بن گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ گلگت، سنسکرت لفظ گلگوت کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب " قبرستان" ہے۔ زمانہ قدیم میں یہاں بے انتہا قتل وغارت گری ہوئی جس کی وجہ سے یہ علاقہ قبرستان بن گیا۔ ترکوں کے ہاں گلگت دراصل " کھل کھِت" ہے۔ ترکی زبان میں کھِل کھِت کے معنی آمدورفت کے ہیں۔ پرانے زمانے میں یہ علاقہ ترکوں کی فوجی چھاؤنی رہا ہے۔ مختلف اُمور کے سلسلے میں یہاں ترکوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی اس وجہ سے اس کا نام کھل کھِت پڑا جو بعد میں گلگت بن گیا۔ محل وقع کے لحاظ سے یہ علاقہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ گلگت کے مشرق میں کارگل، شمال میں چین شمال مغرب میں افغانستان، مغرب میں چترال اور جنوب مشرق میں بلتستان کا علاقہ ہے۔ گلگت تاریخی شاہراہ قراقرم کے قریب ہے جو پاکستان اور چین کے تعاون سے بنی ہے۔ شاہراہ قراقرم محض ایک شاہراہ کا نام نہیں بلکہ یہ پاک چین دوستی کی ایک عظیم نشانی ہے۔ یہ پاکستان کو چین کے ساتھ ملانے کا واحد زمینی راستہ ہے۔ شاہراہ قراقرم دنیا کی بلند ترین بین الاقوامی شاہراہ ہے جس کی بلندی خنجراب کے مقام پر سطح سمندر سے ۴۶۹۳ میٹر ہے اور یہ دنیا کے عظیم پہاڑی سلسلوں قراقرم اور ہمالیہ کو عبور کرتی ہے۔ یہ شاہراہ، قراقرم ہائی وے اور شاہراہ ریشم کے نام سے بھی مشہور ہے۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بارے میں مختلف سفرنامہ نگاروں نے اظہار خیال کیا ہے۔ اجمل سعید پراچہ نے اپنے سفرنامے " نانگا پربت کے حضور میں" میں اس پر بہت تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "شاہراہ قراقرم جسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھی کہا جاتا ہے پاکستان اور چین کے اشتراک سے بننے والا ایک ایسا عظیم شاہکار ہے جس نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بیس برس کے طویل عرصے میں پایۂ تکمیل تک پہنچنے والی اس شاہراہ پر کام کا آغاز ۷ر جنوری ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ اس کی تعمیر میں مجموعی طور پر

۲۴۰۰۰ پاکستانی اور ۹۵۰۰ چینی نوجوانوں نے حصہ لیا۔ یہ مانسہرہ سے خنجراب تک ۷۶۰ کلومیٹر طویل ہے اور ایک اندازے کے مطابق دورانِ تعمیر اس میں ۸۰،۰۰۰ ٹن پٹرول، ۸،۰۰۰ ٹن سیمنٹ، ۸۰۰۰ ہزار ٹن بارود اور ۳۵۰۰۰ ٹن کوئلہ صرف ہوا جبکہ ۱۰۰۰ ٹرک اور دیگر گاڑیاں ہمہ وقت کام میں مصروف رہیں۔ اس میں چٹانوں کا مجموعی کٹاؤ دو کروڑ ستر لاکھ مربع گز ہے۔ شاہراہ قراقرم کا افتتاح ۱۸ر جون ۱۹۷۸ء کو اس وقت کے سربراہ مملکت جناب ضیاء الحق نے کیا جبکہ عوامی جمہوریہ چین کی نمائندگی ان کے نائب وزیر اعظم جناب کنگ پیاؤ نے کی۔ ۵؎

شاہراہ قراقرم کے بارے میں وکی پیڈیا میں تفصیل موجود ہے جس میں اس بارے میں کچھ یوں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

"یہ بیس سال کے عرصے میں ۱۹۸۶ء میں مکمل ہوئی۔ اسے پاکستان اور چین نے مل کر بنایا ہے۔ اس کو تعمیر کرتے وقت ۸۱۰ پاکستانیوں اور ۸۲ چینیوں نے اپنی جان دے دی۔ اس کی لمبائی ۱۳۰۰ کلومیٹر ہے۔ یہ چینی شہر کاشغر سے شروع ہوتی ہے پھر ہنزہ، نگر، گلگت، چلاس، داسو، بشام، مانسہرہ، ایبٹ آباد، ہری پور ہزارہ سے ہوتی ہوئی حسن ابدال کے مقام پر جی ٹی روڈ سے ملتی ہے۔ دریائے سندھ، دریائے گلگت، دریائے ہنزہ، نانگا پربت اور راکا پوشی کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ شاہراہ قراقرم ایک مشکل پہاڑی علاقے میں بنائی گئی ہے اس لیے اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھی کہتے ہیں"۔ ٦؎

بلتستان:

بلتی زبان میں بلتیول ایک قدیم خطہ اور ڈویژن ہے جو کبھی بلتی یل تبت خورد اور قبل مسیح میں پلولو کے ناموں سے معروف تھا۔ بلتستان میں دنیا کے تیس سے زیادہ بلند ترین پہاڑ واقع ہیں۔ بلتستان کا پہاڑی علاقہ سکردو، روندو، شگر، کھرمنگ، گلتری اور خپلو کی وادیوں پر مشتمل ہے۔ انتظامی لحاظ سے یہ علاقہ دو اضلاع سکردو اور ضلع گانچھے میں منقسم ہے۔ بلتستان کے جنوب میں کشمیر، مشرق میں لداخ

کارگل، مغرب میں گلگت اور دیامر جبکہ شمال میں کوہ قراقرم، بلتستان کو چینی صوبہ سنکیانگ سے الگ کرتے ہیں۔بلتستان کی قدیم تاریخ کے بارے میں کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں،لوک روایات اور داستانوں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قبل مسیح میں ان خطوں پر ایک کیسر نامی بادشاہ کی حکومت تھی۔ کیسر کے بارے میں عوام کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہے جو انہیں دنیا میں غربت اور مظالم سے نجات دلانے آیا ہے۔ اس علاقے کے رہنے والے لوگ مختلف اوقات میں مختلف مذاہب کے پیروکار رہے ہیں۔ کبھی بدھ مت، کبھی بون ازم اور کبھی لاما ازم ان علاقوں کا مقبول مذہب رہا ہے۔ ان مذاہب کے بارے میں آزاد دائرۃ المعارف وکی پیڈیا کی معلومات کچھ یوں ہے:

"تاریخی حوالوں سے ۲۰۰ سال قبل مسیح کے دوران بدھ مت کے آثار ملتے ہیں

بعد ازاں بون مت کے اختلاط سے لاما ازم وجود میں آیا"۔ ۷۔

اسلام کی اشاعت سے پہلے بلتستان میں یہاں بدھ مت رائج تھا۔بلتستان میں بزرگانِ دین کی آمد سے لوگ بدھ مت کی تعلیمات چھوڑ کر اسلام کی طرف راغب ہونے لگے۔ان بزرگانِ دین میں شاہ ہمدان، شاہ سید محمد نور بخش، سید ناصر طوسی اور سید علی طوسی نے دین اسلام کی تبلیغ میں شب و روز محنت کی جس کی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں ان کے معتقدین بن گئے جنہوں نے اسلام کی اشاعت میں ان بزرگوں کا ساتھ دیا۔ ان بزرگان دین کی اولاد آج بھی علاقوں میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں وکی پیڈیا کہتا ہے :

"اسلام سے پہلے بلتستان میں بدھ مت کا دور تھا۔ ۷۰۰ھ میں ایران سے میر سید علی ہمدانی المعروف شاہ ہمدانؒ یہاں تشریف لائے اور اسلام کی تبلیغ کی۔ آپ نے خپلو میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جس کا نام چقچن ہے۔ جو آج بھی بڑی شان و شوکت سے موجود ہے۔ اس کے بعد شاہ سید محمد نور بخش قہستانی یہاں تبلیغ کے لیے آئے پھر ۱۵۰۷ء میں سید ناصر طوسی اور سید علی طوسی دونوں بھائی یارقند سے سلتورو کے راستے خپلو پہنچے اور اسلام کی تبلیغ کی۔ ان دونوں بزرگوں کے بعد دو اور نوربخشی بزرگ سید میر مختار اخیار اور سید میر یحیٰ ابھی چینی ترکستان سے شگر پہنچے۔ میر مختار نے بعد میں کریس میں سکونت حاصل کی اور وہیں وفات پائی۔ وہ نوربخشی سلسلہ طریقت کے پیر بھی تھے۔ ان کا مزار آج بھی کریس میں

مرجع خلائق ہے۔ آج بلتستان کے تقریباً تمام موسوی سادات اور نور بخشی سلسلے
کے موجودہ پیر سید محمد شاہ نورانی انہی کے اولاد سے ہیں"۔ ۸۔

پانچویں صدی میں بلتستان پر پلو شاہی خاندان حکمران تھا۔ ۹۰۰ء میں بلتستان تبت کا ایک صوبہ تھا۔ بعد ازاں یہاں خانہ جنگی شروع ہوئی جس کی وجہ سے بلتستان تبت سے الگ ہو گیا۔

گلگت بلتستان۔۔۔انتظامی اُمور

شمالی علاقہ جات کو اب سرکاری طور پر گلگت بلتستان کہا جاتا ہے۔ ۲۰۰۹ سے گلگت بلتستان کو ایک علیحدہ صوبہ گردانا جاتا ہے۔ یہ علاقہ خیبر پختونخوا/ فاٹا کے زیر نگران ہے۔ گورنر یہاں کا آئینی سربراہ ہوتا ہے جس کی مدد کے لیے وزیر اعلیٰ اور اُس کی کابینہ ہوتی ہے۔ یہ پہلی بار سامنے آیا ہے کہ اس علاقے کا اپنا انتظامی ڈھانچہ ہے جو گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی کے تحت انتظامی اُمور چلاتا ہے۔ تمام اضلاع میں حکومتی طریقہ کار کے مطابق انتخابات ہوتے ہیں جس میں صوبائی ممبران منتخب کیے جاتے ہیں۔ چیف سیکرٹری تمام محکموں کا انتظامی سربراہ ہوتا ہے جو وزیر اعلیٰ کی طرف سے تمام معاملات / اُمور چلاتا ہے۔ گلگت بلتستان میں ہائی کورٹ کی صورت میں تین ججوں پر مشتمل عدالتی نظام بھی رائج ہے۔

صوبہ گلگت بلتستان دو ڈویژن اور سات اضلاع میں منقسم ہے۔ جن کے نام درج ذیل ہیں۔

درج ذیل اضلاع گلگت ڈویژن میں ہیں۔

(۳) گلگت (۴) دیامیر (۵) غذر (۶) اَستور (۷) ہنزہ۔ نگر

جبکہ درج ذیل اضلاع بلتستان ڈویژن میں ہیں۔

(۱) گانچھے (۲) سکردو

ڈویژن	ضلع	رقبہ (مربع کلومیٹر)	آبادی(۱۹۹۸)	دارالخلافہ
بلتستان	گانچھے	9,400	88,366	خپلو
	سکردو	18,000	214,848	سکردو
گلگت	گلگت	39,300	383,324	گلگت
	دیامیر	10936	131,925	چلاس
	غذر	9635	120,218	گاہکوچ

	اَستور	8,657	71,666	گوری کوٹ
	ہنزہ۔ نگر	20,057	112,450	علی آباد، سکندر آباد
گلگت بلتستان(کل)	7اضلاع	115,985	1,122,797	گلگت

1998کی مردم شماری کے مطابق شمالی علاقہ جات (گلگت بلتستان) کی کل آبادی ۱,۱۲۲,۷۹۷ ہے جن میں ۸۵.۷ فیصد دیہات میں رہتی ہے جبکہ صرف ۱۴.۳ فیصد شہروں میں رہتی ہے۔

فصلِ دوم

زبانیں اور بولیاں:

شمالی علاقہ جات کی مقامی زبانوں میں شنا، بلتی، کھوار اور بروشسکی شامل ہیں البتہ شمالی علاقہ جات کے تمام اضلاع میں شنا زبان بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ماہر لسانیات ڈاکٹر ناموس کہتا ہے کہ شنا زبان پاکستان، آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے تقریباً ۱۲۳۵۲ مربع میل کے وسیع و عریض علاقے میں بولی جاتی ہے۔شنا زبان تین ہزار سال سے پانچ ہزار سال قبل مسیح کی زبان ہے۔اس زبان کا شمار آریائی زبانوں کے داردی خاندان میں ہوتا ہے۔ آریہ قوم ایک ہزار اور دو ہزار قبل مسیح کے درمیان ہندوستان میں آئی۔ اُن میں شین قوم بھی موجود تھی۔شنا زبان اُس زمانے کی سنسکرت کی ایک شکل ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ تمام آوازیں موجود ہیں جو سنسکرت زبان کا حصہ ہیں۔ایک جرمن ماہر لسانیات ڈاکٹر جارج بدرس 'شنا' زبان کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے :

> "شنا زبان تین ہزار سال سے پانچ ہزار سال قبل مسیح کی زبان ہے جو قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کے عظیم پہاڑی سلسلوں کے دامن میں پھیلے ہوئے علاقے میں لب و لہجے کی خفیف سی تبدیلی کے ساتھ بولی جاتی ہے۔اس زبان کو کبھی سرکاری یا درباری زبان ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔اس زبان کا شمار کشمیری کی طرح آریائی زبانوں کے داردی خاندان سے ہوتا ہے۔ماہرین اسے کشمیری زبان کی ماں کا درجہ دیتے ہیں"۔ ۹؎

شنا زبان چار بولیوں پر مشتمل ہے۔

(۱) گلگتی بولی : یہ شنا کی معیاری بولی کہلاتی ہے۔

(۲) اُستوری بولی : یہ بولی استور، گریز اور دارس میں بولی جاتی ہے۔

(۳) چلاسی بولی : یہ بولی چلاس اور داریل تانگیر میں رائج ہے۔

(۴) بروکپا بولی : یہ بولی سکردو، پرکوتہ، طولتی تالداخ اور مقبوضہ کشمیر میں مروّج ہے۔

شنازبان کو گلگت اور ملحقہ علاقہ جات میں ایک معیاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ضلع گلگت میں ہنزہ بالا کے لوگوں کی زبان 'وخی' ہے۔ ہنزہ خاص اور نگر کے لوگوں کی زبان بروشسکی ہے۔ ان کے علاوہ پورے گلگت میں شنا زبان بولی جاتی ہے۔ پونیال کے علاوہ ضلع غذر کے سب ڈویژن گوپس میں شنا بولنے والے موجود ہیں۔ بلتستان میں شنا زبان بولنے والے بہت زیادہ ہیں۔ ضلع دیامر میں بھی شنا بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ شنا کے علاوہ دوسری زبانیں فارسی، عربی، کشمیری، گوجری کھلوچا، پشتو، بلتی اور انگریزی بھی بولی جاتی ہے۔

بدھ مت:

اسلام کی اشاعت سے پہلے ان علاقوں میں بدھ مذہب رائج تھا۔ فاہیان نے شمالی علاقہ جات میں بدھ مت کے آثار کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اُن کے مطابق ضلع دیامیر کی تحصیل داریل میں پھگچ کے مقام پر مہاتما بدھ کا ۹۴ فٹ لمبا لکڑی کا بنا ہوا ایک طویل مجسمہ تھا جس کی زیارت کے لیے چین اور تبت سے بے شمار زائرین آتے تھے۔ ایک جگہ پر یہ بھی آیا ہے کہ پھگچ کے مقام ایک مدرسہ قائم تھا جس میں باقاعدہ طور پر بدھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں پر سینکڑوں کی تعداد میں بدھ بھکشو رہا کرتے تھے۔ یہاں پر مدرسے کے کھنڈرات کے آثار آج بھی موجود ہیں علاوہ ازیں پہاڑوں اور چٹانوں پر کھدی ہوئی تصاویر اور چٹانی مجسموں کو دیکھ کر بدھ مت کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔

گلگت میں اشاعتِ اسلام

مؤرخین کے مطابق گلگت میں اشاعتِ اسلام کا آغاز پندرھویں اور سولہویں صدی میں ہوا۔ مشہور عراقی بزرگ شمس الدین عراقی نے سولہویں صدی کے درمیان اپنے چھے مبلغین کو تبلیغِ دین کے سلسلے میں گلگت بھیجا تھا۔ بعض کے خیال میں گلگت میں اسلام کا آغاز ۱۱۲۰ء میں آذر جمشید کے زمانے میں ہوا۔ اُن چھے بزرگوں سید شاہ ولی، سید شاہ اکبر، سید شاہ افضل، سید شاہ بریاولی، سید سلطان علی اور سید میر ابراہیم کی شبانہ روز محنت سے یہاں کے لوگ بدھ مذہب چھوڑ کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پروفیسر عثمان کے مطابق سید افضل شاہ ۱۵۵۵ء سے ۱۵۶۰ء تک اشاعتِ دین میں لگے رہے۔ ۱۵۹۰ء میں سید شاہ بریاولی نگر تشریف لائے۔ اس زمانے میں بدھ مت، ہندومت اور مجوسیت کا زور تھا۔ آپ نے یہاں پر

شیعہ مسلک کی تبلیغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد سید شاہ ولی نے ہنزہ میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں شبانہ روز محنت کر کے لوگوں کو دین اسلام میں داخل کیا۔ ۱۷۳۰ء میں سید شاہ ولی ہیسپر کے راستے اسکردو سے نگر آئے اور تھول میں رہائش پذیر ہوئے۔ شیعہ مسلک کی بنیاد بلتستان کے واسطے سے گلگت، بگروٹ، حراموش اور نگر میں پڑی۔ ہنزہ، اشکومن، گوپس اور یاسین چونکہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے پامیر اور واخان کے قریب تھے اس لیے یہاں پر اسماعیلیت کو فروغ حاصل ہوا۔ کوہ غذر، اشکومن، گوپس اور پونیال میں سنی مذہب پروان چڑھا۔ چلاس اور داریل تانگیر کے علاقے سوات اور ہزارہ سے متصل تھے اس لیے یہاں اہلِ سنت کا مسلک لوگوں نے اپنایا۔

شمالی علاقہ جات میں اسلام کی آمد کے بارے میں اجمل سعید پراچہ لکھتا ہے:

> ''شمالی علاقہ جات میں دینِ اسلام کی اشاعت کا سلسلہ اگرچہ چودھویں صدی عیسوی کے آواخر میں شروع ہو چکا تھا مگر یہ بات اپنی جگہ حیران کن ہے کہ چلاس، داریل اور تانگیر میں اسلام اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں جا کر پھیلا۔ شاہ ہمدان کے فرزندِ ارجمند سید علی ہمدانی المعروف حضرت کبیر جب تصوف کی منازل طے کرنے کے بعد شیخ مزدقانی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنہوں نے آپ کو سیاحت کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے مشرق سے مغرب تک تین بار مختلف ممالک کی سیر کی۔ اسی سلسلے میں آپ ۱۳۷۲ء میں پہلی بار کشمیر کے راستے بلتستان تشریف آئے۔ چار ماہ یہاں گزارنے کے بعد سید علی ہمدانی حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے مکہ روانہ ہوئے اور وہاں سے واپس ہمدان چلے گئے اور پھر تقریباً سات سال بعد بلتستان شتریف لائے۔ ۱۰۔

اشاعتِ اسلام میں سید شاہ سلطان الف نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ آپ نے ۱۶۸۰ء میں تشریف لا کر گلگت کو دین اسلام کی تبلیغ کا مرکز بنایا۔ آپ کی زیارت کے لیے آج بھی لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔ گلگت میں دو اور بزرگوں پیرزادہ سید اکبر شاہ اور پیرزادہ سید شاہ فضل کا نام لیا جاتا ہے۔ دونوں سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں ایک اور بزرگ سید محمود بابا کی زیارت ہے جو ہزارہ سے تشریف لائے تھے۔ تعلق سنی مسلک سے تھا۔ چلاس اور داریل تانگیر میں دین اسلام کی اشاعت و ترقی کا سہرا

غان کے سادات کے سر بند ھتا ہے۔ بہر حال یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شمالی علاقہ جات میں دین اسلام کی ترویج و اشاعت میں بزرگانِ دین نے حصہ لیا اور اُن کی کوششوں اور محنت سے اس خطے میں اسلام پھیلا۔ اجمل سعید پراچہ لکھتا ہے:

> ''سولہویں صدی عیسوی میں مبلغینِ اسلام گلگت اور چترال تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی شبانہ روز کوششوں کے طفیل لوگ جوق در جوق حلقہِ بگوش اسلام ہونے لگے۔ خطۂ دیامر میں ماسوا استور کے اسلام اٹھارہویں صدی عیسوی میں پھیلا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ تحقیق طلب ہے کہ مبلغین اس خطے میں اتنی تاخیر سے کیوں پہنچے۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ یہاں کے دشوار گزار راستے ان کی راہ میں حائل تھے یا پھر لوگوں کی فطری درشت خوئی اور سخت گیری نے اُنہیں اس طرف آنے سے روکے رکھا یا پھر مبلغین اسلام دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی پہنچے مگر لوگوں کے مضبوط مذہبی عقائد کی وجہ سے انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی ہو۔ ۱۱ ؎

ثقافت اور تہذیب و معاشرت

ہر خطے کی اپنی اپنی تہذیب اور اپنی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات کچھ ثقافتیں باہم مشترک بھی ہوتی ہیں مگر تہذیب و ثقافت میں بے شمار چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انہیں دوسری اقوام سے ممیز بھی کرتی ہیں اور اُنہیں الگ شناخت بھی دیتی ہیں۔ اگر پکوانوں کی بات کی جائے تو شمالی علاقہ جات میں بعض ایسے پکوان پکائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے شمالی علاقہ جات کی ثقافت کی انفرادیت سامنے آجاتی ہے۔ ذیل میں ان پکوانوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مقامی پکوان

خوشی کے موقع پر پکنے والے پکوان

ٹُل:

جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو عموماً یہ طعام بنایا جاتا ہے۔ اس کھانے کو آٹے اور پانی کے محلول سے بناتے ہیں۔ اس محلول میں چمچ سے گڑھا بنا کر اسے دیسی گھی سے بھر دیتے ہیں اور حسب ضرورت چینی ملا کر گرم گرم کھاتے ہیں۔

شربت

گلگت اور ملحقہ علاقہ جات میں شربت سے مراد مشروبات نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا کھانا ہے جو ختنہ کی تقریبات وغیرہ میں بناتے ہیں۔اس میں دیسی گھی کو کسی برتن میں ڈال کر اور اسے آگ پر رکھ کر خوب جوش دیتے ہیں۔دیسی گھی کا فاضل مواد چھانی کے ذریعے الگ کر کے پھینک دیتے ہیں۔ پھر گھی کے اندر گرم پانی اور گندم کا آٹا ڈال دیتے ہیں اور ڈوئی سے آٹا اور گھی کو آخر دم تک متحرک رکھتے ہیں۔ اس طرح شربت تیار ہو جاتا ہے۔اس میں نمک یا چینی کچھ نہیں ڈالتے۔اس کے بعد چار یا پانچ آدمیوں کو تھال میں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔

غمی کے پکوان

خیرات

کسی شخص کی فوتگی کے موقع پر حسب استطاعت جانور ذبح کیا جاتا ہے اور اسے پکا کر پلاؤ کے ساتھ لوگوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ خیرات کہلاتی ہے۔لوگ خیرات کھانے کے بعد مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ خیرات کے لیے لوگوں کے گھر جا جا کر دعوت دی جاتی ہے۔ ضلع دیامر میں یہ طریقہ مروّج ہے کہ جانور ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت گھروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ گوشت کے ساتھ ہر گھر کو آٹا اور گھی بھی دیا جاتا ہے۔

اوگرہ

یوم عاشورہ کو'اوگرہ' بنا کر اہل سنت کے لوگ بچوں میں تقسیم کرتے ہیں۔اوگرہ بنانے کے لیے صاف چاول کو گرم پانی میں جوش دیتے ہیں۔جب دیگچی میں پانی بھاپ بن کر بالکل ختم ہو جائے تو اس میں دودھ اور چینی ڈال کر انھیں جوش دیا جاتا ہے،اس طرح 'اوگرہ' تیار ہو جاتا ہے۔'اوگرہ' کی جدید شکل آج کل کا "کھیر" ہے۔

تبرک(زکمہ)

اہل تشیع حضرات دس محرم کو عاشور کے ظہر تک فاقہ کرتے ہیں ۔ اپنے گھروں میں موجود چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ محرم کے دس دنوں میں ماتمی جلوس کے بعد لوگ نذر و نیاز کی شکل میں حلوہ

وبسکٹ اور چائے وغیرہ سے لوگوں کی خاطر مدارت کرتے ہیں اور یہ عمل اپنی باری پر ہر گھر انجام دیتا ہے۔اس دوران جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔اُنہیں تبرک (ز کمہ) کہتے ہیں۔

ٹٹوری

مکئی کے آٹے سے بنائی گئی خمیری روٹی کو شنا میں 'ٹٹوری' کہتے ہیں۔جب روٹی پک کر تیار ہو جاتی ہے تو عام ساگ سے تیار شدہ ترکاری میں مکئی کی روٹی (ٹٹوری) کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیے جاتے ہیں ساتھ ہی ہری مرچ یا پسی ہوئی دیسی مرچ بھی شامل کر دیتے ہیں جب ساگ اور روٹی گھل مل جاتی ہے تو لوگ اسے شوق سے کھاتے ہیں۔خاص طور پر عورتوں کی یہ ایک مرغوب غذا ہے۔

قِستہ

گندم کی خمیری روٹی 'قستہ' کہلاتی ہے۔یہ روٹی بڑی زود ہضم ہوتی ہے۔لوگ اسے سالن، چائے یا گھی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

ڈنگ دھرم

'ڈھنگ دھرم' قدیم زمانے کی سویٹ ڈش ہے۔اخروٹ اور خوبانی کی گری خوب پیس کر اس میں گندم اور دھرم کا آٹا ملاتے ہیں اور ایک خاص دیگ جسے شنا میں 'چدن' کہتے ہیں۔آگ کی آنچ پر رکھ کر بڑی محنت سے پکاتے ہیں۔یہ ذائقے میں میٹھا ہوتا ہے۔

پُھلکا

پتلی خمیری روٹی کو 'پھلکا' کہتے ہیں۔غیر خمیر روٹی کو 'شلک' کہتے ہیں۔ترکاری کے ساتھ اس کا زیادہ تر استعمال ہوتا ہے۔

ان پکوانوں کے علاوہ کچھ اور کھانے بھی مقامی طور پر تیار کیے جاتے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

کشی، گل منڈی، کَیّ، دُوئی ڈوڈو، پھٹور گس، وی بارُسَ، شونٹر، پھلئی، اِسکرکُر (میتھی)، شُوپن، ربونگ، اچار وغیرہ

عرس، تہوار اور جشن

شمالی خطوں میں عرس کا کوئی تصور نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہاں کوئی پیر یا ولی کی عدم موجودگی ہے۔ جو بزرگ ان علاقوں میں آئے اُن کا مقصد صرف اور صرف تبلیغ اسلام تھا۔ یہ لوگ بعد میں مختلف علاقوں کی طرف چلے گئے۔ البتہ یہاں بعض بزرگوں کے مزاراتِ مقدسہ موجود ہیں مگر اُن پر سالانہ عرس کا یہاں کوئی رواج نہیں۔ ان بزرگوں کی زیارت کے لیے لوگ آتے ہیں۔ نذر و نیاز بھی مانگتے ہیں اور مجاوروں کو رقم بھی دیتے ہیں۔

تہواریں :

شمالی علاقہ جات میں درج ذیل تہواریں کسی نہ کسی شکل میں منائی جاتی ہیں۔

دُھوم نکھا

یہ تہوار ہر سال موسم خزاں میں منایا جاتا ہے اور اس تہوار کے منانے کا مقصد زمین سے حاصل شدہ اناج سے شیاطین اور بلاؤں کو بھگانا ہے۔ یہ تہوار پونیال اشکومن میں مروّج ہے۔ لوگ نئے کپڑے پہن کر، لذیذ پکوان تیار کر کے مل بیٹھ کے کھاتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔ ایک چھوٹے قد کی مخلوق جسے ' یکھولے ' کہتے ہیں کو گھر سے نکالنے کے لیے یہ رسم ادا کی جاتی ہے جسے لوگ بے برکتی کی علامت تصور کرتے ہیں۔

سنو بزونو

سنو بزونو تہوار فروری اور مارچ کے مہینے کے درمیان منایا جاتا ہے۔ 'بزونو' موسم بہار کو کہتے ہیں جبکہ سنو' سین' قوم سے وابستہ مراد ہے۔ یہ تہوار تقریباً بارہ دن جاری رہتا ہے۔ بہار کی آمد کی خوشی میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ اس دن روایتی 'درم' تیار کرتے ہیں جو چینی کے بغیر مٹھائی کی طرح ذائقہ دار ہوتا ہے۔ یہ تہوار ناچ گانے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

عیدین

مقامی سطح پر عیدالاضحیٰ کو 'بڑی ایت 'اور ' قربانئی ایت ' اور عید الفطر کو چھوٹی عید اور ' ززای ایت ' پکارا جاتا ہے۔ اس موقع پر لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں اور قسما قسم کھانے پکاتے ہیں۔ عورتیں رات

کو مہندی لگاتی ہیں بعض جگہوں پر مرد بھی مہندی لگاتے ہیں۔ عید کی صبح سب لوگ ایک دوسرے کو عید مبارک کہتے ہیں اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ عید الاضحی پر سب لوگ حسب توفیق قربانی کرتے ہیں اور خوب جوش و خروش سے مذہبی رسومات میں حصہ لیتے ہیں۔

مُردوں کی عید / اُشار

اَستور اور شنابولی کے دیگر علاقوں میں اُشار یا مُردوں کی عید کے نام سے ایک تہوار منایا جاتا تھا جس کو مقامی زبان میں " چیوپون " کہا جاتا تھا۔ یوم اُشار کا چند دن پہلے اعلان کیا جاتا تھا اور پھر مقررہ دن بچے، بوڑھے، جوان سب لوگ اچھے اچھے کھانے پکوا کر ایک جگہ جمع ہو کر کھاتے اور مُردوں کے ایصال ثواب کے لیے دعائیں مانگتے۔ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس دن تمام مُردوں کی روحیں آزاد ہو کر اپنے اپنے رشتہ داروں کے بھیجے ہوئے تحفے وصول کرتی ہیں۔ تریشنگ جو اَستور کا علاقہ ہے، میں یہ تہوار اب بھی منایا جاتا ہے۔

غنونی

غنونی لفظ، غنو سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے ' بیج ' یہ تہوار ہر جون کے مہینے میں فصل کی کٹائی کے موقع پر منایا جاتا ہے۔ پرانے خاندان کا کوئی آدمی نئے سال کا تازہ مکھن اور روایتی روٹی " چھپٹہہ " ایک چوڑے پتوں والے پودے " چو محل " پر رکھ کر راجہ صاحب کی خدمت میں رسم بسم اللہ کے لیے پیش کر دیتا۔ راجہ صاحب ایک نوالہ توڑتے تو حاضرین بھی ایک نوالہ توڑ کر کھا لیتے تھے۔ اس کے بعد لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔ نئ فصل کے چند خوشوں سے دانے چن کر بھون لیتے اور پھر اُن کو دودھ میں ڈال کر راجہ صاحب کو پیش کیا جاتا۔ راجہ صاحب یہ خوراک تناول کرتا اور اس طرح فصل کی کٹائی شروع ہو جاتی۔

جشن آزادی گلگت

یکم نومبر ۱۹۴۷ کو گلگت اور دیامر کے عوام نے ڈوگروں اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کی تھی۔ اس خوشی میں یہ جشن ہر سال ماہ نومبر میں پورا ہفتہ بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ رنگارنگ ثقافتی اور ادبی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں علاوہ ازیں پورا ہفتہ کھیل تماشوں اور رقص و سرود میں گزارا جاتا ہے۔

جشنِ بہار کا میلہ

جشن بہار کا میلہ اپریل یا مئی میں لگتا ہے۔ اس دن کھیلوں کا انعقاد ہوتا ہے اور مختلف ادبی اور ثقافتی پروگرام ہوتے ہیں۔

سلک روٹ فیسٹیول

سلک روٹ فیسٹیول پہلے پہل شمالی علاقہ جات میں لوک ورثہ کے قومی ادارے کے زیر نگرانی "انٹرنیشنل سلک روٹ فیسٹیول" کے نام سے منعقد ہوا تھا۔ اب یہ فیسٹیول باقاعدگی سے یہاں منایا جاتا ہے۔ اس میں پاکستان کے علاوہ دیگر ملکوں کے ثقافتی و تجارتی مندوبین بھی شرکت کرتے ہیں۔ یہ میلہ عموماً موسم گرما میں منعقد ہوتا ہے۔ اس میلے میں مقامی، ملکی اور غیر ملکی ادارے اپنی مصنوعات کا سٹال لگاتے ہیں۔ اس موقع پر جشن کا سماں ہوتا ہے۔

جشن آزادی پاکستان

ملک کے دیگر علاقوں کی طرح یہاں ۱۴/ اگست کو یوم آزادیٔ پاکستان بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ پورا ہفتہ کھیل تماشے اور روایتی و ثقافتی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

شندور میلہ

شمالی علاقہ جات کی انتظامیہ کے باہمی اشتراک سے ہر سال ضلع غذر اور چترال کی سرحد پر واقع تقریباً ۱۲۵۰۰ فٹ بلند مقام شندور میں تین روزہ "شندور میلہ" منعقد کیا جاتا ہے۔ پوری وادیٔ میں جگہ بجگہ سٹال لگائے جاتے ہیں۔ اس میلے میں شرکت کرنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ مختلف ثقافتی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور رقص و موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ شندور میلے میں ایک بہت ہی مشہور اور قدیم کھیل پولو کھیلا جاتا ہے۔ اس میں گلگت بلتستان اور چترال کی ٹیموں کے درمیان پولو کے سخت مقابلے ہوتے ہیں۔ اس خطے میں پولو کے آغاز کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ اجمل سعید پراچہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "یہ کھیل ۶۰۰ ق م قبل مسیح میں چوگان بازی کے نام سے ایران میں کھیلا جاتا تھا۔ کچھ محققین اس کھیل کو مصر اور تبت سے منسوب کرتے ہیں۔ جبکہ اکثریت اسے وسط ایشیائی کی ریاستوں کا قدیم کھیل قرار دیتی ہے۔ شمالی علاقوں میں یہ کھیل وسطِ ایشیاہی سے وارد ہوا۔ پولو برصغیر کے پہلے ترک حکمران قطب الدین ایبک کا پسندیدہ کھیل تھا یہاں تک کہ اس کی موت بھی لاہور میں پولو کھیلتے ہوئے ہوئی۔ ۱۲

لوک لباس، زیورات اور سامان آرائش وزیبائش

لوک لباس

پرانے زمانے میں گلگت اور ملحقہ علاقوں کے لوگ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اُن کا گوشت خوراک کے طور پر استعمال میں لاتے تھے۔ اُن کی ہڈیاں بطور ہتھیار استعمال کرتے تھے اور اُن کی کھالوں سے تن ڈھانپتے تھے۔ جب اُن میں شعور بڑھا تو وہ بھیڑ بکریوں کے اون سے لباس وغیرہ تیار کر کے استعمال کرنے لگے۔ یہاں کا علاقائی لباس انتہائی دیدہ زیب ہے۔ علاقائی لباس قمیص، شلوار اور ٹوپی وغیرہ ان علاقوں میں کافی حد تک مشترک لباس ہے۔ سردیوں کے موسم میں چلاس اور دیامر میں اونی حنری اور دیگر علاقوں میں چوغہ (شکہ) پہننے کا رواج ہے۔ بعض جگہوں پر چوغہ پر ریشمی دھاگہ سے کڑھائی کر کے پہنتے ہیں۔ اونی کرتے کو مقامی زبان میں 'پھرن' کہتے ہیں جبکہ شلوار کو 'حنلو' کہتے ہیں۔ ٹوپی کو مقامی زبان میں 'کھوی' کہتے ہیں۔ بعض شوقین حضرات ٹوپی پر پھول لگاتے ہیں جبکہ بعض ٹوپی پر مختلف پرندوں کے پر لگاتے ہیں۔ جیسے مرغابیوں کے خمدار اور گھونگریالے کالے رنگ کے پر "جُزونئے" یا مرغ زریں کی کلغی "شانٹی" کے پَر وغیرہ۔ چترالی اونی ٹوپی پہننے کا بھی رواج ہو چلا ہے۔

بچوں کے سینوں پر نگینہ جڑاؤ ہار لٹکائے جاتے ہیں۔ عورتیں اونی کپڑے پہنتی تھیں۔ اُن کا لباس شلوار قمیص، دوپٹہ اور ٹوپی پر مشتمل ہوتا ہے۔ عورتوں کا کرتہ مردوں کے بہ نسبت زیادہ کھلا اور لمبا ہوا کرتا تھا۔ زنانہ ٹوپی اس طرح بنائی جاتی کہ اس میں عورتوں کے سارے بال سما سکیں۔ بعض جگہوں پر یہ رواج تھا کہ غیر شادی شدہ لڑکیاں سفید ٹوپیاں پہنتی تھیں۔ آج کل بھی بعض جگہوں پر سفید ٹوپی پہننا غیر شادی شدہ عورت کی علامت ہے اور سفید ٹوپی پہنی ہوئی نوجوان لڑکی کو "شیئ کھوئ" یعنی سفید ٹوپی والی کہتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں عورتیں کڑھائی والا لباس پسند کرتی ہیں۔ یہاں کی عورتیں صدف (موتی کا خول) مختلف شکلوں میں تراش کر زیور کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اسے عموماً ٹوپیوں پر، گلے میں یا کپڑوں پر بھی ٹانک دیتی تھی۔ جدید دور میں لوک لباس کا سلسلہ قریباً ختم ہو چکا ہے البتہ روایتی اونی ٹوپی، چوغہ اور حنری کا استعمال بعض علاقوں میں اب بھی رائج ہے۔

کالاش کے لوگوں کا لباس دوسرے علاقوں کے لوگوں سے خاصا منفرد ہے کیونکہ یہاں کی عورتیں اکثر و بیشتر کالے لباس میں ملبوس رہتی ہیں۔ مردوں کا لباس بھی خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ کالاش کے لباس و پوشاک پر روشنی ڈالتے ہوئے شمیم حسن خان کہتے ہیں :

> "پہلے اس علاقے کو کافرستان کہتے تھے کیونکہ یہ لوگ خدا کی پوجا عبادت نہیں کرتے اور نہ ہی بتوں کی پوجا۔۔۔۔ جب بیشتر آبادی مسلمان ہوگئی تو اس وقت کے مغربی پاکستان کے گورنر امیر محمد خان نے اس کا نام کافرستان سے بدل کر کالاش رکھ دیا۔ کالاش یہاں کے لوگوں کا قبیلہ ہے۔ کالاش اصل میں کالے کپڑے پہننے والے کو کہا جاتا ہے۔ یہ انوکھا لباس یہاں کی عورتیں زیب تن کرتی ہیں۔ کالے لباس اور کالی پٹی پر جڑی ہوئی اور سر پر کوڑیوں سے مزین محرابی ٹوپی اور گلے میں درجنوں کے حساب سے خوب صورت ہار پہنے آسمانی مخلوق دکھائی دیتی ہیں۔ مرد لوگ شلوار قمیص اور سر پر ٹوپی جسے پا کو کہا جاتا ہے پہنتے ہیں۔ اپنے کالاش ہونے کی انفرادیت برقرار رکھنے کی خاطر ٹوپی میں ایک پر لگائے رکھتے ہیں"۔ ۱۳؎

زیورات

زیورات کو مقامی زبان میں " ہرکون " کہتے ہیں۔ یہ علاقائی ثقافت اُجاگر کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ زیورات خواتین کے بناؤ سنگھار کا ایک اہم جز خیال کیا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں زیورات کا استعمال گندھارا تہذیب کے زیر اثر متعارف ہوا۔ ماضی میں لوگ چاندی کے زیورات پہنا کرتے تھے۔ شاہراہ ریشم کے بعد سونے کے زیورات کا رواج ہونے لگا۔ عورتیں شادی بیاہ، عیدین اور دیگر مقامی تہواروں پر زیورات زیب تن کرتی ہیں۔ ابتدا میں ان علاقوں میں کشمیری چاندی کے زیورات بنایا کرتے تھے جنہیں سنار کہا جاتا تھا بعد میں دیگر لوگوں نے بھی اس پیشے کو اپنایا۔ سنار زیورات کو قسما قسم نقش و نگار دے کر اُنہیں دیدہ زیب بناتے تھے جنہیں لوگ بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔

روایتی زیورات

پچویس

پچویس کی شکل تکونی ہوتی ہے۔ اس میں رنگارنگ نگینے لگا کر اسے چھاتی پر لٹکایا جاتا ہے۔ ماضی میں یہ رواج تھا کہ ماموں اپنی بھانجی کی شادی میں پچویس کو بطور تحفہ پیش کرتا تھا۔

بازی بند

بازی بند بھی سینے پر لٹکایا جاتا ہے۔ یہ گول شکل کا زیور ہوتا ہے۔ اس میں دھاگے کی ڈروی ڈالتے ہیں جس میں چاندی کے بُلسنگ اور بدم نامی زیور اور رنگارنگ موتی پرو کر اسے دیدہ زیب بناتے ہیں۔ یہ شنا زبان بولنے والوں کے علاقوں میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے البتہ چند جگہوں جیسے گوہر آباد میں اسے سینے کی بجائے زنانہ ٹوپی میں لگاتے ہیں اور اس میں دھاگہ وغیرہ نہیں ڈالتے۔

سلسلہ

سلسلہ زیور خواتین اپنی ٹوپی کے سامنے کی جانب لگاتی ہیں۔ اس میں نگینے بھی لگائے جاتے ہیں اور اس پر گھنگھرو بھی لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔

طوطہ

اس زیور کی شکل طوطے جیسی ہوتی ہے اس لیے اسے طوطہ کہتے ہیں۔ یہ قمیص پر آگے پیچھے لٹکائے جاتے ہیں اور اس پر چاندی کے گھنگھروں لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔

برونو:

انگوٹھی کو شنا زبان میں " برونو " اور نگینے کو " پھِٹہ " کہتے ہیں۔ انگوٹھیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں جو موتی جیسے زمرد، یاقوت، نیلم وغیرہ سے جڑاؤ ہوتی ہیں۔ نگینوں کا انتخاب اُن کی خاصیت دیکھ کر کیا جاتا ہے۔

حلقہ بند:

یہ ہار جیسا پٹی نما زیور ہوتا ہے جو گلے میں لٹکانے کے بجائے جلد کے متصل باندھا جاتا ہے۔ اسے فولڈ کیا جاسکتا ہے۔ اس پر گھنگھرو بھی لگے ہوتے ہیں اور نگینوں سے بھی مرصع ہوتا ہے۔

بموئیں رکائے

شنازبان میں کنگنوں کو " بمی یا بموئیں " کہا جاتا ہے۔ کنگن دراصل چاندی یا سونے کے حلقے کو کہتے ہیں پہلے زمانے میں آہنی کڑوں کا رواج تھا مگر اب چاندی اور سونے کے منقش کنگنوں کا استعمال ہونے لگا ہے ان کنگنوں پر بھی جواہرات وغیرہ کے جڑاؤ کا کام ہوا ہوتا ہے۔

چولیے:

شنازبان میں کان کی بالیوں کو " چولیے " کہا جاتا ہے۔ چولیے میں رنگا رنگ موتی ٹانکے جاتے ہیں۔

زمی یا مشٹیے:

یہ شکل میں گول، بیضوی یا چوکور ہوتے ہیں۔ یہ زیور عموماً چاندی کے بنائے جاتے ہیں۔ یہ دھاگے میں پروکر اور اس کا ہار بنا کر گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔ اس میں رنگا رنگ موتی پروکر انہیں مزیّن کیا جاتا ہے۔ یہ زیور بطور نیکلس استعمال ہوتا ہے۔

اِسکاؤ تمر :

شنازبان میں بیلن کو " اسکاؤ " کہتے ہیں جبکہ تعویذ کو " تمر " کہتے ہیں۔ انہیں اسکاؤ تمر اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بلین کی طرح گول دو ڈنڈیوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ چاندی کی دو ڈوریاں اس پر لٹکائی جاتی ہیں جو موتیوں سے مرصع ہوتی ہیں اور جس کے کناروں پر گھنگھرو ہوتے ہیں۔ اسے سینے پر قمیص کے اوپر لٹکایا جاتا ہے

تُمر:

تعویذ کو شنا میں " تمر " کہتے ہیں۔ چاندی کے تعویذ پر ' روز ' نامی پرندے کے دانت جب لگائے جاتے ہیں تو اس کی شکل کمان جیسی بن جاتی ہے۔ چاندی کی ڈوریاں اور گھنگھرو اس پر لٹکے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اسے بچوں کی ٹوپی پر سامنے کی جانب لٹکایا جاتا ہے اور کبھی بازو پر کپڑے کے اوپر لٹکاتے ہیں۔

پھل:

شمالی علاقہ جات جہاں بلند و بالا چوٹیوں اور دیو ہیکل گلیشئرز کی وجہ سے مشہور ہے وہاں پھلوں اور

میوہ جات کے حوالے سے بھی یہ علاقہ ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ مثلاً توت کے درخت ان علاقہ جات میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ایک تو توت کی بے شمار قسمیں یہاں پائی جاتی ہیں جیسے کِنی شتو (کالی توت) شِیِ شتو (سفید توت) کئی مروح (پیوند شدہ کالی توت) لکشر (سفیدی مائل پیوند شدہ توت) کشری مروح (گہرے سرخ رنگ کی پیوند شدہ توت) بِدنہ (بے دانہ سفید اور سرخی مائل توت) دوسری بات یہ کہ یہ توت لوگوں کی خوراک کا بڑا ذریعہ رہی ہیں۔ خوراک کا ذخیرہ ختم ہو جانے کی صورت میں لوگ توت اور خشک خوبانی پر گزر بسر کرتے تھے۔

اس طرح خوبانی کی بے شمار قسمیں شمالی علاقہ جات میں پائی جاتی ہیں اور ان کا شمار یہاں کے مشہور میوہ جات میں ہوتا ہے۔ گذشتہ کئی برسوں سے خوبانی کا پھل کیمیکل سے محفوظ کرکے بر آمد کیا جاتا ہے۔ خوبانی کی گری سے تیل بھی نکالا جاتا ہے۔ توت اور خوبانی کے علاوہ ناشپاتی، انار، اخروٹ، انجیر، آلوچہ بادام، انار اور آلو بخارا کی یہاں بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں۔

شعر وادب:

ہر زمانے میں شعراء اور ادیبوں نے اپنی بساط کے مطابق اپنے زمانے کی تصویر کشی کی ہے اور حالات و مشاہدات کو ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں شعراء اور ادیبوں کا کوئی مستند ریکارڈ موجود نہیں مگر اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہاں شعراء حکمرانوں کی توصیف و تعریف میں اشعار قلم بند کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق شنا زبان کا قدیم ترین شاعر " دینل کھمیٹو " گزرا ہے۔ وہ ایک کاہن تھا جو مختلف پیشن گوئی کیا کرتا تھا۔ بعد کے زمانے میں شنا زبان کے شعراء نے مذہبی شاعری کی طرف توجہ دی اور حمد، دعا، مناجات، مرثیہ، مدح، نعت اور قصائد کہے۔ ان شعراء میں محمد رضا، صمد خان، وزیر احمد خان، اخوند مہربان اور خلیفہ رحمت ملنگ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فصلِ سوم

مشہور جھیلیں

شمالی علاقہ جات میں مختلف جگہوں پر ایسی خوبصورت اور حسین و جمیل جھیلیں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے سیاح حضرات دور دور سے آتے ہیں۔ ذیل میں چند ایسی مشہور جھیلوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں ۔

جھیل سیف الملوک:

جھیل سیف الملوک ضلع مانسہرہ کی مشہور اور شمالی علاقہ جات کی خوب صورت ترین جھیلوں میں سے ایک ہے۔ یہ جھیل وادیٔ کاغان کے شمالی حصے میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی تقریباً ۳۲۴۴ میٹر ہے۔ یہ جھیل، اس علاقے کے مشہور افسانوی کردار سیف الملک کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر ایک فارسی شہزادے سیف الملوک اور ایک پری بدیع الجمال کی محبت کا قصہ مشہور ہے جس کی وجہ سے یہ جھیل اُن کے نام سے موسوم ہو گیا۔

لولوسر جھیل:

لولوسر جھیل قصبہ ناران سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر وادیٔ کاغان اور کوہستان کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ جھیل سطح سمندر سے ۳۳۵۳ میٹر بلند ہے۔ لولوسر دراصل بلند و بالا پہاڑوں اور جھیل کے مجموعے کا نام ہے۔ جھیل لولوسر کا پانی بالکل شیشے کی طرح صاف و شفاف نظر آتا ہے۔ جھیل لولوسر کا پانی وافر مقدار میں دریائے کنہار میں گرتا ہے جس کی وجہ سے دریائے کنہار اکثر و بیشتر انتہائی غضب ناک نظر آتا ہے۔

آنسو جھیل:

آنسو جھیل سطح سمندر سے ۱۶ ہزار میٹر بلندی پر واقع ہے۔ یہ جھیل وادیٔ کاغان، مانسہرہ میں واقع ہے۔ اس کی شکل چونکہ کسی آنکھ کی پتلی سے نکلنے والے آنسو کے قطرے جیسی لگتی ہے اس وجہ سے اس

جھیل کو آنسو جھیل کا نام دیا گیا ہے۔ آنسو جھیل کا شمار دنیا کی خوب صورت ترین جھیلوں میں ہوتا ہے۔اس جھیل تک جانے کا راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔

ست پارہ جھیل:

ست پارہ جھیل سنگلاخ چٹانوں میں گھری ہوئی انتہائی خوب صورت جھیل ہے۔اس کا پانی نہایت میٹھا ہے۔ سطح سمندر سے ۸۵۰۰ فٹ کی بلندی پر یہ جھیل واقع ہے۔ست پارہ دراصل بلتی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب 'سات دروازے' ہیں جس کی بنیاد ایک دیومالائی قصہ ہے۔اس جھیل کے مقام پر برسوں پہلے ایک گاؤں تھا ایک دن کوئی بزرگ فقیر کے بھیس میں اس بستی کے لوگوں کو آزمانے کے لیے آیا اور اُن سے کھانا طلب کیا۔ ایک بڑھیا کے علاوہ گاؤں کے کسی بھی فرد نے اُس بزرگ کی مدد نہ کی۔ بزرگ نے بد دعا دی جس کی وجہ سے پورا گاؤں اُلٹ گیا البتہ بڑھیا بچ گئی۔اس تباہ شدہ گاؤں کی جگہ پر پانی کا ایک چشمہ سا بن گیا جو بالآخر ایک بڑی جھیل کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

کرمبر جھیل:

کرمبر جھیل پاکستان کی دوسری بلند ترین جھیل ہے جبکہ دنیا کی ۱۳۱ویں بلند ترین جھیل ہے۔یہ جھیل خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان کے درمیان واقع ہے۔یہ جھیل حیاتیاتی طور پر بے حد فعال ہے۔ سطح سمندر سے ۱۴۱۲۱ فٹ بلند ہے۔ یہ تقریباً ۵۵ میٹر گہرا، ۴ کلو میٹر لمبا اور ۲ کلو میٹر چوڑا ہے۔ چترال سے ڈھائی سو کلو میٹر کی مسافت پر وادئ بروغل میں واقع ہے۔

اپر کچھورا جھیل اور لوئر کچھورا جھیل :

اپر کچھورا جھیل کا پانی نہایت شفاف نظر آتا ہے۔اس کی گہرائی تقریباً ۷۰ میٹر ہے۔ سردیوں میں اس جھیل کا پانی مکمل جم کر برف بن جاتا ہے۔لوئر کچھورا ا جھیل کو شنگریلا جھیل بھی کہا جاتا ہے۔اس کا شمار پاکستان کی دوسری خوب صورت ترین جھیلوں میں ہوتا ہے۔یہ اسکردو سے ۲۵ منٹ کی مسافت پر ہے۔ شنگریلا جھیل اصل میں شنگریلا ریسٹ ہاؤس کا ایک حصہ ہے۔

شندور جھیل:

شندور جھیل پولو گراؤنڈ سے متصل فطرت کا ایک حسین شاہکار لگتا ہے۔یہ جھیل تین میل لمبے اور ایک میل چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس جھیل کا پانی بظاہر ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے۔اس کا پانی زیر زمین راستہ بنا کر سولاسپور اور لنگر میں جا نکلتا ہے۔

رتّی گلی جھیل:

رتی گلی جھیل وادیٔ نیلم کے سر سبز اور بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان گھری جھیل ہے۔اس جھیل کے چاروں طرف انتہائی سر سبز میدان ہیں۔ سطح سمندر سے ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔رتی گلی جھیل کا نیلگوں پانی اور اس کے کناروں پر جمی برف دیکھنے والوں پر سحر طاری کرتی ہے۔

رش جھیل:

رش جھیل، رش پری نامی چوٹی کے قریب ۵۰۹۸ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔یہ دنیا کی ۲۵ ویں بلند ترین چوٹی پر واقع ہے جبکہ پاکستان کی بلند ترین جھیل ہے۔یہاں تک پہنچنے کے لیے نگر اور ہیسپر گلیشیئرز کے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

غوراشی جھیل:

غوراشی جھیل بلتستان کی وادیٔ کھرمنگ میں واقع ہے۔ یہ جھیل دشوار گزار پہاڑیوں میں گھری ہوئی ہے۔ اس کی گہرائی ۸۰ میٹر تک بتائی جاتی ہے۔اس جھیل کے گرد و پیش میں جنگلی خوبانیوں کے باغات ہیں۔

شیوسر جھیل:

یہ جھیل گلگت بلتستان کے دیوسائی قومی پارک میں واقع ہے۔۴۱۴۲ میٹر کی بلندی پر سطح مرتفع تبت کے سر سبز میدانوں میں شیوسر جھیل اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔اس جھیل کا شمار بھی دنیا کی بلند ترین جھیلوں میں ہوتا ہے۔اس کی گہرائی ۴۰ میٹر، لمبائی ۲۰۳ کلو میٹر اور چوڑائی تقریباً ۲ کلو میٹر ہے۔

پہاڑی سلسلے، سطح مرتفع

پاکستان کے شمالی خطوں میں دنیا کے تین مشہور پہاڑی سلسلے ہمالیہ ، قراقرم اور ہندوکش واقع ہیں۔ان علاقہ جات کے انتہائی شمال میں دنیا کا بلند ترین سطح مرتفع پامیر ہے جسے بامِ دنیا یعنی ’ دنیا کی چھت‘ کہا جاتا ہے۔سابق وائسرائے ہند لارڈ کرزن ۱۸۹۴ء میں براستہ بروغل چترال میں داخل ہوئے تھے۔وہ ترچ میر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ ’ یہ پہاڑوں کا شہنشاہ‘ ہے جو ۲۵۵۰۰ فٹ اونچا ہے۔دوسرا بلند ترین سطح مرتفع ’ دیوسائی‘ ہے۔

مشہور چوٹیاں

پاکستان کے شمالی خطوں میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں واقع ہیں جن میں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو ہے جس کی بلندی ۸۶۱۱ میٹر یعنی ۲۸۲۵۱ فٹ ہے۔ دنیا کی نویں نمبر بلند ترین چوٹی نانگا پربت ہے جس کی اونچائی ۲۶۶۵۶ فٹ ہے ۔ گیارہویں بلند ترین چوٹی گشر برم ہے جو ۲۸۸۰۸ فٹ بلند ہے۔ بارہویں بلند ترین چوٹی بروٹ پیک ہے جو ۲۶۴۰۰ فٹ اونچی ہے۔ گشر برم دوم اور چہارم تیرہویں اور چودھویں نمبر پر ہے دنیا کی ستائیسویں بلند ترین چوٹی راکاپوشی ہے جس کی اونچائی ۲۵۵۵۰ فٹ ہے۔ ضلع گلگت میں سب سے اونچی چوٹی دستاغل سر ہے جس کی اونچائی ۷۸۸۵ میٹر ہے جو کہ پاکستان میں ساتویں اونچی چوٹی ہے جبکہ دنیا میں بلندی کے لحاظ سے انیسویں نمبر ہے۔

مشہور گلیشیئرز

گلیشیئر اصل میں وہ برفانی تودہ ہوتا ہے جو کوہستانی علاقوں میں تہہ در تہہ برف جم جانے سے بنتا ہے چونکہ اس کی نچلی تہہ کو حرارت کم ملتی ہے اس وجہ سے اس کی تہہ نہایت سخت ہو جاتی ہے نتیجتاً سردیوں میں برف کا یہ تودہ اپنی جگہ مضبوطی سے جما رہتا ہے۔ گرمیوں میں جب درجہ حرارت بڑھ جاتی ہے تو یہ تودہ یا گلیشئرز بھی پگھلنا شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے دریاؤں میں پانی کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ گلیشیئرز سے جہاں پانی کی کمی پوری ہو جایا کرتی ہے وہاں بعض اوقات اس کی وجہ سے حادثات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ گلیشئرز کے بڑے بڑے تودے سرک جانے سے آبادی پر گر جاتے ہیں جس کی وجہ سے پوری پوری بستیاں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ اس علاوہ ان سے زرعی زمینوں کو بھی خاص نقصان پہنچ جاتا ہے۔

شمالی علاقہ جات میں قطبین کے علاوہ دنیا کا سب سے بڑے گلیشیئر کا ذخیرہ موجود ہے۔ ان میں بطور خاص قطبین سے باہر کی دنیا کا سب سے بڑا گلیشیئر سیاچن ہے جس کی لمبائی ۷۲ کلو میٹر ہے۔ ہسپر گلیشیئر کی لمبائی ۶۱ کلو میٹر، بیافو گلیشیئر ۶۰ کلو میٹر، بلتورو گلیشئر بھی ۶۰ کلو میٹر جبکہ بالتورہ گلیشیئر ۶۴ کلو میٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔

مشہور درّے

پہاڑوں کے بیچ میں تنگ سے تنگ راستے کو درہ کہتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں بہت سے مشہور ڈرّے بھی پائے جاتے ہیں ۔ جن میں بابوسر، برزل اور قمری دیامر میں پائے جاتے ہیں۔ قراقرم، مستاغ، چھوربٹ، مستاغ، سلتورو، برالڈو اور باشہ بلتستان میں ہیں جبکہ خنجراب، شمشال، ہیاسپر کلک اور ارشاد گلگت میں پائے جاتے ہیں۔ ضلع غذر کے قرمبر، درکوٹ، بروغل اور شندور کے درے بھی اپنی جغرافیائی اہمیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔	”نانگاپربت کے حضور میں“	اجمل سعید پراچہ	ص:۲۸
۲۔	ایضاً		ص:۳۱
۳۔	”شندور کی کالی جھیل“ ،	شمیم حسن خان	ص:۲۶
۴۔	پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا ایگزیکٹیو ایڈیٹر: عکسی مفتی		ص:۲۷
۵۔	”نانگاپربت کے حضور میں“،	اجمل سعید پراچہ	ص:۱۴۔۱۵
۶۔	شاہراہ قراقرم، انٹرنیٹ، آزاد دائرۃ المعارف، وکی پیڈیا۔		ص:۳۲۴
۷۔	بلتستان کا جغرافیہ، انٹرنیٹ، آزاد دائرۃ المعارف، وکی پیڈیا۔		ص:۱۵۷
۸۔	ایضاً		ص: ۳۳۵
۹۔	”نانگاپربت کے حضور میں“ ،	اجمل سعید پراچہ	ص:۴۱
۱۰۔	ایضاً		ص:۱۰۵
۱۱۔	ایضاً		ص:۱۰۶
۱۲۔	ایضاً		ص:۷۷
۱۳۔	”شندور کی کالی جھیل“ ،	شمیم حسن خان	ص:۳۲

باب چہارم

مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری

فصلِ اوّل

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا تعارف

مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری کا آغاز یورپ کی سیر وسیاحت سے ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ برطانیہ میں تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ اس دوران اس نے ماسکو میں منعقدہ ایک یوتھ فیسٹیول میں شرکت کی۔ واپسی پر اس نے " نکلے تیری تلاش میں " کی صورت میں اپنا پہلا سفر نامہ لکھا جس کو قارئین کی طرف سے بے حد پذیرائی ملی۔ حوصلہ افزائی ملتے ہی مستنصر حسین تارڑ کا قلم رواں دواں ہو گیا اور اس نے اگلا سفر نامہ "اندلس میں اجنبی" کے نام سے لکھ ڈالا۔ یہ سفر نامہ بھی قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ناقدین نے مستنصر حسین تارڑ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ قارئین و ناقدین کی جانب سے مثبت پیش رفت دیکھ کر مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ پر سفر نامہ لکھتے چلے گئے اور لوگ اسے پسند کرتے گئے۔ دراصل مستنصر حسین تارڑ کا اندازِ نگارش اتنا دلچسپ، پر مزاح اور شگفتہ ہے کہ قاری اس کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

علی اصغر عباس مستنصر کی ابتدائی زندگی کا احوال اُنھی کی زبانی لکھتے ہیں:

"ثانوی درجہ پاس کر کے تارڑ نے گورنمنٹ کالج میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں " رتّی گلی پیک" سر کر ڈالی۔ لڑکپن کی اس مہم جوئی نے اس کے اندر کے طالب علم کو آوارہ گرد بنا دیا جو انگلینڈ میں ٹیکسٹائل انجینئرنگ کا ڈپلومہ لینے گیا تو اپنا وقت گھومنے پھرنے، فلمیں دیکھنے اور تھیٹر سے لطف اندوز ہونے میں گزارنے لگا" اس نے بتایا" میں بنیادی طور پر داستان گو ہوں۔ بنجاروں کی طرح گھومتے پھرتے دنیا دیکھنے کی عادت نے مجھے بصارت اور بصیرت عطا کی۔ ۱۔

مستنصر نے اب تک کل تیس کے قریب سفر نامے لکھے ہیں جن میں سے بارہ سفر نامے صرف پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے بارے میں ہیں۔ پاکستان کی بلند ترین چوٹی "کے ٹو" کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ نے ایک شاہکار سفر نامہ لکھا ہے جس کی وجہ سے مستنصر حسین تارڑ کی مقبولیت کا گراف آسمان کو چھونے لگا۔ شمالی علاقہ جات سے گہرے تعلق اور دلی وابستگی کی بنا پر اس علاقے میں پائی جانے والی ایک جھیل کا نام مستنصر حسین تارڑ کے نام پر " تارڑ جھیل" رکھا گیا جو مستنصر حسین تارڑ

کے سفر ناموں کی مقبولیت کا ایک واضح ثبوت ہے۔"منہ وَل کعبہ شریف اور "غارِ حرا میں ایک رات" مستنصر حسین تارڑ کے وہ سفر نامے ہیں جس میں سر زمینِ حجاز کے سفر کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سفر ناموں میں مستنصر حسین تارڑ عقیدت و احترام کے آسمان پر جلوہ فگن نظر آتے ہیں اور یہ خالصتاً مذہبی سفر نامے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا باقاعدہ آغاز" نکلے تیری تلاش میں" سے ہوتا ہے۔ اس سفر نامے کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ۱۹۵۷ء میں روس میں ایک انٹر نیشنل یوتھ فیسٹیول منعقد ہو رہا تھا۔ دوسرے دوستوں کے ہمراہ مستنصر حسین تارڑ نے بھی اس میں شمولیت کے لیے فارم پُر کر کے بھیجا خوش قسمتی سے اُس کا انتخاب ہو گیا اور نوجوانوں کے ایک وفد کے ساتھ وہ روس چلا گیا۔ جب سفر سے واپس آئے تو"نوائے وقت" کے مدیر مجید نظامی صاحب نے مستنصر حسین تارڑ کو روس کا سفر نامہ لکھنے کی ترغیب دی جو اُن دنوں لندن میں اپنے اخبار کے نمائندہ تھے اور یوں مستنصر نے اپنے سفر کی روداد " قندیل" رسالے میں قسط وار چھاپنا شروع کیا۔ تاہم ابھی تک یہ سفر نامہ کتابی صورت میں منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ مستنصر نے اپنے ناول ' ' فاختہ " میں بھی اس سفر نامے کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ علی اصغر عباس مستنصر کی زبانی اس کا قصہ یوں لکھتے ہیں۔

> "لندن کی آوارہ گردیوں کے دنوں میں معلوم ہوا کہ روس میں ایک انٹر نیشنل یوتھ فیسٹیول ہو رہا ہے ، میں نے فارم پُر کر کے بھیج دیا۔ زبانوں کے علم کے خانوں میں انگریزی، اُردو، عربی، فارسی اور پنجابی کے اندراج نے مجھے نوجوانوں کے اس وفد میں شامل کرا دیا جو روس گیا۔۔۔ میں لندن سے واپس آیا تو نوائے وقت والے مجید نظامی نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ تم ایک ایسی دنیا دیکھ آئے ہو جس کے بارے میں جاننے کے لیے ہم بے تاب ہیں۔ تم اس سفر کی داستان لکھ ڈالو، میں نے غور سے سنا اور پھر" لندن سے ماسکو تک" کے نام سے مختصر سا سفر نامہ لکھا جو" قندیل" میں تین اقساط میں شائع ہوا یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے جیسے آوارہ گرد کو سفر نامہ نگار بنانے کا" گناہ یا سہرا" مجید نظامی صاحب کے سر ہے"۔ ۲؎

مستنصر نے باقاعدہ طور پر ۱۹۶۹ء میں لکھنا شروع کیا اور مارچ ۱۹۷۲ء میں مستنصر حسین تارڑ کا پہلا سفر نامہ "نکلے تیری تلاش میں" سیارہ ڈائجسٹ پبلی کیشنز شارع فاطمہ جناح لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ ۲۸ ابواب اور ۴۷۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سترہ ممالک کے سفر کا احوال درج ہے۔ اس سفر نامے کا محور مغربی زندگی اور اس کے ہنگامہ خیز شب و روز ہیں۔ اس سفر نامے کا نام علامہ اقبال کی ایک نظم "ذوق و شوق" کے ایک مصرعے سے ماخوذ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ خود اس بارے میں رقم طراز ہیں :

"بنیادی طور پر "نکلے تیری تلاش میں" میرے سفر ناموں کا آغاز بنی۔ یہ سترہ ملکوں کا سفر نامہ ہے۔ یہ عنوان بھی مجھے تلمیذ حقانی نے ہی تجویز کیا تھا۔ یہ علامہ اقبال کا مصرع ہے کہ

نکلے تری تلاش میں

قافلہ ہائے رنگ و بو

اور اس کو شفیق الرحمٰن نے **Approve** کیا تھا اور میں تو شفیق الرحمٰن کی "برساتی" سے اتنا متاثر ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ "برساتی" ہی "نکلے تیری تلاش میں" کی ماں ہے" ۳؎

مستنصر حسین تارڑ نے "نکلے تیری تلاش میں" لکھنے کے لیے خود کو جس طرح آمادہ کیا اور اس کا آغاز جس انداز میں کیا اس کی تفصیل اُنہوں نے ذیل میں لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"۱۹۶۹ء میں میرے اندر کے آوارہ گرد کو اچکل آئی اور میں ایک دن پیدل ہی خشکی کے راستے مختلف ملکوں کی سیر کو نکل پڑا۔ دو سال کی کھجل خواری کے بعد واپس لوٹا تو پھر دکان پر جا بیٹھا۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ جو کچھ دیکھ کر آیا ہوں اسے لکھ ہی لوں تو کیسا رہے۔ اُردو بازار گیا، تین چار بڑے بڑے رجسٹر لایا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ میری بنیادی طور پر دلچسپی تاریخ میں رہی ہے اس لیے جہاں گیا وہاں سے معلومات اکٹھی کر کے ڈائری میں لکھ لیا کرتا تھا۔ یہ بہت سی ڈائریاں آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔ تاریخ سے واقف تھا، جغرافیہ خود ناپ چکا تھا اس لیے لکھتے لکھتے رجسٹر بھر گئے تو دل میں خواہش اُبھری کہ اسے کہیں

چھپنا بھی چاہیئے ، تین چار رسالوں کو لکھا کہ میں نے ایک ایسی چیز لکھی ہے جو میرے نزدیک بالکل نئی اور انوکھی ہے مگر کہیں سے کوئی حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ مجبوراًخود شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ ابھی یہ پروگرام فائنل نہیں ہوا تھا کہ 'تلمیذ حقانی' صاحب سے ملاقات ہو گئی وہ سپین سے عشق کرتے تھے۔ اُندلس کے بارے میں جاننے کے اشتیاق نے اُنہیں مجھ سے ملوادیا۔ وہ مجھے " سیارہ ڈائجسٹ" کے دفتر لے گئے۔ مقبول جہانگیر سے ملاقات کرائی اور یوں " نکلے تیری تلاش میں" قسط وار چھپنا شروع ہوئی۔ اگر اس وقت " تلمیذ حقانی اور " مقبول جہانگیر" نہ ملتے تو میں آج جو کچھ ہوں شاید یہ نہ ہوتا۔" نکلے تیری تلاش میں" کتابی شکل میں شائع ہوئی تو اس کو بہت پذیرائی ملی۔ ۴۔

اُردو ادب میں سفر نامہ " نکلے تیری تلاش میں "کافی اہمیت کا حامل سفر نامہ ہے سفر نامے کے ایک باب " اپاہج وینس" میں ایک اپاہج لڑکی کی کہانی بیان ہوئی ہے جس کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ سفر نامے کا یہ باب " اپاہج وینس" ماسکو یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔ محمد خالد اختر اس سفر نامے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

""مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامہ " نکلے تیری تلاش میں" لکھ کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس پر تخیّل رومینٹک نوجوان نے یہ سفر نامہ لکھتے وقت مروّجہ ترکیب کو استعمال میں لانے کی پرواہ نہیں کی اور روایت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے اس کا سفر نامہ اپنے پیش روؤں سے کہیں زیادہ اور یجنل، دلچسپ اور اُجلا ہے۔ وہ جذبات نگاری یا ارغوانی ٹکڑے ٹانکنے سے نہیں ڈرتا اور اس کا مچلتا ہوا جوشیلا پن نو عمری کی رومانی انداز اور مکمل بھولپن پڑھنے والے کو اپنے دام میں لے لیتے ہیں"۔ ۵۔

مستنصر نے مقامی، مذہبی، مشرقی اور مغربی مختلف النوع سفر نامے لکھے ہیں اور اس میں ہمیشہ ایسے موضوعات کو چھیڑا ہے جو ہر طبقے کے لوگوں کے مزاج، نفسیات اور جذبات

پر پر پورا اُترے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ مستنصر ہر دور میں عوام وخواص میں مقبول رہا ہے۔ذوالفقار احسن مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

""مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے قارئین بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس میں بارہ مصالحوں کی چاٹ شامل کر دیتے ہیں۔ وہ شاید جانتے ہیں کہ قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے، آج کے قاری کی یہی خواہش ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے سیر بھی کرلی جائے اور جنس کے حوالے سے چٹخارے دار باتوں سے اس کی ذہنی عیاشی بھی ہو جائے گویا مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں"۔ ۶؎

مستنصر حسین تارڑ کا دوسرا سفر نامہ اُندلس میں اجنبی" ہے۔یہ سفر نامہ ۳۲۰صفحات اور ۲۴ ابواب پر مشتمل ہے جس کی اولین اشاعت سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۷۵ء میں کی۔اُندلس کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا جذباتی اور نظریاتی رشتہ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس سفر نامے میں تاریخی حقائق کوا یسے شاندار انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری تا دیر اس کے سحر میں کھویا رہتا ہے۔اس بارے میں عظیم شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

""اُندلس میں اجنبی" اس لیے لحاظ سے بھی ایک اہم سفر نامہ بلکہ ادب پارہ ہے کہ اس نے مستنصر کے تدریجی فنی ارتقاء کا ایک ثبوت بہم پہنچایا ہے۔" نکلے تیری تلاش میں" سے لے کر اب تک مستنصر کا مطالعہ کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔" نکلے تیری تلاش میں" ، ""اُندلس میں اجنبی" تک آپہنچا ہے جس کے ادبی اور فنی معیاروں پر جو شک کرے وہ کافر ہے۔اُردو ادب اس ایک کتاب کی اشاعت سے کتنا امیر سا ہو گیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ اب مستنصر خوب تر کے بعد خوب ترین کی تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔ ۷؎

مستنصر حسین تارڑ خود اس سفر نامے کو لکھتے ہوئے جذبات کے سمندر میں غوطہ زن ہے۔وہ چشم تصور سے اُس اُندلس کو دیکھ رہا ہے جب اس پر اسلامی پرچم سایہ فگن تھا۔ آج بھی جب کوئی اس شہر

کی سیر کرنے جاتا ہے تو اُنھیں مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور اُن کے عہدِ زریں کی نشانیاں ضرور ملتی ہیں۔ مستنصر اس سفر کے بارے میں یوں گویا ہیں :

> ''اُندلس تاریخی اور جذباتی اعتبار سے اتنا اہم ہے کہ وہ دس بیس صفحوں میں نہیں سما سکتا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کو ایک مختلف روپ دوں۔ یہ کتاب پڑھ کر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لوگ اُندلس گئے ہیں اور ایک ایک چپہ دیکھا ہے۔ اب بھی مجھے کبھی نہ کبھی اُندلس کے شہر سے ٹیلی فون آجاتا ہے کہ تارڑ صاحب میں آپ کی کتاب پڑھ کر فلاں جگہ کھڑا ہوں اور آپ کی یہ لائنیں پڑھ رہا ہوں۔ اس کتاب کا کم از کم اثر ضرور ہوا کہ کم از کم پاکستانیوں کو یا مسلمانوں کو اپنے زریں عہد کی آگاہی پہنچی۔ ۸۔

''اُندلس میں اجنبی'' کے بعد جو سفر نامہ منظر عام پر آیا وہ ''خانہ بدوش'' ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہ سفر ۱۹۷۵ء میں کیا تھا جبکہ سفر نامے کی اشاعت ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔ اس میں موجود ابواب کی تعداد ۲۷ ہے۔

سفر نامہ '' ہنزہ داستان'' سے مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۹۸۴ء میں سنگ میل پبلی کیشن لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں کل ۱۸ ابواب دیے گئے ہیں۔ یہ سفر نامہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی ہے۔ بیانیہ رنگ نے اس سفر نامے کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس سفر نامے میں مقامی رنگ نمایاں ہے۔

شمالی علاقہ جات پر لکھا گیا سفر نامہ '' سفر شمال کے'' مستنصر حسین تارڑ کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ اس سفر میں اُس کی رفیقہ حیات اور اُس کے تین بچے بھی ہمراہ تھے۔ یہ سفر نامہ '' ہنزہ داستان'' کے بعد شائع ہوا۔ اس سفر نامے کو مستنصر حسین تارڑ نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سوات کے سفر کی روداد ہے اور دوسرے حصے میں خنجراب کے سفر کا احوال ہے۔ سفر سوات کا ۱۱ ابواب اور سفر خنجراب کا ۱۴ ابواب کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ اندازِ بیاں دلچسپ اور قاری کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ ہنزہ داستان کی بے شمار باتوں کا اس سفر نامے میں تکرار بھی موجود ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ ''نانگا پربت'' ۱۹۹۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ اس میں سفر نامہ نگار نے تین سفروں کو یکجا کر کے '' نانگا پربت'' کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس

میں بلتستان کا سفر بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ”نانگا پربت“ کی ادبی اہمیت اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ اکادمی ادبیات کی جانب سے اسے بہترین ادبی کتاب کا درجہ ملا ہے اور اسے بابائے اُردو ” ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایوارڈ “ دیا گیا ہے۔ یہ سفر نامہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ” پہلا سفر “ کے عنوان سے لکھا ہے جس میں ۱۲ ذیلی موضوعات میں سفر کا احوال موجود ہے۔ دوسرا حصہ ”دوسرا سفر“ ہے جس میں ۱۵ ذیلی موضوعات جبکہ تیسرا حصہ ” تیسرا سفر “ کے نام سے ہے جس میں ۳ ذیلی موضوعات میں سفر کا احوال موجود ہے۔

”کے ٹو“ مستنصر حسین تارڑ کا وہ شاہکار سفر نامہ ہے جس کی تقریب رونمائی کے ٹو کی چوٹی پر جہاز میں ہوئی۔ یہ سفر ۱۹۹۳ء میں کیا گیا اور کتابی صورت میں یہ سفر نامہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ۴۲۹ صفحات پر مشتمل کافی ضخیم سفر نامہ ہے جس میں ۴۳ ابواب کے تحت سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔

سفر نامہ ” چترال داستان“ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اسے بھی دوسرے سفر ناموں کی طرح سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ اس میں مستنصر حسین تارڑ نے گلگت، وادی گوپس، وادی بھنڈر، درہ شیندور، چترال اور کافرستان کے علاقوں کے سفر کی کہانی بیان کی ہے۔ اس سفر نامے کے تین باب ہیں۔ پہلے باب میں ۱۱ عنوانات ہیں۔ دوسرا باب ” چترال“ کے نام سے ہے جس میں ۱۳ عنوانات ہیں۔ تیسرا باب ”کافرستان“ کے نام سے ہے جس میں ۱۴ عنوانات موجود ہیں۔ اس باب میں ایک سٹیج ڈرامے کو موضوع سخن بنایا گیا ہے جس میں ڈرامے کی تکنیک واضح طور پر نظر آتی ہے جبکہ باقی ابواب میں بیانیہ رنگ موجود ہے۔

سفر نامہ ” یاک سرائے“ کا مرکزی خیال 'موت' ہے جس کے گرد پورا سفر نامہ گھومتا ہے اور جو ہر وقت سفر نامہ نگار کے اعصاب پر سوار نظر آتی ہے۔ یاک سرائے بھی ۴۴۸ صفحات کا کافی ضخیم سفر نامہ ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۹۷ء میں اسے شائع کیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہ سفر ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۷ء کے درمیان کیا تھا۔ یہ سفر نامہ ۴۴ ابواب کے تحت پایہ تکمیل تک پہنچا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ ۱۹۸۹ء میں نیپال کی سیاحت پر گئے تھے جس کی روداد ” نیپال نگری“ کے نام سے سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی۔ اس سفر نامے میں ۲۱ ابواب دیے گئے ہیں اور اس

کے کل صفحات ۳۴۸ ہیں۔ گندھارا کے مہاتما بدھ کے نام اس کتاب کو منسوب کیا گیا ہے۔ اس سفر نامے میں مستنصر حسین تارڑ نے نہ صرف نیپال کے قدیم تہذیب پر روشنی ڈالی ہے بلکہ نیپال کے تاریخی ورثے کا بیان بڑی دلچسپی اور معلوماتی انداز میں کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی شمالی علاقہ جات سے فطری محبت کی ایک اور مثال " شمشال بے مثال " کی صورت میں موجود ہے۔ اس کا انتساب " پیارے افضال احمد کے نام " ہے۔ ۱۳۷ ابواب پر مشتمل یہ سفر نامہ ۲۳۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جسے سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۲ء میں چھاپا ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ مستنصر حسین تارڑ کا ایک ضخیم ترین سفر نامہ " سنولیک " ہے جس میں ' بیافو، ہیسپر۔ دنیا کے طویل ترین برفانی راستے کی سفری روداد بیان کی گئی ہے۔ انتساب " تلمیذ حقّانی " کے نام ہے۔ ۶۳ ابواب اور ۵۰۴ صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ قارئین کے پیش خدمت ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۰ء میں اسے شائع کیا ہے۔

چین کے بارے میں بے شمار لوگوں نے بہت دلچسپ اور معلوماتی سفر نامے لکھے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی " پتلی پیکنگ کی " کی صورت میں سفر نامہ لکھ کر ایک کوشش کی ہے اور اس کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی ہے۔ اب تک چین پر لکھے جانے والے سفر ناموں میں " پتلی پیکنگ کی " ایک شاندار اضافہ ہے۔ اس کا انتساب " عینی اور بلال " کے نام ہے۔ پہلے اُسے ۹ ابواب میں تقسیم کیا ہے پھر ہر باب میں بے شمار ذیلی عنوانات دیے گئے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے چین کا سفر ۲۰۰۳ء میں کیا تھا جبکہ اس سفر نامہ کی اشاعت سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۹ء میں کی۔ یہ سفر نامہ کل ۴۳۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

"سنہری اُلو کا شہر" ہندوستان کا سفر نامہ ہے جس میں مستنصر حسین تارڑ نے قدیم دلّی اور جدید دہلی کا موازنہ کر کے ان کی تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ سفر نامہ ۳۳ ابواب اور ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے اسے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا تھا۔

روایت سے ہٹ کر" منہ وَل کعبہ شریف" سفرنامۂ حج لکھ کر مستنصر حسین تارڑ نے بہت سے ناقدین کا منہ بند کردیا جو اس کے متعلق یہ رائے زنی کرتے نہیں تھکتے تھے کہ مستنصر کا قلم جنسیت سے آگے اور کوئی چیز نہیں دیکھتا۔ عشق و عقیدت کے جذبات سے مملو یہ سفرنامہ بہت سے قارئین کو جذباتی بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس سفرنامے کی وجہ تسمیہ خود مستنصر نے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس کا نام" منہ وَل کعبہ شریف" ہے کیونکہ نانی جان نے مجھے نماز سکھائی تھی تو کہا تھا کہ بیٹا! نیت ہمیشہ پنجابی میں کرتے ہیں، اپنی مادری زبان میں کرتے ہیں، تو میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں تو" منہ وَل کعبے شریف" ہوتا ہے۔ ۹

یہ سفرنامہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔ سفرنامہ تو مکمل اُردو زبان میں ہے مگر اُس کا نام پنجابی زبان میں رکھا گیا ہے جس کا ذکر خود مستنصر نے درج بالا کیا ہے۔

"منہ وَل کعبہ شریف" کے ساتھ مستنصر حسین تارڑ نے" غار حرا میں ایک رات" کے نام سے ایک دوسری کتاب لکھی تھی جس میں اُنھوں نے غارِ حرا میں اپنی گزری ہوئی رات اور اپنے قلبی و ذہنی واردات اور جذبات و احساسات کو سپرد قلم کر کے قارئین کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۸ ابواب میں منقسم ہے اور ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۴ء میں اسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔

مستنصر خود اس بارے میں رقم طراز ہیں:

"منہ وَل کعبے شریف کے ساتھ ہی میری ایک کتاب" غارِ حرا میں ایک رات" آرہی ہے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا بلکہ اس سلسلے میں مَیں نے بہت پلاننگ کی تھی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں غارِ حرا میں ایک رات گزاروں اور جب موقع مل گیا تو یہ اعزاز بھی مل گیا۔۔۔ چنانچہ غارِ حرا میرے لیے بہت زیادہ اہم تھی

اور وہاں پر میں نے جو وقت گزارا اس میں مَیں نے اپنے انداز سے مشاہدے کئے۔
میرے ساتھ کوئی انوکھے واقعات تو نہیں ہوئے لیکن یہ اتنی شاندار جگہ ہے کہ اگر
ممتاز مفتی جیسا کوئی خلاّق شخص ہوتا تو وہ جانے کیا کیا کرتا۔ ۱۰؎

مستنصر حسین تارڑ کا شمالی علاقہ جات سے متعلق ایک اور سفر نامہ " برفیلی بلندیاں " ہیں۔ اس سفر نامے میں دراصل مستنصر کے دو سفروں کا احوال ہے۔ پہلے سفر میں ' فیئری میڈو، نلتر اور پکھورا ٹریک کی سیر کا تذکرہ ہے جبکہ دوسرے سیر میں درّہ گندو گورا اور لیلےٰ پیک ٹریک کا بیان ہوا ہے۔ ۴۴۰ صفحات کا کافی ضخیم سفر نامہ ہے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۴ء میں اس کی اشاعت کی۔

سفر نامہ " رتّی گلی " میں وادیٔ کاغان اور آزاد کشمیر کے سفر کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ ابتدا میں بلھے شاہ کا شعر بھی لکھا ہوا ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۵۶ ہے۔ ۴۰ عنوانات سمیت یہ سفر نامہ مختلف ابواب میں منقسم ہے۔ پہلی بار ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا اور اسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا تھا۔

مصنف نے روس کی سیر و سیاحت کو کتابی شکل میں لکھ ڈالا اور " ماسکو کی سفید راتیں " کے عنوان یہ سفر نامہ ۲۰۰۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ یہ سفر نامہ ۲۹ ابواب اور ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرے سفر نامہ نگاروں کی طرح مستنصر حسین تارڑ نے بھی امریکہ کی سیر و سیاحت کی ہے بلکہ اپنے تجربات و مشاہدات کو "نیویارک کے سو رنگ" کے نام سے شائع بھی کیا۔ یہ سفر نامہ ۲۰۰۹ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے چھاپا۔ اس میں ۶۳۸ صفحات اور ۱۳۸ ابواب ہیں۔

"الاسکا ہائے وے" مستنصر حسین تارڑ کا کینیڈا اور امریکہ کی سیاحت کی سفری روداد ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس میں ایک پرندے کونج کو اپنا ہم سفر بنا کر اس سفر نامے کو دلچسپ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس میں ۲۷ ابواب اور ۳۰۴ صفحات ہیں۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۱۱ء میں اسے چھاپا۔

مستنصر حسین تارڑ نے ہالینڈ کا سفر نامہ " ہیلو ہالینڈ" کے نام سے لکھا۔ ۲۰۱۱ میں یہ شائع ہوا۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے اس کی اشاعت کے فرائض سر انجام دیے۔ یہ ۲۲۴ صفحات اور ۳۳ ابواب پر مشتمل سفر نامہ ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے " کالاش" کے نام سے ایک ڈرامائی سفر نامہ بھی لکھا ہے جو اردو کے سفری ادب میں ایک خوشگوار اور نیا اضافہ ہے۔ یہ وادیٔ کافرستان کا سفر نامہ ہے جو ڈرامہ کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ کل صفحات ۳۵۲ ہیں۔ سنگ میل پبلی کیشنز نے اُسے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا ہے۔ اس ڈرامائی سفر نامے میں ' ذیشان، بشارا خان، سلمان، ارمان شاہ، نواز، بشیر، اظہار اور گوگی پیر کے نام سے کل آٹھ کردار ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے " دیو سائی" کے نام سے ایک سفر نامہ لکھا ہے جو ۲۰۰۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے " لاہور سے یار قند تک "۲۰۱۳ء میں شائع ہوا ہے اور " آسٹریلیا آوار گی" ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا ہے اور انھیں بھی سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے چھاپا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ۲۰۱۵ء میں شائع ہونے والا سفر نامہ " راکاپوشی نگر" ہے۔ ۲۳۲ صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ محیر العقول واقعات اور مناظر سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں سفر نامہ نگار کے گزشتہ تجربات کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ کا تاحال کوئی اور سفر نامہ منظر عام پر نہیں آیا۔

حوالہ جات

۱۔ 'سنڈے پاکستان' ، علی اصغر عباس، ۷مارچ ۱۹۹۹ء ص:۱۲

۲۔ ایضاً ص:۱۲

۳۔ 'نکلے تیری تلاش میں' عالمی فروغ اُردو ادب ایوارڈ، مشمولہ خالد اختر ۲۰۰۳ء

۴۔ 'سنڈے پاکستان' ، مستنصر حسین تارڑ، ۷مارچ ۱۹۹۹ ص:۱۳

۵۔ ایضاً ص:۱۳

۶۔ ہفت روزہ عزم، مشمولہ مستنصر حسین تارڑ سے خصوصی انٹریو، ۳۰جولائی تا۵/اگست ۲۰۰۶ ص:۲۰

۷۔ ایضاً ص: ۲۰

۸۔ ماہنامہ بیاض لاہور، احمد ندیم قاسمی، اُندلس میں اجنبی، شمارہ ۱۱ ص: ۷۰

۹۔ ہفت روزہ عزم، مستنصر حسین تارڑ سے خصوصی انٹرویو، ۲۰۰۶ء ص:۲۵

۱۰۔ ایضاً ص:۲۵

فصل دوم

مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا فکری جائزہ

تاریخی اور جغرافیائی معلومات

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں کا آغاز مغرب سے کیا۔ کچھ تو آوارگی کا جوش و جنون تھا اور کچھ مغرب کی ظاہری چمک دمک اور جھلملاتی روشنیوں کا اثر تھا جس نے مستنصر حسین تارڑ کو ایسا مسحور کیا کہ وہ قلم اُٹھانے پر مجبور ہوا۔ " نکلے تیری تلاش میں " اور اُندلس میں اجنبی " سے فنِ سفر نامہ نگاری کو ایک ایسی جہت اور ایک ایسی منزل سے عطا کی جس نے اُردو سفر نامے کو معراج پر پہنچادیا۔ چٹخارے دار زبان، رنگینیٔ بیان، حسِ مزاح، نفسیاتی رنگ اور مشاہدات کی گہرائی نے مستنصر کی تحریر میں ایسا اثر پیدا کیا کہ وہ لکھتا چلا گیا اور لوگ پڑھتے چلے گئے۔ مستنصر نے صرف مغرب کی جنسی بے اعتدالیوں کی تصاویر نہیں دکھائیں بلکہ مغرب کی کھوکھلی معاشرت کو بے نقاب کر کے اُس کا چہرہ سب کے سامنے عیاں کر دیا ہے۔ مستنصر کا یہ مشقِ سفر جاری تھا کہ اچانک اُس کا رخ مغرب سے مشرق کی جانب ہو گیا اور اُنھیں اپنے وطن کے شمالی علاقہ جات کے حسین مناظر میں بے پناہ کشش محسوس ہوئی جس کا اظہار اُنھوں نے شمالی علاقہ جات کے اولین سفر نامے "ہنزہ داستان" میں کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> "(لندن میں) سِنے راما تھیٹر کے سامنے سے گذرے تو فلم شروع ہونے کو تھی۔۔۔ تین پروجیکٹروں کی مدد سے ایک بہت بڑی سکرین پر دکھائی جانے والی اس فلم کا نام تھا 'Search for Paradise' ۔ پس منظر میں اُبھرتی آواز ہمیں بتاتی ہے کہ اس دنیا میں اب بھی ایسے خطے موجود ہیں جن پر اُس جنّت کا گماں ہوتا ہے جو حضرت آدمؑ سے چھِن گئی۔ پہلے حصے میں نیپال کے وہ علاقے دکھائے گئے جو ماؤنٹ ایورسٹ کے دامن میں واقع ہیں۔ دوسرا حصہ کشمیر کے مختلف مناظر سکرین پر لایا اور تیسرے حصے کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ تھیٹر میں نصب سپیکروں میں سے جیسے پر شور سیلاب بہنے لگے۔ سکرین پر ایک سمندر صفت دریا ہے جو چٹانوں میں گھِرا

ہوا سرپٹخ رہا ہے اور اُس کے اُبلتے پانیوں اور شوریدہ سر لہروں پر لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ایک رافٹ پر کیمرہ مین اپنی جان جھوکوں میں ڈالے ہوئے اُس دریا کی تُندی کی فلمبندی کر رہے ہیں۔

''خواتین وحضرات ہم ہنزہ جارہے ہیں''

''ہنزہ'' ؟۔۔ لنڈن کی کرسمس کی شام میں وادیٔ کاغان کی ڈھلوانوں پر سرسراتی گھاس کی مہک آئی اور شاید کہیں چہرے پر پھیلتی سردلبوں کے بسے ہوا تھی اور ایک پیکر درّہ بابوسر کی جانب اُٹھتے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔۔ تھیٹر میں بیٹھے ہوئے تماشائی ہنزہ سفر کر رہے تھے۔اُن کے ایک جانب پہاڑ تھے اور دوسری جانب دریائے ہنزہ تھا۔ ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہارے پاکستان میں ہنزہ ایسی وادی بھی ہے' ساؤتھ اینڈ واپس جاتے ہوئے ٹرین کی گرم آسودگی میں تھکی ہوئی جینس ہولے سے بولی '' مجھے خود پتہ ہوتا تو میں تمھیں بتاتا'' ۱۔

مستنصر حسین تارڑ کو'' اُندلس میں اجنبی'' کے لیے مواد کی تلاش تھے۔اس غرض سے وہ مختلف لائبریریوں میں گئے، وہاں بھی اُن کو' ہنزہ' کے بارے میں کتابیں دیکھنے کو ملیں۔اس بارے میں مستنصر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''پنجاب پبلک لائبریری کے نیم تاریک کمروں میں بوسیدہ کتابوں کی مدھم زرد باس میں سانس لیتے ہوئے میں سفرناموں کے شیلف پر جھک کر اُن کے ٹائٹل پڑھنے کی کوشش کرتا'' میں اُندلس میں اجنبی لکھ رہا تھا'' اور مجھے مسلمانوں کے عہد کے بارے میں تحقیقی مواد درکار تھا لیکن وہاں بھی ہنزہ تھا'' ہائی روڈ ٹو ہنزہ''۔'' ہنزہ دی لاسٹ کنگڈم،'' دی گلگت گیم''،ویئر ایمپائیز میٹ اور ہنزہ ۔۔۔۔آئن سٹفین کی ایک کتاب'' دی ہارنڈ مُون'' کا مطالعہ شروع کیا تو اُس میں سے بھی ہنزہ نکل آیا۔ ۲۔

یہی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مستنصر حسین تارڑ کا قلب و ذہن شمالی علاقہ جات کی سیاحت کی طرف مبذول ہوا اور اُنھیں ان علاقوں میں قدرتی نظاروں کی کشش محسوس ہوئی ورنہ تو لندن کی خمار

آلود آغوش میں محوِ خرام مستنصر حسین تارڑ کو اس بات کی خبر کہاں تھی کہ مغرب کی نیلی پیلی رنگین شاموں کے علاوہ بھی کہیں قدرت کے حسین و جمیل نظارے اُس کے اپنے مادرِ وطن پاکستان میں بھی موجود ہیں جنہیں دیکھنے کے لیے خود انگریز یورپ سے جوق در جوق آتے ہیں اور یہاں کے جادوئی نظارے اپنے کیمروں میں بند کر کے چلے جاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے شمالی علاقہ جات کے بارے میں جتنے بھی سفر نامے لکھے ہیں وہ سب کے سب نہ صرف اعلیٰ معیاری ادبی نثر پارے ہیں بلکہ ان سفر ناموں کو لکھتے ہوئے مستنصر کا قلم زیادہ رواں دواں اور بے باک نظر آتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہاں اُس کا اپنا گھر ہے، اُس کے اپنے ہم وطن ہیں، اُس کی اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت ہے اور اپنے محبوب دیس کے نظارے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں اُس نے لکھتے ہوئے نہایت فراخدلی سے کام لیا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے اور ایسا رنگ جمایا ہے کہ قارئین تو قارئین ادبی ماہرین بھی حیران ہیں کہ اس اکیلے شخص نے اپنے سفر ناموں کو کیسی کیسی جدت اور کیسے کیسے نئے رنگوں سے سجا کر رنگین بنا دیا ہے کہ ہر سو مستنصر چاچا کا ڈنکا بجتا سنائی دیتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے جب شمالی علاقہ جات کے حسن سے اپنی آنکھیں خیرہ کیں تو وہاں کے پہاڑوں، دریاؤں، جھرنوں، جھیلوں، بلندیوں، گہرائیوں، سبزہ زاروں اور قدرتی نظاروں سے ایسے مسحور ہوئے کہ اُس نے صرف " ہنزہ داستان " لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بشمول 'ہنزہ' کے اُنہوں نے کل بارہ سفر نامے لکھ ڈالے۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میں نے بارہ سفر نامے صرف پاکستان کے نادرن ایریاز پر لکھے کیونکہ میں تقریباً ہر سال Tracking کے لیے ایسے دور اُفتادہ علاقوں میں جاتا ہوں جہاں عام لوگ نہیں جاسکتے اور اُن کے بارے میں سفر نامے لکھتا ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پاکستان کے علاقوں کے بارے میں لکھے گئے سفر نامے بہت پاپولر ہوئے۔ میرے سفر نامے زیادہ تر پہاڑوں اور پتھروں کے بارے میں ہوتے ہیں"۔ ۳؎

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے محض سفر نامے نہیں اس میں تاریخ، جغرافیے اور سماج کے بارے میں ایسا مواد موجود ہوتا ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کیونکہ چھوٹے چھوٹے پیراگرف میں وہ تاریخ و جغرافیے کی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو بعض اوقات تاریخ کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی نہیں

ملتیں۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر منظر کو اور ہر مقام کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ عام باتوں میں خاص باتیں کر جاتے ہیں اور کبھی کبھی سنجیدہ اور خاص مواقع پر بالکل عام اور غیر سنجیدہ گفتگو شروع کرتے ہیں۔ اُن کے سب سفر ناموں میں یہ خوبی موجود ہے کہ مستنصر ہر گزرتے منظر کے ساتھ اس پر رواں تبصرہ کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اور جن مناظر کے بارے میں تبصرہ کناں ہیں وہ سب کچھ پہلے ہی اُن کا دیکھا بھالا ہے اس لیے وہ کہیں اٹکتے نہیں، کہیں پٹڑی سے اُترتے نہیں، کہیں قاری کو اپنے سحر سے نکلنے کا موقع نہیں دیتے۔ جو کچھ کہتے ہیں اپنے وجدان سے کہتے ہیں۔ ''ہنزہ داستان'' میں وہ شاہراہ ریشم کے بارے میں بعض تاریخی حقائق کا ذکر کر کے ایک عام قاری کو بھی ان معلومات میں شریک کر دیتے ہیں۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> ''شاہراہ ریشم جسے چینی شاہراہ دوستی کہتے ہیں عرفِ عام میں کے کے ایچ یعنی قراقرم ہائی وے کہلاتی ہے۔ پاکستان کے شہر حویلیاں سے شروع ہو کر آٹھ سو چار کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ترکستان کی سرحد درہ خنجراب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسے پندرہ ہزار پاکستانیوں اور دس ہزار چینیوں نے مشترکہ طور پر مکمل کیا۔ چٹانوں میں رستہ بنانے کے اس عمل میں فی کلو میٹر کم از کم ایک شخص ہلاک ہوا یعنی آٹھ سو چار انسانی جانوں کی قربانی سے آٹھ سو چار کلو میٹر طویل سڑک دنیا کے دشوار گزار ترین پہاڑی سلسلے میں سے وجود میں آئی۔ اس میں نناوے بڑے پل ہیں اور سترہ سو آٹھ چھوٹے پُل۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے مشہور ترین دریاؤں میں ایک یعنی انڈس بہتا چلا جاتا ہے۔ انڈس جسے اباسین اور شیر دریا کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے''۔ [۴]

شمالی علاقہ جات سرسبز وادیوں، جھلملاتی جھیلوں، برف پوش چوٹیوں، جھاگ اُڑاتے آبشاروں اور گنگناتے جھرنوں کی وجہ سے مشہور تو ہے ہی مگر اس کے کچھ علاقے تو اپنی بے مثال کشش اور رنگا رنگ نظاروں کی وجہ سے سیاحوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں۔ بالائی ہنزہ سے متصل گوجال میں واقع سر بفلک کوہساروں میں گھری وادیٔ شمشال اپنے فطری حسن و جمال اور دلآویزی کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ جس طرح یہ وادی اپنے حسن میں بے نظیر ہے اس طرح اس وادی کے باسی بھی محبت، رواداری اور جفاکشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ وادیٔ شمشال وادیٔ ہنزہ کے نزدیک پسو سے

۵۵ کلو میٹر دور مشرق کی جانب واقع ہے۔ یہ وادی سطح سمندر سے ۳۲۰۰ میٹر بلندی پر ہے۔ اس کا شمار پاکستان کی بلند ترین آبادیوں میں ہوتا ہے۔ شمشال میں سات ہزار میٹر سے بلند چار چوٹیاں ہیں جنھیں سر کرنے کے لیے سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ شمشال کی تاریخ قریباً ۴۰۰ سال پرانی ہے۔ یہاں کے لوگ واخی زبان بولتے ہیں۔ وادئ شمشال کی سرحدیں چین اور بلتستان سے ملتی ہیں۔ شمشال کی وجۂ شہرت یہاں پر جنم لینے والی کم عمر کوہ پیما ثمینہ بیگ ہے جس نے دنیا کی بلند ترین چوٹی کے ٹو سر کی اور پاکستان کی پہلی خاتون کوہ پیما ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ رجب شاہ اور مہربان شاہ کا تعلق بھی شمشال وادی سے ہے جنہوں نے پاکستان کی بلند ترین چوٹیوں کو سر کرنے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

"برفیلی وادیاں" مستنصر حسین تارڑ کا وہ سفر نامہ ہے جس میں اُنہوں نے اپنے دو مقامات کی سیاحت کی روداد بیان کی ہے۔ ایک سفر تو 'وادی نلتر اور پکھورا ٹریک کی طرف کیا ہے اور دوسرا سفر اُنہوں نے درہ گندوگور اور لیلےٰ پیک کا کیا ہے۔

گلگت سے صرف چالیس کلو میٹر کی مسافت پر وادئ نلتر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وادئ کے دو حصے ہیں ایک نلتر پائین اور دوسرا نلتر زیریں۔ نلتر پائین میں پاکستان ایئر فورس کا ایک بیس کیمپ ہے جہاں پر دیار کے گھنے جنگلات ایک حسین اور دلفریب منظر پیش کرتے ہیں۔ نلتر زیریں سے ایک کچے سڑک کے ذریعے نلتر پایاں تک راستہ جاتا ہے۔ یہ سطح سمندر سے تین ہزار کلو میٹر بلندی پر ہے۔ خوب صورت جھیلوں، گھنے جنگلوں اور آبشاروں کی موجودگی نے یہ علاقہ جنت نظیر بنایا ہے۔ نلتر میں تین جھیلیں ہیں اور شانی گلیشئر اور شابی بیس کیمپ ہے جن کو دیکھنے کے لیے سیاح دور دور سے آتے ہیں۔ یہیں سے ایک راستہ گلگت کی ایک مشہور وادی اشکومن کی طرف بھی جاتا ہے۔

پکھورا ٹریک انتہائی دشوار گزار اور پر خطر راستہ ہے۔ یہ راستہ سلسلہ ہائے ہندوکش کی پانچ ہزار تیس میٹر بلند چوٹی" سنوڈم کے پہلو سے گزرتے ہوئے گلگت کی وادئ نلتر کو نگر کی وادی دیانتر سے ملاتا ہے۔

درہ دندوگورو سطح سمندر سے ۵۵۸۵ میٹر بلندی پر واقع درہ ہے۔ یہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو سے جنوب کی جانب پچیس کلو میٹر کے فاصلے بلتستان میں واقع ہے۔ یہ درہ جنوب میں گندوگورو گلیشئر سے اور شمال میں وجنی گلیشئر سے جاملتا ہے۔ درہ گندوگورو جانے کے لیے بہت سے سیاح شمالی جانب سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ لیلےٰ پیک قراقرم پہاڑی سلسلے میں وادئ ہوشے میں گندوگورو

گلیشئر کے قریب واقع ہے۔ اس کی بلندی ۶۰۹۶ میٹر ہے۔ ۹/ اگست ۱۹۷۵ کو جاپان کے ہیکریو الپائن کلب نے اس چوٹی کو سر کیا تھا۔

سفر نامہ نگاری محض سفر کی روداد لکھنے کا نام نہیں اور نہ ہی یہ کسی جگہ کے حسن و جمال کے قصیدے لکھنے کا نام ہے۔ یہ ایک کثیر المطالعہ صنف ہے۔ اس صنف میں مہارت رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ سفر نامہ نگار کے پاس مختلف شعبوں کا علم ہو۔ اسے تاریخ سے آگاہی ہو، اُسے کسی خطے کی معاشرت، ثقافت، تمدن، رسوم و رواج، تہواروں اور مذہبی رسومات کا علم ہو، اسے اس خطے کا پورا جغرافیہ معلوم ہو۔ اُس کے پاس الفاظ و معلومات کا وسیع ذخیرہ ہو۔ اُس کے پاس حقائق تک پہنچنے کے تمام ذرائع موجود ہوں اور وہ اُن تمام ذرائعوں کا کماحقہٗ استعمال بھی جانتا ہو۔ وہ انسان شناس ہو، اُس کی معلومات سطحی نہ ہوں بلکہ وہ وسیع معلومات اور گہرے مشاہدے کا مالک ہو۔ اگر ان تمام نکات کا جائزہ لیا جائے تو مستنصر ان تمام شرائط پر کماحقہٗ پورا اُترتا ہے۔ اُس کے کسی بھی سفر نامے کا مطالعہ کیا جائے تو اُسے ان سفر ناموں میں متعلقہ خطے کے علاوہ دنیا بھر کی معلومات ملتی ہیں۔ ہزاروں واقعات اسے ازبر ہیں۔ تاریخ اور جغرافیے پر اس کی دسترس ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اُس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کتابی علم کے علاوہ عملی میدان میں رہ کر خود اس کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا ہر سفر نامہ گنجینۂ معنی اور گنجینۂ معلومات ہے۔ سفر نامہ "سنولیک" میں وہ دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے کہتا ہے:

> "اور یہاں ہیسپر گلیشیئر کے کناروں پر کنجوت سَر کی سفید ہیبت ایسی ہے جسے چھونے کی خواہش ہر کوہ نورد کے دل میں عشق کی مانند گھونسلے بناتی ہے ۔۔۔ یہی کنجوت سَر ہمارے سر پر تھی۔ ایک سفید گنبد کی طرح ۷۷۶۰ میٹر یا ۲۵,۴۶۰ فٹ بلند۔۔ یہ پہاڑ میرے دائیں جانب کھانی باسا گلیشیئر پر سے جھانک رہا تھا۔۔۔ کنجوت سر دنیا بھر میں ۲۹ ویں بلند ترین چوٹی ہے۔۔۔۔ کھانی باسا میں قیام کے دوران ہمیں کچھ خبر نہ ہوئی کہ یہ جو سامنے ایک برفانی دبدبہ آسمان کی نیلاہٹ کو بھی سفید کرتا ہے، یہ کنیانگ چش ہے ۔۔۔ اور دنیا کی ۲۲ ویں سب سے

سر بلند چوٹی ہے ۔۔۔۔ پاکستان میں کنیانگ چش ۔۔۔ نویں نمبر پر آتی ہے اور کنجوت سَر کی باری تیرھویں نمبر پر ہے۔" ۵۔

شمالی علاقہ جات وہ علاقے ہیں جو ایک زمانے میں کشمیر کے زیر نگیں تھے اور جس پر کشمیر کا ڈوگر سکھ راجہ زبردستی قابض تھا۔ جب پاکستان آزاد ہوا تو اس وقت بھی یہ علاقہ سکھ راجہ کے قبضے میں تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اس علاقے کے لوگوں نے مسلح جدوجہد کا سہارا لیا اور خود لڑ کر ڈوگرہ راجہ سے آزادی حاصل کی اور پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ تب سے یہ علاقہ شمالی علاقہ جات کہلایا جانے لگا۔ شمالی علاقہ جات کے غیور لوگوں نے صرف ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی خاطر بندوقیں نہیں اُٹھائیں بلکہ ۱۹۹۹ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان لڑی جانے والی کارگل جنگ میں بھی شمالی علاقہ جات کے جوانوں نے بھرپور حصہ لیا اور بھارت کو منہ توڑ جواب دیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی " شمشال بے مثال " میں ان لوگوں کی قربانیوں کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کی احساس محرومی کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ پاکستان کے ان محسنین کو ابھی تک اُن کی قربانیوں کا صلہ اس انداز میں نہیں ملا جیسا کہ اُن حق بنتا تھا۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> بریگیڈیئر اسلم، کرنل حسن خان اور کرنل احسان علی کے ہمراہ گروپ کیپٹن شاہ خان شمال کے ان ہیروز میں سے ہیں جنھوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف اکتوبر ۴۸ء میں علمِ بغاوت بلند کیا اور ایک بے مثال جدوجہد کے بعد ان علاقوں کو راجہ کے تسلط سے آزاد کروانے اور پھر انہیں پاکستان میں شامل کروانے میں کامیاب ہوگئے ، لیکن ہم نے اس کے لیے مسلح جدوجہد کی ، قربانیاں دیں اور تب جا کر اپنے آپ کو پاکستان کا ایک حصہ بنایا اور اس کے باوجود آج آپ پاکستانی ہیں اور ہم نہیں ہیں۔۔۔۔ ۶۔

کوہ کیلاش تبت میں واقع ہے۔ یہ تقریباً ۶۶۳۸ میٹر بلند پہاڑ ہے۔ اگرچہ اس پہاڑ کی اونچائی اتنی نہیں کہ کوئی اسے سر کرنے سے گبھراتا ہو تاہم اس کے باوجود آج تک کسی بھی کوہ پیمانے اسے سر نہیں کیا ہے۔ اصل میں یہ پہاڑ ہندوؤں اور بدھ مت کے ماننے والوں دونوں مذاہب کے پیروکاروں کے لیے انتہائی اہم اور تقدس و احترام کا حامل ہے۔ ہندوؤں کا اس پہاڑ کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ لارڈ شیوہ اس کی چوٹی پر بیٹھے عبادت میں مصروف ہیں جبکہ دوسری جانب بدھ مت کے پیروکاروں کا یہ عقیدہ ہے

کہ یہ پہاڑ ' خوشی کے بدھا ' کا گھر ہے یہی وجہ ہے کہ ہر سال یہاں ہندو اور بدھ زائرین کا ایک وسیع اجتماع ہوتا ہے۔ بے شمار لوگ ننگے پاؤں اس پہاڑ کے ارد گرد چکر لگاتے ہیں۔ بدھ مت کے عقیدت مندوں کا عقیدہ ہے کہ یہ پہاڑ صرف وہ لوگ سر کر سکتے ہیں جو گناہوں سے مکمل طور پر صاف ہوں۔ اس صورت میں برف سے اَٹے کٹھن راستے پر انہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ وہ پرندے کا روپ دھار کر اور اُڑ کر چوٹی پر خود بخود پہنچ جائیں گے۔

کوہ کیلاش کی طرح قارون کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ قارون کا نام قورح تھا اور یہ موسیٰؑ کا رشتہ دار تھا۔ انتہائی دولت مند اور امیر و کبیر شخص تھا۔ بظاہر نمازی اور متقی نظر آتا مگر بباطن انتہائی کمزور عقیدے کا مالک، انتہائی ظالم، موقع پرست اور حد درجہ کنجوس شخص تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں خدا پرست نہیں دولت پرست تھا۔ اس کے پاس بے تحاشا دولت تھی حتیٰ کہ اس کے محل کے در و دیوار سونے و جواہرات کے تھے اور اس کی سینکڑوں کنیزیں اور غلام تھے۔

ایک دن حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ دولت مندوں کو پیغام دیں کہ وہ غریبوں اور مستحقین کو اپنی دولت میں سے زکواۃ دیں۔ حضرت موسیٰؑ نے دوسرے دولت مندوں کے ساتھ ساتھ قارون کو بھی اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ یہ پیغام سن کر قارون سخت ناراض ہوا اور زکواۃ دینے سے انکاری ہوا۔ وہ حضرت موسیٰؑ سے دشمنی کرنے لگا اور اسے تنگ کرنے لگا جس پر موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اس لالچی اور ظالم انسان کو سزا دے دے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین میں زلزلہ آیا جس نے قارون کو اس کے خزانوں سمیت نگل لیا۔

مستنصر حسین تارڑ نے یہاں اپنے سفر نامے میں کوہ قارون کا ذکر کیا ہے اور اس پیراگراف سے چند جملے قبل دریا شمشال میں سونے کے ذرات کا ذکر کیا ہے اس سے ذہن لامحالہ قارون اور اس کے خزانے کی طرف جاتا ہے جو اللہ کے حکم سے خزانے سمیت زمین میں دھنس گئے تھے۔ بہر حال مستنصر حسین تارڑ نے صرف چند جملوں میں کوہ قارون اور کوہ کیلاش کا ذکر کر کے قاری کو تاریخ کا مطالعہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مستنصر کا کمال تو دیکھیئے کہ جہاں تاریخی حقائق کا تڑکا لگا کے قاری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کیا ہے وہاں اُس کی منظر نگاری نے ایسا جادو جگایا ہے کہ قاری دونوں پہاڑوں کو خود اپنی آنکھوں کے سامنے موجود محسوس کرتا ہے۔ ''شمشال بے مثال'' میں مستنصر حسین تارڑ کی تاریخ نویسی اور منظر نگاری ملاحظہ ہو:

> ''کوہ قارون ۔۔۔۔ ایک عجیب برفانی ڈھیر ایسی شکل کا پہاڑ تھا۔۔۔ تبت کے مقدس کوہ کیلاش سے بہت ملتا جلتا۔۔۔۔ جیسے آج تک کوئی بھی انسان اس کی قربت میں نہ پہنچا ہو۔۔۔۔۔ جیسے درّہ شمشال اور ان چٹانوں سے بہت پہلے یہ وجود میں آیا ہو۔ ایک لق ودق وسعت میں، ہموار وسعت میں لاکھوں برس تک تنہا کھڑا رہا اور پھر کسی جغرافیائی تغیر کی بنا پر اس کے آس پاس کی یہ چٹانیں اُبھرنے لگیں، بلندیاں نمودار ہوئیں، دریا اور ندی نالے جاری ہوئے اور یہ ان میں روپوش ہو گیا۔۔۔ اب صرف اسے دکھائی دیتا ہے جو درّہ شمشال کے اندر جاتا ہے۔۔۔ اور نام بھی عجیب تھا۔۔۔ کوہ قارون۔۔ پتہ نہیں اس کے چٹانی اور برفانی وجود کے اندر کون سے خزانے پوشیدہ تھے کہ یہ قارون ہو گیا تھا۔ ۷؎

ایک زمانہ تھا کہ مسجدیں کچی ہوا کرتی تھیں۔ نہ بلند و بالا مینار، نہ عالی شان بلڈنگ اور نہ جدید دور کی کوئی سہولت ان میں موجود ہوتی تھی۔ انسان کو کچی زمین پر سجدۂ شکر ادا کرنے میں جو مزہ ملتا تھا، اُس کا تصور پکی اور عالیشان مسجدوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مٹی سے بنا ہوا انسان جب مٹی میں اپنا ماتھا رگڑتا تھا اور خدا کے حضور گڑگڑاتا تھا تو اُس کی گڑگڑاہٹ عرش پر سنی جاتی تھی مگر جب انسان آسائشوں کا رسیا ہوا۔ کچی مسجدوں کو ڈھا کر پختہ اور عالیشان مساجد بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگا اور بلند و بالا مینار بنا کر اُن میں تکبر عود کر آیا تو اس کا اثر اُن کی عبادات بھی پڑنے لگا۔ پہلے مسجدیں کچی تھیں مگر دل سچے تھے جب مسجدیں پکی بن گئیں تو انسان کے قول و فعل میں مصنوعیت آگئی جس کا اثر انسانی اعمال پر پڑا نتیجتاً خشوع و خضوع نام کا بھی نہ رہا، دل جمی اور قلبی سکون عنقا ہوا اور عبادت کی اصل روح بے روح ہو گئی۔

مستنصر نے انسانوں پر کچے پکے مسجدوں کے اثرات کو محسوس کیا ہے اس لیے اُنھوں نے سفر نامہ ''یاک سرائے'' میں اس کا ذکر خصوصاً کیا ہے لکھتے ہیں:

> ''سر جھکانے یا سجدہ کرنے کے لیے جگہ کی قید نہیں ہے لیکن معبد جتنا عظیم الشان اور سجاوٹ بھرا ہو گا اُتنا ہی وہ جھکنے والے کے حواس پر اثر انداز ہو گا اور دل جمی جو شرط ہے کم ہو گی۔۔ اس پتھریلے چناؤ کے بے در کمرے میں کچے فرش پر صرف گھاس تھی اور نیم تاریکی تھی۔ یہاں جھکتے ہوئے کوئی عمارتی جلال یا شان و شوکت

حائل نہیں ہوتے تھے ، براہ راست ملاقات ہوتی تھی۔۔۔ اور سجدے میں گھاس کی
مہک اُس ذات کے اور قریب لے جاتی تھی۔ ۸؎

کسی نقاد نے مستنصر حسین تارڑ کے متعلق کچھ نامناسب باتیں کی تھیں جس کے رد عمل میں مستنصر نے اُن کا نام لیے بغیر اُن کی خوب خبر لی ہے اور اُنہیں آئینہ دکھایا ہے کہ وہ اس کی تائید و تعریف کے بغیر بھی ہر دلعزیز اور عوام میں مقبول ہیں ۔اس بارے میں مستنصر حسین تارڑ کا رد عمل ”راکاپوشی“ میں ملاحظہ کریں، لکھتے ہیں:

”پچھلے دنوں ایک ادبی جریدہ میں ایک زائد المیعاد ہو چکے زہریلے نقاد نے ۔۔۔ اور وہ بقول وارث شاہ، ایک موئے ہوئے سانپ کی مانند، بِس گھولتا تھا یہ کہا کہ ہم نقاد ہی کسی ادیب کی ادبی قامت کا تعین کر کے اُسے ادب کے راج سنگھاسن پر بٹھا سکتے ہیں اور یہ جو مستنصر حسین تارڑ ہے اس نے آج تک مجھے اپنی کوئی کتاب ریویو کے لیے نہیں بھیجی اسی لیے وہ ایک پسندیدہ ادیب تو ہے لیکن ایک بڑا ادیب نہیں ہے۔ ۹؎

تاریخ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ ٹھوس اور سچ ہوتا ہے۔ سفر نامہ اگرچہ تاریخ کی کتاب نہیں مگر اس میں تاریخی حقائق کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کا تاریخی حوالوں سے پس منظر واضح نہ کیا جائے تب تک قاری کی تشنگی برقرار رہتی ہے۔ سفر نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تخیل کی رنگ آمیزی تاریخی حقائق کو ایسے انداز میں قاری کے سامنے پیش کرتی ہے کہ قاری کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے اور تاریخی حقائق بھی مسخ نہیں ہوتے۔ مستنصر حسین تارڑ کی یہ خوبی ہے کہ وہ جس مقام سے گزرتے ہیں اُس کی تاریخی اہمیت اور پس منظر و پیش منظر ضرور بتاتے ہیں تاکہ قاری اسے سمجھنے میں کسی ابہام کا شکار نہ ہو۔ ’ہنزہ داستان‘ میں لکھتے ہیں :

گلگت کے آس پاس اور ہنزہ سے درہ خنجراب جاتی ہوئی شاہراہ کے نواح میں بدھ کے آثار باقی ہیں۔ بہت کچھ شاہراہوں کی تعمیر کے دوران ڈائنامائٹ اور بارود کی نذر ہوا۔ قدیم خانقاہیں اور مجسمے معدوم ہوئے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ گیا۔ نامعلوم رسم الخط سے کندہ چٹانیں اور مہاتما بدھ کے چپ مجسمے ان وسیع ویرانوں میں کہیں نہ کہیں موجود رہے۔ ڈھائی سو سال قبل از مسیح

میں بدھ مت اِن خطوں میں پھیلا اور قبول کیا گیا۔ اگلے بارہ سو برسوں میں یہ سرزمین بدھ کی تعلیمات پر عمل پیرا رہی۔۔۔۔۔ اور اسی طرح آج سے بارہ برس بعد ہماری تہذیب کے آثار ہوں گے۔ باقی رہے اللہ کا نام۔۔ اور پھر آٹھویں صدی کے بعد شاید چین کے راستے اسلام ان خطوں میں پھیلا۔ پہلے یہ مغلوں کے زیر نگیں رہے، کچھ عرصہ یہاں سکھ قابض رہے اور پھر ۱۸۷۸ء میں انگریز صاحب بہادر نے ہندوستان کی اس "آخری چوٹی" پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰؎

مستنصر حسین تارڑ کو تاریخ گوئی بہت پسند ہے اس لیے وہ جب کسی تاریخی مقام یا تاریخی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کا قلم اس چیز کا پس منظر بتانے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے جس کا ثبوت چقچن مسجد کی تاریخ بتانے سے ملتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ مع اپنے ساتھیوں کے فدا صاحب اسسٹنٹ کمشنر خپلو کی معیت میں ایک تاریخی مسجد "چقچن مسجد" دیکھنے جاتے ہیں۔ جس کی مختصر تاریخ مستنصر نے ان الفاظ میں سنائی ہے۔ 'نانگا پربت' میں لکھتے ہیں :

چقچن مسجد۔۔۔۔ بلکہ خانقاہ صوفیہ چقچن۔ انگریز مؤرخ جان ہارلے کے مطابق یہ اپنے منفرد طرز تعمیر کی وجہ سے ایشیا کی سب سے خوبصورت خانقاہ ہے۔ اس کی بنیاد حضرت میر سید علی ہمدانی نے رکھی اور اسے میر شمس الدین محمد عراقی نے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ تقریباً چھے سو برس قدیم ہے۔

"چقچن کا مطلب ہے "لوہے کی چیز"۔ یہاں ایک ستون ہے جس کے ساتھ ایک زنجیر ہوتی تھی اور مقامی آبادی کا یقین تھا کہ یہ زنجیر ایک زمانے میں آسمان سے ملی ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی تو وہ اس زنجیر کو ہلا دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اس مسجد کو شیاخ چن بھی کہتے ہیں اور اس کا مطلب ہے انصاف کی مسجد اور ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مسجد کے اندر بیٹھ کر جھوٹی قسم کھائے تو وہ مر جاتا ہے"۔ ۱۱؎

خپلو میں مستنصر حسین تارڑ اور اُن کے ساتھیوں میں جن میں اب 'کرس' المعروف مشہور زمانہ اداکار "ولیم ہرٹ" بھی شامل تھا نے 'مشہ برم' کی چوٹی بھی دیکھی اور خپلو کے راجہ کے محل کے

نظارے سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ مستنصر نے خپلو کے پس منظر میں جھانک کر قاری کو چند تاریخی حقائق سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس کے مطابق قدیم زمانے میں وادی خپلو کے باشندے بدھ مت کے ماننے والے تھے۔ ۷۸۶ھ میں سید علی ہمدانی اسلام کی تبلیغ کے لیے کشمیر سے بلتستان آئے جس کی بدولت یہاں کے باشندے مشرف بہ اسلام ہو گئے بعد میں میر شمس الدین محمد عراقی آئے جن کے نام پر یہاں مسجد چقچن بنی ہے۔ بلتستان کے ایک مشہور بزرگ میر مختار اخیار گزرے ہیں جو ان بزرگوں کی اولاد میں سے تھے اور جنھوں نے بلتستان میں کئی عظیم الشان خانقاہیں تعمیر کی ہیں جن میں شیعہ اور سنی اکٹھے نماز پڑھتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی خوبی یہ ہے کہ وہ باتوں باتوں میں ایسے مواقع ڈھونڈ لیتے ہیں کہ وہ قاری کو بیش بہا معلومات کا ذخیرہ عنایت کر جاتے ہیں اور یہ معلومات وہ کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اس سے سفر نامے کا ربط کلام بھی مجروح نہیں ہو پاتا اور مستنصر اپنے مطلب کی بات بھی کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً مستنصر ایک جگہ ایک عظیم قلعے "کرفوچھے" کی بلندیوں کا ذکر کر رہے تھے اور کاظمی صاحب کی تعریف میں رطب اللسان تھے جن کی بدولت یہ عظیم قلعہ دیکھنے کی زیارت نصیب ہوئی پھر اچانک وہ سکردو کے لائبریری پہنچ جاتے ہیں اور وہاں بلتستان کے ایک عظیم ہیرو علی شیر خان انچن کا تعارف قاری سے کراتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "انچن کی رسائی مغل دربار تک اس وقت ہوئی جب اکبر نے ۱۵۸۶ء میں کشمیر فتح کیا۔ مغل تاریخ دانوں نے انچن کا ذکر علی رائے کے نام سے کیا ہے۔ انچن نے ایک مغل شہزادی کے ساتھ شادی کی جو کہ گل خاتون تھی۔ بلتی عوام نے اس مغل شہزادی کو میندوق گیالمو کا خطاب دیا۔ علی شیر خان نے نہ صرف یہ کہ ایک مغل شہزادی سے شادی کی بلکہ اس نے اپنی بیٹی شہزادہ سلیم سے بیاہ دی۔ گل خاتون سکردو آئی تو اپنے ہمراہ موسیقار، انجینئر، ملاح اور دیگر ہنر مند لے کر آئی۔ جن زمانوں میں انچن اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے تقریباً چار برس کے لیے سکردو سے باہر رہا، ان زمانوں میں گل خاتون نے ثقافت اور طرز تعمیر کو فروغ دیا اور میندوق کھر، ہلال باغ، چہار باغ اور گنگوپی نہر تعمیر کروائے"۔ ۱۲۔

نانگا پربت دنیا کی نویں بڑی چوٹی جبکہ پاکستان کی دوسری سب سے بڑی چوٹی شمار کی جاتی ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۲۶۶۵۸ فٹ بلندی پر واقع ہے چونکہ اس پہاڑ پر چڑھنے والے بہت سے لوگ موت کا شکار ہوئے اس لیے نانگا پربت کو اب '' دنیا کا قاتل پہاڑ '' کہا جاتا ہے۔ نانگا پربت سے بہت سے جرمن لوگوں کا تعلق رہا ہے اس لیے اسے '' جرمن پہاڑ '' بھی کہا جاتا ہے چونکہ اس پر برف نہیں ٹھہرتی اور اس کی چوٹی ننگی رہتی ہے اس لیے اسے نانگا پربت کہا جاتا ہے۔ ۳/ جولائی ۱۹۵۳ کو ایک جرمن آسٹرین ہرمن بہل نے اسے سر کیا۔ نانگا پربت کی قابل دید اور سب سے خوبصورت ترین جگہ فیری میڈو یا پریوں کا میدان ہے۔ اسے یہ نام جرمن امریکی مہم کے سربراہ ولی مرکل نے ۱۹۳۲ میں دیا۔ فیری میڈو نانگا پربت سے شمال کی طرف دریائے سندھ اور شاہراہ ریشم سے چند کلو میٹر کی مسافت پر ہے۔ یہ ۱۰۸۲۷ فٹ بلند ہے۔ گرمیوں میں یہاں سیاحوں کا بے پناہ رش ہوتا ہے۔ تاتو، فنتوری اور تارڑ جھیل فیری میڈو کو جانے والے راستے میں ہی آتے ہیں۔ دوسرے سیاحوں کی طرح مستنصر حسین تارڑ کو بھی نانگا پربت اور فیری میڈو کی کشش کھینچ لائی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے اس سفر کا احوال بڑے جوش و خروش سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

> ''نانگا پربت!
>
> دردستان یا دیامیر کو پریوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ مقامی آبادی کا عقیدہ ہے کہ نانگا پربت کی چوٹی پر پریوں کی ملکہ کی رہائش گاہ ہے۔ داستانوں میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسے برفانی قلعے میں رہتی ہے جو شفاف اور دبیز برف کا بنا ہوا ہے اور برف کے بڑے بڑے مینڈک اور برف کے ایسے سانپ جو کئی کلو میٹر لمبے ہیں ،اس ملکہ کی حفاظت پر مامور ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والی عورتیں رنگین کپڑوں اور شوخ زیوروں سے اجتناب کرتی ہیں کیونکہ انہیں پہننے سے پریاں ان سے حسد کر سکتی ہیں اور ان پر جادو کر سکتی ہیں''۔ ۱۳؎

ہمارے ہاں کسی علاقے کے حاکم، کسی ریاست کے والی یا حکمران طبقہ کو عوام عموماً اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرتے۔ چونکہ ایسے لوگ زبانی دعوؤں کے علاوہ حقیقی معنوں میں کبھی بھی عوام کے خیر خواہ نہیں رہ پاتے اور نہ ایسے لوگ عوام کی فلاح و بہبود اور اُن کی ترقی کی سوچ رکھتے ہیں اس لیے عوام بھی اپنا

بھڑاس نکالنے کے لیے اپنی نفرت کا اظہار گاہے بہ گاہے کرتے رہتے ہیں مگر ان تمام باتوں کے برعکس مستنصر حسین تارڑ نے مستند حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ والئ سوات ایک ایسے ہر دلعزیز شخصیت تھے جن سے سوات کے عوام بے پناہ محبت کرتے تھے اور اُن کی مثبت اور عوامی سوچ، اُن کی مہر و محبت اور اُن کے حسنِ عدل کے قصے زبان زد عام تھے۔ وہ سچے اور پکے مسلمان تھے۔ کسی ایک شخص نے بھی والئ سوات کی شخصیت کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا۔ مستنصر حسین تارڑ نے ایک انگریز تاریخ دان آرنلڈ ٹائن بی کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے اس علاقے میں چند دن گزارے تھے اور اپنے مشاہدات و تجربات کو ۱۹۶۱ء میں ''بٹوین آکس اینڈ جمنا'' نامی سفرنامے میں بیان کیا تھا۔ اُنھوں نے والئ سوات کا ذکر بڑی حیرت سے کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ''سفر شمال کے'' میں بتاتے ہیں:

> ''والئ سوات ایک تاریخ دان کو اٹھارہویں صدی کے کسی روشن دماغ یورپی حکمران کی یاد دلاتے ہیں۔ انقلاب فرانس سے قبل یورپ میں سوات کے رقبے جتنی کئی ریاستیں تھیں جہاں عوام کے فائدے کے لیے آمرانہ انداز میں حکومت کی جاتی تھی۔ والئ سوات کا چیف سیکرٹری گوجرانوالہ کا ایک پنجابی ہے اور اُن کا تعلق ایک کلرک خاندان سے ہے۔ دراصل وہ سوات کے مشہور اخوند کے پوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُنہیں ایک جدید ریاست کے وجود کے بارے میں کیسے احساس ہوا، اُنہیں کیسے معلوم ہوا کہ دنیا کی تاریخ ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں پشتونوں کے لیے ایک جدید ریاست کا قیام ضروری ہے۔ یہ مکمل منصوبہ صرف ایک اکیلے آدمی کے ذہن میں آیا۔ اس پورے منصوبے کی سوچ اور اس پر عمل درآمد کرنا صرف ایک جنیئس کے بس کی بات تھی۔ میں نے اُن سے پوچھنے کی جسارت کی تھی کہ اُنھوں نے اس میں کیسے کامیابی حاصل کی اُن کا جواب صرف ایک لفظ تھا ''صبر''۔ والئ سوات نے نہ صرف یہ کہ سیاسی اُلجھاؤ میں سے ایک جدید ریاست کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا بلکہ اُسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد حکمرانی چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ سارا سال ماہِ رمضان کی طرح صبح سے شام تک روزہ رکھتے اور قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے

اُنھیں روزے رکھنے سے منع کر دیا ہے لیکن قرآن حکیم کا مطالعہ جاری ہے
اور قرآن پر جھکتے ہوئے اُن کے ذہن میں کیا خیال آتے ہیں"۔ ۱۴؎

صد پارہ کا مطلب فصیل یا حفاظتی دیوار ہے جسے قدیم راجے مہاراجے اپنی ریاست کی سرحدوں کی نشان دہی کے لیے بنواتے تھے۔ اسی ضمن میں ۱۸۷۶ء میں راجاؤں نے آب پاشی کے لیے ایک چھوٹا سا بند تعمیر کیا تھا جو انڈے کی سفیدی اور خاص قسم کی چکنی مٹی گوندھ کر بنایا گیا تھا۔ اب تاریخ میں وہ بند صد پارہ جھیل کے نام سے مشہور ہو گیا تھا جن کا پانی نہ صرف سونے کی طرح چمکتا تھا بلکہ اس میں سونے کے ننھے ننھے ذرے بھی دکھائی دیتے تھے اور جن کے دیدار کے لیے سیاح دور دراز سے آتے تھے اور یہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مقامی لوگوں کے مطابق صد پارہ جھیل کا پانی انتہائی زود ہضم ہے اور جتنا پیا جائے طبیعت پر بوجھ نہیں بنتا یہی وجہ ہے کہ مستنصر اور اس کے ساتھیوں نے جھیل صد پارہ گولڈ کی سیاحت کے دوران اس جھیل کا پانی کئی گلاس بھر کر پیا بلکہ پانی میں سونے کے ذرات کی آمیزش دیکھ کر، اُنہیں پانے کے لیے اُن کے دل بھی للچائے۔ جس کا اظہار مستنصر نے بھی برملا کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"سونے کا طلسم اور لالچ ہم سب میں موجود ہے اور ہمارے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی اور ہم جھک جھک کر اس ریت کو مختلف زاویوں سے دیکھتے تھے جو بھی ایسے لگتی جیسے کسی مزار کی چادر موم بتیوں کی جھلملاہٹ میں رہ رہ کر چمکتی ہو اور کبھی دھوپ کی آخری کرنیں ان ذروں میں منتقل ہوتی جاتیں جو لالچ اور طلسم تھے۔ ہم نے یہ گولڈ واٹر پیا اور جی بھر کر اور گلاس بھر بھر کے پیا اور یہ حقیقت ہے کہ اس میں کچھ سنہری تاثیر تھی۔ ۱۵؎

مستنصر اور اُس کے ساتھیوں نے سکردو سے وادی خپلو جانے کا پروگرام بنایا جو لداخ کے قریب واقع ہے۔ ویگن میں سوار ہو کر سفر شروع ہوا تو مستنصر نے قارئین کو شریک کرنے کی خاطر نہ صرف ویگن میں اپنے ہم سفر لوگوں کا تعارف کرایا بلکہ ارد گرد کے مناظر کی عکاسی بھی کرنے لگا۔ مستنصر کی ہم سفر ایک لداخی بوڑھی اماں جی بھی تھی جس نے روایتی چغہ زیب تن کیا تھا اور سر پر ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر بے شمار لٹکتی مینڈھیاں تھی۔ چاندی کا زیور پہنا تھا اور کانوں میں اتنے بھاری جھمکے ڈال رکھے تھے جن کی وجہ سے اُن کے کان حد سے زیادہ لمبے ہو گئے تھے۔ چہرے پر پہاڑی زندگی کی مشقت

جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ مستنصر نے لداخی بوڑھی اماں کے لباس، پوشاک، زیورات کا ذکر کر کے گویا لداخی عورتوں کے رسم و رواج اور روایات سے سب کو آگاہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ نہ صرف بلتی اور لداخی مرد بلکہ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ مشقت بھری زندگی گزارتی ہیں جن کے اثرات اُن کے چہروں پر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

کے ٹو، ماؤنٹ ایورسٹ کے بعد دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے جو سلسلہ کوہ قراقرم میں واقع ہے اور سلسلہ کوہ قراقرم پاکستان میں واقع ہے۔ کے ٹو کی اونچائی ۸۶۱۱ میٹر ہے جو کل ۲۸۲۵۱ فٹ بنتے ہیں۔ یہ چوٹی سب سے پہلے ۳۱ر جولائی ۱۹۵۴ء کو دو اطالوی کوہ پیماؤں لیساڈلی اور کمپانونی نے سر کی تھی۔ کے ٹو کو ماؤنٹ گڈون آسٹن اور شاہگوری بھی کہتے ہیں۔ ماؤنٹ گڈون آسٹن کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء میں پہلی بار گڈون آسٹن نے اس پہاڑ کا سروے کیا تھا۔ اس کے ہمراہ تھامس ماؤنٹ گمری بھی تھا اس لیے اس چوٹی کو ماؤنٹ گڈون آسٹن بھی کہا جاتا ہے۔ گڈون آسٹن ہی نے اس چوٹی کو کے ٹو کا نام دیا تھا کیونکہ سلسلہ کوہ قراقرم میں دوسرے نمبر پر تھی۔ کے ٹو کی چوٹی سر کرنے کی پہلی کوشش ۱۹۰۲ء میں ہوئی جو ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کوئی بھی مہم کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوئی۔ آخر کار اطالوی کوہ پیماؤں کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور لیساڈلی اور کمپانونی کے ٹو کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ بعد ازاں ۲۳ر اگست ۱۹۷۷ء کو ایک جاپانی کوہ پیما چیر ویو شیز ادا نے یہ چوٹی سر کی۔ اس کے ہمراہ اشرف امان پہلا پاکستانی تھا جسے کے ٹو سر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مستنصر حسین تارڑ نے ”کے ٹو کہانی“ کے نام سے ایک سفر نامہ لکھا ہے جو ایک طرف نہ صرف کے ٹو کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت و حیثیت کو اُجاگر کرتا ہے تو دوسری طرف اس خطرناک چوٹی کے گردو نواح میں گھوم پھر کر سفر نامہ نگار قاری کو ایک عجیب و غریب دنیا کی سیر کرا کے ایک ایسا ہولناک، پر اسرار اور پر تحیر منظر نامہ پیش کر دیتا ہے کہ قاری کے قلب و روح میں جذبات و احساسات کا ایک طوفان سر اُٹھانے لگ جاتا ہے جو سفر نامے کے اختتام تک جاری و ساری رہتا ہے۔

روایتی سفر ناموں کے برعکس مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر ناموں کا آغاز کچھ ایسے انداز سے کرتا ہے کہ تخیّل و حقیقت کی ہم آہنگی سے وہ قاری کو ادبیت کی وہ چاشنی دے جاتا ہے کہ جس سے اس کے قلب و ذہن میں ایک برقی رَو دوڑ جاتی ہے اور اس کی جمالیاتی ذوق کو سکون سا آجاتا ہے۔ ”کے ٹو کہانی“ کا آغاز بھی ایسے انداز میں ہوا ہے کہ سفر نامہ نگار ”شاہ گوری“ کو خواب میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ خود کو

بھی خواب میں دیکھنے لگ جاتا ہے جو اپنی زندگی کے دو متضاد پہلوؤں کو تنقید کی نظر سے دیکھ کر خود سے یہ سوال کرتا ہے کہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس رہنے والے شخص کے دل میں یہ ترنگ نجانے کہاں سے پیدا ہوئی کہ وہ شہروں اور آبادیوں کی نسبت جنگلوں، صحراؤں اور پہاڑوں کی خاک چھاننے میں لذت محسوس کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُسے مونالیزا کی مسکراہٹ کی بجائے چوغولیزا (چوگولیزا سلسلہ کوہ قراقرم میں ایک پہاڑ کا نام ہے جس میں متعدد بلند ترین چوٹیاں ہیں اور جو کے ٹو کے بالکل قریب واقع ہے) کا حسن زیادہ بھاتا ہے اور اس کے کانوں میں دریائے برالڈو کا شور رس گھولتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کہتا ہے:

> اور جب میں نے پچھلی شب شاہ گوری کو خواب میں دیکھا تو وہ تنہا نہ تھی ۔۔۔۔اس کے آس پاس چوغولیزا۔۔۔۔ بھی تھی۔۔۔۔ ہاں مونالیزا کی مسکراہٹ سے کہیں زیادہ حسن والی چوغولیزا۔۔۔اور براڈ پیک، مترے پیک، گشابرم اور مشابرم بھی وہاں تھیں اور میرے کانوں میں دریائے برالڈو کا شور نیچے گہرائی سے اوپر آتا تھا اور میرے تھکے پاؤں میں خوف بھرتا تھا"۔ ۱۶؎

دیوسائی دو الفاظ 'دیو' اور 'سائی' کا مجموعہ ہے جس کا مطلب ہے دیو کا سایہ۔ سینکڑوں سالوں سے لوگوں کا یہ عقیدہ رہا کہ دیوسائی وہ جگہ ہے جہاں دیو بستے ہیں۔ آج جدید دور میں بھی مقامی لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیوسائی میں مافوق الفطرت مخلوق رہتی ہے۔ دیوسائی پہاڑی سلسلہ دراصل ہمالیہ پہاڑی سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ شمالی علاقہ جات میں دریائے سندھ گارج کے جنوبی طرف واقع ہے۔ کارگل کا علاقہ اسی دیوسائی پہاڑی سلسلے سے ملتا ہے۔

دیوسائی پہاڑی سلسلہ وادیٔ کشمیر اور ضلع بلتستان کے درمیان واقع ہے۔ یہاں پر ۵۸۰ مربع میل رقبہ پر مشتمل دیوسائی کے نام سے ایک میدان بھی واقع ہے۔ درہ گریز سے اسکردو اور اسکردو سے آگے دیوسائی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ۱۶۰۰۰ تا ۱۷۰۰۰ اونچی چوٹیاں ہیں۔ درہ ترگ بل اور درہ برزل اسی خطے میں واقع ہے جو بلتستان اور گلگت کو وادیٔ کشمیر سے ملاتے ہیں۔ یہاں موسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ گرمیوں میں بعض اوقات دیکھتے ہی دیکھتے اچانک شدید ژالہ باری ہونے لگتی ہے اور کبھی اچانک بادلوں کی اوٹ سے دھوپ کا چہرہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس خطے میں انسانی آبادی بالکل نہیں کیونکہ

برفانی ہواؤں، طوفانوں اور خوفناک جانوروں کی موجودگی میں انسان یہاں پر مستقل رہائش پذیر ہونے کا تصور نہیں کر سکتا۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کا اگر بنظرِ عمیق جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ گردو پیش کے مناظر اور تاریخی شواہد کے امتزاج سے اپنے سفرناموں کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں اور اپنی شگفتہ طرزِ تحریر سے اُس ڈھانچے کو ایسا خوش نما لباس پہنادیتے ہیں جن پر نظر پڑتے ہی ہر ایک کی زبان سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ تاریخ و جغرافیے کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ کا مطالعہ کافی وسیع ہے خاص کر جب وہ بدھ مت کی تاریخ دہراتے ہیں اور اُن کی عظمت و ثقافت کے گُن گاتے ہیں تو یہاں پر اُس کا قلم خوب رواں ہوتا ہے۔ وہ مختلف تاریخی حوالوں سے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے سفرنامے کی وقعت و اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ "سفر شمال کے" میں مستنصر کہتے ہیں:

"گندھارا صوبہ سرحد کے ایک حصے کا نام ہے۔۔۔ بدھ ازم یہاں تیسری صدی قبل از مسیح میں آیا۔۔۔ یہ چھوٹا سا علاقہ اپنی شاندار تہذیب اور پر امن ثقافت کے اثرات روس کے دریا آمو تک لے جاتا ہے اور ادھر چین کے سرحدی علاقوں میں اس کے آثار ملتے ہیں۔۔۔ ۵۱۸ قبل مسیح کے ایک ایرانی کتبے میں اسے گندھارا کہا گیا ہے۔ آتش پرست ایرانی، یونانی اور بدھ اسے اپنا مقدس وطن کہتے ہیں۔ فن مجسمہ سازی میں گندھارا کی الگ پہچان ہے۔ گندھارا کے مجسمے یونانی اثرات میں گندھے ہوئے ہیں۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے مہاتما بدھ کا مجسمہ نہیں بنایا جاتا تھا اور اس کی پرستش کا رواج نہیں تھا۔۔۔ پھر کنشک نے بُدھ ازم کی چوتھی کونسل بلائی جو کشمیر کونسل بھی کہلاتی تھی اور اس میں کئی اہم فیصلے کیے گئے۔۔۔۔ کہا گیا کہ روم اور یونان کے دیوتاؤں کی طرح مہاتما بدھ کے مجسمے بھی تراشے جائیں تاکہ مجسمے کو دیکھ کر خوب صورتی اور امن کا احساس ہو، نہ کہ بدہیئتی اور کراہت کا۔ چنانچہ روایت ہے کہ یونان سے چند مجسمہ سازوں کو بھی بلایا گیا تاکہ وہ مقامی مجسمہ سازوں کو اپنے طریقِ کار سے آگاہ کر سکیں۔۔۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گندھارا کا مہاتما بدھ دراصل یونانی دیوتا اپالو کی کاپی ہے ۔۔۔۔۔ بامیان کے عظیم بدھ مجسمے بھی اس دور کی یادگار ہیں اور ٹیکسلا کے دھرم راجیکا سٹوپا میں ایک مجسمے کی بلندی چالیس فٹ کے قریب تھی۔ ۱۷؎

ایک دوسری جگہ بدھ مت کی تاریخ وتعریف میں مستنصر حسین تارڑیوں رطب اللسان ہیں:

"آج سے تقریباً دو تین ہزار برس پیشتر اشوک اعظم نے یہ معبد تعمیر کروایا۔ مرکز میں ایک عظیم سٹوپا تھااور اس کے گرد دوسو چالیس چھوٹے سٹوپے اور عبادت گاہیں تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے پیشتر اس میں تین مرتبہ توسیع ہوئی اور پھر یہ بت کدہ تیرہ سو برس تک آباد رہنے کے بعد وحشی حملہ آوروں کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ کی خاک یا ہڈیاں آٹھ سٹوپوں میں محفوظ کی گئیں۔ اشوک اعظم نے ان بدھ آثار کو سٹوپوں سے نکال کر تمام بڑے بڑے صوبوں اور شہریوں میں بھجوادیا اور حکم دیا کہ وہاں شاندار سٹوپے تعمیر کر کے انہیں دفن کیا جائے یوں یہ خاک تقریباً چوراسی ہزار سٹوپوں میں محفوظ ہوئی۔۔۔ چنانچہ سٹوپا کو بدھ کی قبر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سٹوپے مہاتما بدھ کی زندگی کے بارے میں ایک پتھریلی کتاب تھے"۔ ۱۸؎

راکاپوشی پہاڑی چوٹی پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے علاقے نگر میں واقع ہے۔ یہ پہاڑ ۲۵،۵۵۰ فٹ جبکہ ۷۷۸۸ میٹر بلند ہے۔ راکاپوشی کا پہاڑی سلسلہ کوہ قراقرم میں واقع ہے۔ یہ چوٹی بلندی کے لحاظ سے پاکستان میں ۱۲ ویں نمبر جبکہ دنیا میں ۲۷ ویں نمبر ہے۔ دو برطانوی کوہ پیماؤں مائیک بینکس اور ٹام پیٹی نے ۱۹۵۸ء میں اس چوٹی کو پہلی بار سر کیا۔ راکاپوشی اپنے حسن و دلکشی اور حسین و جمیل نظاروں کی بدولت انتہائی مشہور ہے۔ یہ پہاڑ وادی ہنزہ کے سامنے واقع ہے۔ شاہراہ قراقرم پر جاتے ہوئے گلگت سے اس کی مسافت کل دو گھنٹے ہے۔ راکاپوشی چوٹی کو صحیح طور پر دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاح شاہراہ قراقرم پر ہنزہ سے کچھ پہلے نلت نامی گاؤں تک جائے جسے " راکاپوشی ویو پوائنٹ" کہا جاتا ہے۔ اس ویو پوائنٹ پر پہنچ کر راکاپوشی کو اس کے دامن سے لے کر چوٹی تک مکمل طور دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں سیاحوں کا جم غفیر ہوتا ہے۔ اس منزل سے تھوڑا آگے ایک گاؤں مناپن آتا ہے جہاں سے راکاپوشی کا دامن شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے پہاڑ کے بیس کیمپ تک کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ اس ٹریک کو پاکستان کا خوب صورت ترین اور آسان ٹریک کہا جاتا ہے۔ دو دن کی مسافت کے بعد سرسبز میدان، ندی نالے، خوب صورت جنگلات اور خوفناک گلیشیئر نظر آتے ہیں اس کے بعد دنیا کی خوب ترین دو چوٹیاں راکاپوشی اور دیران نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مزید آگے جانے کے بعد ہنزہ کا علاقہ آجاتا ہے جہاں چہار سُو سات ہزار میٹر سے زیادہ بلند چوٹیوں کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک جانب اگر

اُلٹرپیکس ہیں تو دوسری طرف شِسپر اور پسو پیکس ہیں اور سامنے کی جانب راکاپوشی، دیرن پیک، گولڈن پیک، سپانٹک پیک وغیرہ سیاحوں کی آنکھیں اپنی کشش سے خیرہ کرنے کے لیے جلوہ افروز نظر آتی ہیں مگر ان تمام چوٹیوں میں راکاپوشی کا نظارہ سب سے زیادہ پرکشش اور سب سے زیادہ سحر انگیز ہے۔

۲۳ جون ۲۰۱۳ کو بلتستان کے ضلع دیامیر میں ۴۲۰۰ فٹ کی بلندی پر نانگا پربت کے پہلے بیس کیمپ میں کچھ غیر ملکی سیاح موجود تھے کہ اچانک اُن پر دہشت گردوں نے فائرنگ کر دی۔ فائرنگ کے نتیجے میں نو غیر ملکی سیاح ہلاک ہو گئے۔ ان غیر ملکی سیاحوں میں پانچ کا تعلق یوکرین سے تھا۔ تین چینی اور ایک روسی تھا۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک پاکستانی گائیڈ بھی تھا۔ اس طرح کل دس افراد ہلاک ہوئے تھے۔ قدرتی حسن و دلکشی سے مالامال اور دنیا بھر میں مشہور گلگت بلتستان میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ غیر ملکوں سیاحوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس خوفناک حادثے کے بعد علاقے کی سکیورٹی سخت کر دی گئی۔ غیر ملکیوں سیاحوں کے قتل میں ملوث افراد کے خلاف پر جگہ بجگہ چھاپے مارے جانے لگے۔ اس علاقے میں موجود بقیہ غیر ملکی سیاحوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اسلام آباد منتقل کیا گیا۔ نانگا پربت دیامیر فیز غیر معینہ مدت کے لیے بند کیا گیا۔ گلگت بلتستان انتظامیہ نے ملکی و غیر ملکی کوہ پیماؤں کو نانگا پربت کا علاقہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ گاڑیوں کی چیکنگ سخت کر دی گئی اور ایک ایک فرد کو چیک کیا جانے لگا تاکہ گاڑی میں سوار کوئی غیر ملکی چپکے سے اس علاقے میں نہ جا سکے۔ ان ہی دنوں مستنصر حسین تارڑ اپنے چھے ساتھیوں کے ساتھ راکاپوشی نگر کی سیاحت پر تھے اور اُن ہی دنوں یہ واقعہ پیش آیا تھا جس نے نہ صرف گلگت بلتستان میں بلکہ پورے ملک میں ہلچل مچایا تھا۔ اس دہشت گردانہ کاروائی سے بیرونی دنیا میں پاکستان کی سخت سبکی ہوئی تھی اور ہر ملک سے اس واقعے کے بارے میں مذمتی بیانات آرہے تھے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ادیب سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے حادثات و واقعات کا جتنا زیادہ اثر لیتا ہے۔ اُس کی گہرائی شاید دوسرے لوگ اتنا محسوس نہیں کرتے۔ چونکہ سفر و سیاحت مستنصر حسین کا جنون ہے اور خاص کر شمالی علاقہ جات کا توچپہ چپہ اسے عزیز تر از جان ہے اس لیے اس نے اپنے سفرنامے "راکاپوشی نگر" میں اس سانحے کا نہ صرف دکھ کے ساتھ احوال بیان کیا ہے بلکہ ہم سب پاکستانیوں کی بے حسی کو طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اس وقت کے حالات کا تذکرہ کرتا ہے جب اس دہشت گردانہ کاروائی کے بعد انتظامیہ حرکت میں آئی اور شاہراہ قراقرم کو ہر قسم کے ٹریفک کے لیے بند کیا گیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفرنامے "راکاپوشی نگر" میں ان حالات کو باقاعدہ ایک الگ باب "شاہراہ قراقرم پر خوف کی رکاوٹیں" کے تحت بیان کیا ہے۔

"ہماری ساکت ہو چکی ۔۔۔ ہیڈ لائٹس گُل کر کے تاریک ہو چکی ویگن کی
جانب ایک جمائیاں لیتا ہوا وردی پوش سایہ سا بڑھتا ہے ۔۔۔۔۔ اور پھر وہ
ایک ہی فقرے سے ہم سب کو مفلوج کر دیتا ہے " آپ آگے نہیں جاسکتے،
شاہراہ قراقرم ہر نوعیت کی ٹریفک کے لیے بند کر دی گئی ہے۔
"لیکن بھائی جان۔۔۔ کیوں آگے نہیں جاسکتے۔۔۔"
"بس حکم ہے۔۔۔"
"کس کا حکم ہے۔ وقار نے پوچھا۔۔۔
اوپر سے حکم آیا ہے۔۔۔"
"لیکن کیوں؟"
"آپ نہیں جانتا۔۔ جانتا ہو گا۔۔۔ پورے گلگت بلتستان میں ۔۔وردی
پوش ذرا دھیما ہو جاتا ہے۔۔
اُدھر نانگا پربت کے دامن میں دیامیر سائڈ پر بارہ غیر ملکی کوہ پیماؤں کو اُن
کے ہاتھ باندھ کر کلاشنکوفوں سے ہلاک کر دیا ہے۔۔ اُن کی لاشیں ابھی
تک وہاں پڑی ہیں۔ مجرموں کی گرفتاری کے لیے آپریشن شروع ہو چکا
ہے۔ شاہراہ قراقرم بند کر دی گئی ہے ۔ کوئی بھی آگے نہیں
جاسکتا۔۔" ۱۹۔

مستنصر حسین تارڑ اس دہشت گردانہ واقعے پر سخت دکھی اور رنجیدہ ہوا ہے۔ درج ذیل الفاظ
اُس کے گہرے دکھ اور غم وغصے کے مظہر ہیں۔ لکھتے ہیں:

"نانگا پربت تو عبث بدنام تھا، قاتل پہاڑ کہلاتا تھا۔۔۔ جان بوجھ کر کسی شرعی
جنون کے تحت تو اپنے وجود پر یلغار کرنے والوں کو ہلاک نہ کرتا تھا۔ نانگا
پربت نے خود ذاتی طور پر آج تک کسی کو ہلاک نہ کیا تھا جب کہ وہ جنہوں نے
اس پہاڑ کی اُلفت میں اپنے یوکرین، جاپان، کوریا چھوڑے، احمق تھے، ناسمجھ
تھے پر جنون میں تھے جو ان خطوں میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں تعصب،
جہالت اور پاگل پن کا راج ہے اور اب اُن کی آنکھوں میں سے بینائی جا چکی
ہے، اُن میں خون بھرا ہوا ہے وہ چلے آئے، قاتل نانگا پربت نہ تھی۔ ۲۰۔

دہشت گردوں نے غیر ملکی سیاحوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اُن کے مال و اسباب کو مال غنیمت سمجھ کر لوٹا گیا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ نے نہ صرف دہشت گردوں کی اس ظالمانہ کاروائی کی منظر کشی ہے بلکہ اُس علاقے کے باسیوں کی بے حسی بھی اُجاگر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اُن بے وطن سیّاحوں کی لاشیں دیامیر کی ظلم کی گھاٹیوں میں اب تک پڑی ہوئی تھیں۔ اُن کے بدن اتنے اُدھڑے ہوئے تھے کہ اُنھیں کوئی بھی درزی کسی سلائی مشین کے نیچے رکھ کر پھر سے سی نہیں سکتا تھا۔ اُن کی جیبوں میں جتنے ڈالر تھے وہ مالِ غنیمت ہو چکے تھے یہاں تک کہ اُن کے ہمراہ جو شمالی علاقہ جات کا ایک گائیڈ تھا اُس نے بھی اُن کی مدد نہ کی۔ اُن کے ہلاک کیے جانے کا انتظار کیا اور پھر اپنی جیکٹ اُن کے ڈالروں اور گھڑیوں سے بھری۔ ایک جاپانی سیاح کسی طور بچ گیا اور ایک جرمن کوہ پیما خاتون نے اپنے آپ کو پوشیدہ کر لیا اور قتل عام کے بعد اُس نے مقامی گائیڈ کی پھولی ہوئی جیکٹ میں سے ڈالر بر آمد کیے۔ کیسی شاندار بے حسی اور بے غیرتی ہے۔۔۔ ۲۱؎

آزاد کشمیر قدرتی حسن سے مالا مال علاقہ ہے جس میں قدرت کا ایک عظیم شاہکار رتّی گلی جھیل بھی شامل ہے۔ یہ سطحِ سمندر سے ۱۲۱۳۰ فٹ یا ۳۷۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ رتّی گلی جھیل مظفر آباد سے ۱۱۵ کلو میٹر کی مسافت پر وادیٔ نیلم کے بلند و بالا اور سرسبز کوہساروں میں واقع ہے۔ رتّی کا مطلب پنجابی زبان میں 'سرخ' کے ہیں چونکہ اس علاقے میں ایک سرخ رنگ کی ننگی چٹان تھی اس کی وجہ سے اُس چوٹی اور اس وادی کو ''رتّی گلی'' کا نام دیا گیا۔ رتی گلی جھیل، جھیل لالوسر کے بعد اس خطے کی دوسری بڑی جھیل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ہی وہ پہلا آدمی ہے جس نے کوہساروں میں گھرے اس جھیل کو دریافت کیا اور اس کا ذکر اپنے مشہور سفر نامے ''رتّی گلی'' میں کیا ہے۔

سیاح اپنی ذات میں ایک مؤرخ ہوتا ہے۔ وہ جن علاقوں سے گزرتا ہے اور جن جن مقامات کی سیر کرتا ہے، تاریخ بھی اُن کے ہمراہ ہوتی ہے اور قدم قدم پر اُس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اب یہ سیاح کی ذہنی اور علمی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ اس رہنمائی سے کتنا کسب کرتا ہے اور تاریخ کو کیسے کام میں لا کر اپنے سفر کو دلچسپ اور معلومات خیز بناتا ہے۔ مستنصر ایک کامیاب سفر نامہ نگار اس لیے بنے ہیں کہ اُنھوں نے تاریخ کا بڑا عمیق مطالعہ کیا ہے اور وہ اس فن سے آگاہ ہیں کہ قاری کا تاریخ سے رشتہ کیسے اُستوار کیا جا سکتا ہے۔ شمالی علاقہ جات پر لکھے گئے سفر نامے اس بات کے شاہد ہیں کہ اُن کے سفر ناموں کی جڑیں تاریخ و روایت سے جڑی ہوئی ہیں۔ ایک کامیاب سفر نامہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ماضی کی

تاریخ ایسی ہنر مندی سے بیان ہوتی ہے کہ وہ ماضی کا قصہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ اُس پر حال کا گمان ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار کا کام تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا مگر مختلف مقامات اور علاقوں سے گزرتے ہوئے اپنے مشاہدات کی روشنی میں تاریخی حوالوں سے اپنے سفر کو دلچسپ اور معلومات کا گنجینہ بنالینا ایک مشاق اور ماہر سیاح کا کام ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ تاریخ نہ لکھتے ہوئے بھی تاریخ رقم کرتے ہیں اور یوں قاری کا رشتہ تاریخ سے اُستوار کر کے اپنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ موصوف جب ٹیکسلا میں وارد ہوتے ہیں تو ٹیکسلا کے متعلق وہ قاری کو یوں اپنی معلومات میں شریک کرتے ہیں:

"جولین کی قدیم بدھ درسگاہ کو جانے والا دھول زدہ راستہ ویران پڑا تھا۔ پچھلے برس اس کے شاندار کھنڈروں میں گھومتے ہوئے میں سلجوق کو سمجھا رہا تھا کہ یہ دیکھو یہاں باورچی خانہ ہو گا، ابھی تک نالیاں جُوں کی تُوں قائم ہیں۔ یہ خانقاہ کا ہال کمرہ تھا جس کے چاروں طرف کھڑکیوں میں مجسّمے سجے تھے اور یہ وہ قدیم سٹوپا ہیں جو دراصل کتبوں کا کام دیتے تھے۔ ان پر مہاتما بدھ کی زندگی کے مختلف اَدوار تراشے گئے ہیں"۔ ۲۲؎

ایک دوسری جگہ ہنزہ کی تاریخ پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :

"آپ کو معلومات درکار ہیں؟" ۔۔۔۔"جی"

"اچھا اچھا۔۔۔۔۔ کس قسم کی معلومات؟"

"یہی کہ۔۔۔۔۔ ہنزہ آخر کیا ہے؟"

"ہنزہ۔۔۔۔" اُنھوں نے قہوے کا ایک پُر تکلف گھونٹ بھرا" دراصل اس کے تین حصے ہیں۔۔۔۔ ہنزہ بالائی جو گجال کہلاتا ہے۔ ہنزہ کا مرکزی حصہ جو روشال ہے اور زیریں حصہ شناکی۔۔۔۔ گجال جو ہیں۔ اس میں زیادہ تر واخان افغانستان کے لوگ ہیں اس لیے واخی زبان بولتے یں۔ مرکزی ہنزہ میں مخلوط خون ہے۔ سفید ہن، یونانی، تاتار اور مغل ۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کا سپہ سالا درم شیم اپنے بیمار سپاہ کے ہمراہ اُدھر رہ گیا تھا اُن کے چار قبیلے ہیں(۱) درامیتنگ (۲) براتلنگ(۳) برونگ(۴) خوروکس ۲۳

تہذیب و معاشرت اور ثقافت کی عکاسی

تہذیب و معاشرت کی عکاسی سفر نامے کا ایک لازمی جز ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی خطے میں رہنے والوں لوگوں کی زندگی اور اُن کے بودوش کا علم نہیں ہوپاتا نتیجتاً سفر نامہ محض ایک کاغذی تحریر بن کر رہ جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ سفر نامے کے اس فن اور اس ضرورت سے اچھی طرح آگاہ ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی خطے کی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی حالات وواقعات کا ایک آزاد نقاد کی حیثیت سے جائزہ لے کر ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ وہ کسی معاشرے یا خطے کی تہذیبی و ثقافتی ورثے کو اُجاگر کرنے کے لیے مختلف وسیلوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کبھی وہ مروجہ حکایات سے اپنے سفر ناموں کو مزیّن کرتے ہیں تو کبھی رسوم و رواج، عقائد، زبان، مذہبی رجحانات اور مختلف پیشوں سے اپنی بات کو مؤثر بناتے ہیں مستنصر کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنی زبان سے کسی خطے کی اہمیت اور تہذیب وثقافت کا بیان نہیں کرتے بلکہ وہ اس خطے کے باسیوں کی زبان سے اُس جگہ کی تہذیب کو روشناس کراتے ہیں نتیجتاً بیان میں ایسی سچائی اور صداقت رچ بس جاتی ہے کہ مستنصر کی شخصیت غائب جاتی ہے اور قاری اور کردار بالمشافہ گفتگو کر کے معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔

> "ہمارا دادا اس وادی میں ٹھہر گیا اور کاشتکاری شروع کر دی۔۔۔ ایک روز ہمارا دادا کھیت میں کام کرتا تھا کہ اس کے گھر میں اس کی بیوی خدیجہ کے پاس ایک بزرگ آیا۔۔ اور اُس کے پاس ایک بھیڑ تھی۔۔۔ بزرگ نے اس کو دعا دی اور کہا کہ تم یہ بھیڑ کی قربانی کرو تو تمھارے ہاں اولاد آئے گی۔۔ بیوی نے یہ سنا تو فوراً گھر سے باہر نکل کر اپنے خاوند کو اس کا نام لے کر پکارا۔۔ مامون نے جب اپنی بیوی کے ہونٹوں سے اپنا نام سنا تو بہت حیران ہوا کیونکہ اُن کے تعلقات اچھے نہیں تھے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بولتے تھے ۔۔ بیوی ناراض تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو چھوڑ کر کیوں آگیا ہے۔۔ اس لیے کبھی اُس کا نام نہیں لیتی تھی۔۔۔ اس لیے مامون حیران ہوا اور سمجھ گیا کہ اگر آج بیوی نے اس کا نام پکارا ہے تو کوئی خاص بات ہے۔۔ گھر آیا تو بیوی نے بزرگ کا بتایا ۔۔۔ لیکن کیا ہوا کہ بزرگ غائب ہوگیا اور بھیڑ البتہ

موجود رہا۔۔۔ پھر ماموں نے وہ بھیڑ قربان کیا تو اس کی برکت سے اُن کی بہت
اولاد ہوا۔ ہم سب شمشالی اُس کی اولاد ہیں۔ ۲۴؎

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے جہاں تاریخی حقائق کے مظہر ہیں وہاں مستنصر کے ہاں مقامی اور علاقائی ثقافتی رنگ بھی بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ شمال کے چپے چپے، ذرے ذرے سے واقف ہیں اس لیے شمال کا ہر رنگ اسے ازبر ہے۔ وہ ہنزہ، دیامر، اسکردو، گلگت اور بلتی ثقافت کو گاہے بگاہے اُجاگر کرتے رہتے ہیں۔ اُس کی دور بینی نگاہیں گھومتی ہوئی ہر چیز کا مطالعہ و مشاہدہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مستنصر کی یہ خوبی ہے کہ وہ ارادتاً تاریخ، معاشرت یا ثقافت کا ذکر نہیں کرتے بلکہ بات میں سے بات نکالتے ہیں اور باتوں باتوں میں وہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن میں تاریخ بھی ہوتی ہے، ثقافت کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ منظر نگاری کا رنگ بھی موجود ہوتا ہے، تہذیب و تمدن پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور علاقائی اور مقامی رنگ و آہنگ کے سر بھی ملتے ہیں۔ شمشال بے مثال میں گلگت دربار سجا ہوا ہے جس میں مقامی موسیقی ڈھول اور بانسری سے بھی دل بہلایا جارہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہنسی مذاق کا دور بھی جاری ہے۔ بگروٹیوں کے لطیفے سنائے جارہے ہیں، ہنزہ اور چلاس کا رقص پیش کیا جارہا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہاں شمال کا یہ انوکھا پہلو ہمیں دکھایا کہ شمال کا مردانہ رقص اپنی مثال آپ ہے۔ جس طرح ہمارے رقص و سرود کی محفلوں میں نوٹ رقاص پر نوٹ نچھاور کیے جاتے ہیں بالکل اسی طرح شمال میں بھی لوگ رقص کرنے والوں پر نوٹ نچھاور کرتے ہیں۔ یہاں یہ طریقہ مستنصر نے یوں بتایا ہے کہ کوئی شخص اُٹھ کر نوٹ لہراتا ہے پھر اپنے رقاص دوست کے گرد گھمن گھیری کھا کر، نوٹ اس کی ٹوپی میں اُڑس دیتا ہے جسے موسیقار وہاں سے لے لیتے ہیں۔ چلاسی رقص کی تعریف میں مستنصر حسین تارڑ یوں رطب اللسان ہیں:

"فیری میڈو کے رحمت نبی نے جو چلاسی رقص پیش کیا اس میں ایک بہت الگ اور جداسی ردھم تھی جیسے وہ دردستان کے قدیم زمانوں سے سفر کرتی ہوئی ہمارے کمرے میں آگئی ہو۔۔۔۔ ایک بھرپور مردانگی والا رقص جس میں ایک کتھا کلی کے رقاص ایسی پرفیکشن تھی۔۔۔۔ میں اہل دیامر کو روکھے سوکھے اور فن کی نزاکتوں سے دور سمجھتا تھا لیکن وہ تو چھپے رستم نکلے۔۔۔۔ رحمت نبی کے رقص نے ہمیں مبہوت کر دیا۔ ۲۵؎

مستنصر حسین تارڑ کا مشاہدہ گہرا اور مطالعہ وسیع ہے۔ وہ سیاحت کے دوران جہاں تاریخی حقائق پر بات کرتے ہیں وہیں پر وہ معاشرے کے نباض بھی ہیں۔ اُنھیں مختلف علاقوں، قوموں، قبیلوں اور لوگوں کی عادات و خصائل کا اچھی طرح علم ہے۔ ہر علاقے اور قبیلے کے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں نیز اُن میں اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مستنصر سب کے بارے میں نہ صرف خوب آگاہی رکھتے ہیں بلکہ قاری کو بھی اس عمل میں اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں اور کسی خاص قوم یا قبیلے کے متعلق مستند معلومات پہنچاتے ہیں۔ "ہنزہ داستان" میں جب پٹن کے قریب ویگن رکی تو دو مسافر اُن کی ویگن میں اندر آ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے چہرے چادروں سے ڈھانپے ہوئے تھے صرف اُن کی وحشت زدہ آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ مستنصر نے باتوں باتوں میں اُن کی زبان سے اُن کا شجرہ نسب کھول کے رکھ دیا۔ لکھتے ہیں:

"آپ پٹھان ہیں؟"

"نہیں میں کوہستانی ہوں۔۔۔ لیکن اِدھر کوہستان میں نہیں رہتا۔
صاحب یہ علاقہ انسانوں کے رہنے والا نہیں۔ نرا خوف ہی خوف۔ بھوک، بیماری، جہالت۔۔۔ نہ خوراک نہ کھیت۔۔ بس بھر بھری مٹی کے پہاڑ ہیں جن میں صدیوں سے لوگ رہتے چلے آئے ہیں۔ اُنھیں باہر کی دنیا کا کچھ پتہ نہیں۔ غیر قوموں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے کچھ سیکھ نہیں سکتے۔۔۔ ذاتی دشمنیاں اس حد تک ہیں کہ ہم لوگ رات کو ایک جگہ پر نہیں سوتے۔ دو میں ایک آتے ہیں اور جگہ بدل لیتے ہیں تاکہ سوتے میں کوئی دشمن وار نہ کر جائے۔ اپنے چہرے چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ کوئی پہچان نہ لے۔۔۔۔
میں ایک عرصے سے باہر رہتا ہوں لیکن جب کبھی کاروبار کے سلسلے میں اِدھر آتا ہوں تو چہرہ چھپا کر آتا ہوں کون جانے میرے دادا پر دادا کی کس کے ساتھ دشمنی تھی اور اُس کی اولاد میں سے کوئی مجھے پہچان کر ختم کر دے۔۔ جانور بن گئے ہیں صاحب۔۔۔ اس لیے تو لوگ کہتے ہیں کہ کوہستانیوں میں پٹھانوں کی ساری برائیاں تو ہیں لیکن اُن کی خوبی ایک بھی نہیں"۔ ۲۶؎

مستنصر حسین تارڑ نے وادیٔ اشکومن کے تہواروں اور رسوم و رواج کے ضمن میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک حیرت انگیز حقیقت اور عجیب و غریب اسرار ہے کہ انسان رنگ، نسل، زبان اور ملک کے لحاظ سے کوئی بھی ہو اُس کی ثقافتی رسوم کہیں نہ کہیں ایک ہو جاتی ہیں۔ایک علاقے میں ہونے والے رسوم و رواج اور تہواریں کسی دور دراز علاقے یا ملک میں وہ رسوم و رواج اور تہواریں آپس میں کسی نہ کسی صورت میں مماثلت رکھتی ہیں۔اس مماثلت کو ثابت کرنے کے لیے مستنصر نے جنوبی امریکہ، پنجاب (پاکستان) اور وادیٔ اشکومن (شمالی علاقہ جات) کی مثال پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ سر فریزر کی شہرۂ آفاق کتاب " دے گولڈن باؤ" جس کا ترجمہ " شاخِ زریں" کے نام سے ہو چکا ہے میں جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں ایک چھوٹے قبیلہ کا ذکر ہوا ہے جن کے ہاں یہ رواج ہے کہ وہاں بچے کی پیدائش کے وقت حاملہ عورت کے سرہانے لوہے کا کوئی ٹکڑا رکھ دیتے ہیں۔اُن کا عقیدہ ہے کہ لوہے کے اثر سے بچے کی پیدائش میں آسانی ہوتی ہے۔ مستنصر یہاں پر اپنی نانی کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ یہاں پنجاب میں، میری نانی نے مجھے بتایا کہ میری پیدائش کے وقت اُنہوں نے میری ماں کے سرہانے ایک تالہ رکھا تھا کہ۔۔۔اُسے آسانی ہو جائے۔

اور یہ بڑی حیرت کی بات نہیں کہ یہاں خیبر پختونخوا لکی مروت میں بھی بچے کی پیدائش کے بعد بچے کے سرہانے لوہے کا کوئی ٹکڑا چاقو، چھری وغیرہ رکھ دیتے ہیں تاکہ بچہ بلاؤں سے محفوظ رہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے شیر خوار بچوں کے سرہانے چاقو یا چھری یا درانتی رکھی دیکھی ہے۔

رسوم و رواج کی مماثلت کے ضمن مستنصر مزید بتاتے ہیں کہ افریقہ کے ایک گھنے اور سیاہ علاقے میں بارش نہیں ہوتی تھی تو بچے بزرگوں پر پانی پھینک کر انہیں اشتعال دلاتے تھے اور بارش ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔پنجاب میں ہمارے دیہاتوں میں بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے کہ بارش نہ ہونے پر بزرگوں پر پانی پھینکا جاتا ہے۔ اس طرح اگر دنیا کے کسی دور اُفتادہ علاقے میں بچے کی پیدائش پر کسی درخت کی شاخیں اُس گھر کے دروازے پر لٹکائی جاتی ہیں تاکہ سب کو خبر ہو جائے کہ اس گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔پنجاب میں ایسے موقع پر دروازے کی چوکھٹ پر شرینہ کے پتے لٹکائے جاتے ہیں اور دنیا سے بہت پرے یہاں وادیٔ اشکومن میں بھی اسی رسم کو دہرایا جاتا ہے کہ کسی گھر میں بچے کی پیدائش ہو جاتی ہے تو اس گھر کی چھوکٹ پر گندم کی بالیاں لٹکائی جاتی ہیں۔

رسوم و رواج اور ثقافت کی یہ یک جہتی اور یکسانیت ثابت کرتی ہے کہ نسلِ انسانی کا آغاز ایک تھا۔ بے شک لوگ مختلف قبیلوں، نسلوں علاقوں، خطوں اور ملکوں میں تقسیم ہو کر منتشر ہو گئے ہیں مگر اُن کی آبائی اور قدیم حِس مشتریک اور ایک ہیں۔

وطن عزیز میں بہت سے علاقے آج بھی ایسے ہیں جو جدید دور کی سہولتوں سے محروم ہیں اور یہ محرومی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود اُن علاقوں کے باسی جدید سہولتوں کو اپنانے سے انکاری ہیں۔ اس بارے میں خود اُن کی اپنی نرالی منطق ہے۔ اُن کے خیال میں سڑکوں کے بننے سے اور جدید سہولیات کے آنے سے دوسرے علاقے کے اجنبی لوگ یہاں آئیں گے جس کی وجہ سے عریانی و فحاشی پھیلے گی۔ اس منطق کے پیروکار اکثر و بیشتر فاٹا کے علاقے میں پائے جاتے ہیں مگر یہ بات بھی مسلم ہے کہ سب فاٹا کے باسی اس چیز کے مخالف نہیں بلکہ یہ سوچ بعض علاقوں تک محدود ہے جیسا کہ مستنصر حسین تارڑ نے نگر اور ہنزہ کے عوام کا جدید سہولیات کے حوالے سے اُن کی سوچ اور نقطہ نظر کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ نگر اور ہنزہ کے عوام کے مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نگر کے باسی پرانی روایات کے امین ہیں۔ وہ جدید سہولیات کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں اپنے معاشرے کے لیے زہر قاتل سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے موقع پر نگر کے لوگوں نے احتجاج کیا اور اس شاہراہ کی تعمیر کی صورت میں اُنہیں اپنی روایات تباہی کا شکار نظر آئیں حالانکہ اس سوچ نے ریاست نگر کو ایک یتیم کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا اور اس طرح ریاست نگر ریاست ہنزہ سے کہیں زیادہ زرخیز اور دلآویز ہونے کے باوجود الگ تھلگ رہ کر تعلیم، اقتصادی ترقی، جدید سہولیات اور سیاحوں کی منافع بخش تجارت سے محروم رہ گئی جبکہ ہنزہ والوں نے شاہراہ قراقرم کی تعمیر کو خوش آمدید کہا اور حکومت سے باقاعدہ درخواست کی کہ اس شاہراہ کو وادیٔ ہنزہ میں سے گزارا جائے ہم ہر قسم کا تعاون بھی کریں گے اور اسے ایک احسان عظیم بھی مانیں گے نتیجتاً وادیٔ ہنزہ پوری دنیا سے خصوصی طور پر چین اور پاکستان سے منسلک ہو گئی۔ مستنصر حسین تارڑ نے سرسری طور پر بعض مذہبی رہنماؤں کا ذکر بھی کیا ہے جو وادیٔ نگر میں شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے خلاف احتجاج میں شریک تھے۔ وہ اپنے سفرنامے " راکاپوشی " میں لکھتے ہیں:

"شاہراہ قراقرم کو بنیادی منصوبے اور نقشے کے تحت ریاست نگر کے درمیان میں سے ہی گزرنا تھا کہ یہی قدرتی راستہ تھا لیکن جب شاہراہ تعمیر کے دوران

> نگر کے قریب ہوئی تو اہل نگر نے جن میں مذہبی رہنما بھی شامل تھے، احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ ہم اس شاہراہ کو اپنے علاقے میں سے نہیں گزرنے دیں گے کہ یُوں ہمارے گھروں کی بے پردگی ہو گی، اجنبی لوگ اور سیاح ہمارے قصبوں میں گھومتے پھریں گے ، عریانی اور فحاشی کو فروغ حاصل ہو گا وغیرہ۔۔۔ ۲۷؎

اس سفرنامے میں مستنصر حسین تارڑ نے نگر کو ہنزہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوبصورت اور مرکز نگاہ ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کے عظیم گلیشئر نگر ہی میں واقع ہیں۔ دنیا کے بڑے برفانی وجود میں سے ایک ہیسپر ہے جو اسی نگر میں واقع ہے۔ " رش لیک" نامی ایک بلند ترین جھیل اسی نگر میں واقع ہے۔ یہاں پانی کی فراوانی ہے۔ درخت پھلوں سے لدے ہوتے ہیں۔ راکاپوشی کا سفید تاج محل جسے دنیا کا سب سے پر کشش چوٹیوں میں شمار کیا جاتا ہے وہ بھی نگر میں واقع ہے مگر اہل نگر کے ایک غلط فیصلے نے ریاست نگر کو دنیا کی نظروں سے معدوم کر دیا۔ مستنصر حسین تارڑ کے بقول اہل نگر کے لوگ ذرا کھردرے اور غصیلے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ہنزہ کے لوگ نہایت نرم اور ملنسار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہراہ کی تعمیر سے ہنزہ کی قسمت جاگ اُٹھی اور یہاں بین الاقوامی معیار کی ایسی درسگاہیں بن گئی ہیں جن کی نظیر دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہنزہ کے بارے میں مستنصر کے خیالات ملاحظہ کریں، لکھتے ہیں:

> "ادھر شاہراہ قراقرم نے ریاست ہنزہ کو دنیا کے نقشے پر نمایاں کر دیا۔۔ یوں بھی ہنزائی لوگ عہد جدید سے قدم ملا کر چلنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اُن کا تعلیمی معیار حیرت انگیز ہے۔ خواندگی کی شرح سو فیصد ہے۔ بین الاقوامی معیار کے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں ایسی ہیں اسلام آباد اور لاہور کے تعلیمی اداروں کی کمی محسوس نہیں ہوتی، لوگ ملنسار ہیں، مددگار ہیں۔۔۔ میر آف ہنزہ ہماری دکان کسان اینڈ کمپنی سے آج سے چالیس برس پیشتر درآمد شدہ پھولوں کے بیج منگایا کرتے تھے۔ ۲۸؎

شمالی علاقہ جات کے لوگوں کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ خواتین کی حد سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔ خواتین سیاح بغیر کسی محرم کے گھومتی پھرتی ہیں۔ اُنہیں کسی چیز کا خوف یا ڈر

محسوس نہیں ہوتا۔ وہ ہر جگہ اس طرح بلا خوف و خطر گھومتی رہتی ہیں کہ جیسے وہ خواتین کی بجائے مرد حضرات ہوں۔ خواتین کا اس طرح آزادانہ گھومنے پھرنے کہیں اور تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی نگر کے باسیوں کی اس خصوصیت کا بڑی تحسین کے ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ اس نے وہاں بچشم خود خواتین کو مردوں کے بغیر سیاحت کرتے دیکھا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"یہاں میں نے کم از کم ڈیڑھ درجن خواتین کا ایک غول دیکھا جو کسی بھی محرم کے بغیر شمال میں بے دریغ آوارہ گردی کر رہی تھیں۔ ۲۹؎

مستنصر حسین تارڑ کی ایک قاری اُستانی مز ملہ شفیق نے مستنصر حسین تارڑ کو ایک خط لکھا کہ اُنہیں شمال بہت پسند ہے اور اس کی سیر و سیاحت کے لیے اُن کا دل مچلتا ہے مگر اُن کے مرد اُن کا ساتھ دینے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اُنہیں اس علاقے کے باسیوں کی درج ذیل الفاظ میں تعریف کی:

"ہمارا شمال، گلگت بلتستان ابھی تک معصوم اور آلودگی سے پاک ہے۔ یہ لوگ عورت کی عزت کرتے ہیں، بری نظر اُن کے ہاں مفقود ہے، بے شک تم تن تنہا اس کی برفانی وادیوں میں بھٹکتی پھرو، تمھیں کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا"۔ ۳۰؎

مز ملہ شفیق نے ایسا ہی کیا اور چار پروفیسروں کے ہمراہ گلگت بلتستان گئی۔ یہاں کے چپے چپے کی سیر کی، خوب گھومی پھری، ہر جگہ گئی مگر مجال ہے کہ کسی نے اُنہیں عورت ذات سمجھ کر اُن پر نگاہِ غلط ڈالی ہو بلکہ سیر و سیاحت کے بعد جب مز ملہ شفیق مع اپنے ساتھیوں کے واپس چلی گئی تو اُس نے مستنصر کو خط لکھا کہ آپ کی بات صحیح نکلی۔ ہم پانچوں تن تنہا دندناتی پھرتی رہیں مگر کسی نے ہماری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ ہمیں تو شدید کوفت ہوئی کہ کوئی ہمیں دیکھ کیوں نہیں رہا؟

مہذب قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی گردانی جاتی ہے کہ وہاں ایک پرامن معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جرائم کی شرح کم ہوتی ہے اور لوگوں کا رویہ شائستہ اور سلوک مثالی ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہاں باتوں باتوں میں مہذب قوموں اور مہذب شہریوں پر بڑی زبردست چوٹ کی ہے اور کہا ہے کہ مہذب قوموں اور مہذب شہریوں کی نظروں میں بلتستان ابھی اَن سولائزڈ ہے۔ ابھی یہاں تہذیب کا نام و نشاں نہیں حالانکہ سولائزڈ قوموں

کی تعریف بلتستان پر پوری طرح صادق آتی ہے جس طرح سوِلائیڈز معاشرہ پر امن رہتا ہے یہاں بلتستان میں بھی ایسا امن ہے۔ مستنصر اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں ان نام نہاد سوِلائیڈز قوموں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے اگر امن جیسی بڑی خصوصیت کے باوجود بھی اُن کی نظر میں بلتستان اَن سیوِلائیڈز ہے تو پھر سویلائزیشن کس چیز کا نام ہے؟ لکھتے ہیں ” :

> بلتستان اس لحاظ سے منفرد ہے کہ کہ یہاں جرم نہ ہونے کے برابر ہے، قتل، ڈاکے اور چوری سے خالی یہ سرزمین ابھی اَن سیوِلائیڈز کہلاتی ہے۔۔۔ تو پھر سویلائزیشن کیا ہے۔۔۔“ ؟ ۳۱؎

تجربہ کار اور جہاں دیدہ لوگ جب کبھی اور جہاں کہیں کوئی بات چیت کرتے ہیں تو وہ اپنی بات چیت مؤثر اور مدلّل بنانے کے لیے چھوٹے چھوٹے واقعات کا سہارا لیتے ہیں اور یہ محض سہارا نہیں ہوتا بلکہ اس قسم کی روایات، حکایات اور واقعات سے اُن کی بات چیت ایسی پر مغز اور معتبر بن جاتی ہے کہ کسی کو اسے رد کرنے کی جراَت نہیں ہوتی۔ یہ ملکہ یا صلاحیت انسان کو تب حاصل ہوتی ہے جس نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہو، جو بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا رہا ہو، جو انسانوں کی محفلوں، مجلسوں اور اجتماعات میں اُٹھتا بیٹھتا رہا ہو اور جسے تہذیب، تاریخ اور ثقافت سے یاری ہو۔ ان نکات کی روشنی میں اگر مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت کو پرکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مستنصر کے اندر بھی وہی بزرگوں کی روح بول رہی ہے۔ ٹیلی ویژن پر میزبانی کرتے ہوئے اُن کی بات چیت کا انداز اور سفر ناموں میں اس کا یہ انداز تحریر اس بات کی شاہد ہے کہ مستنصر نے دنیا میں اپنی آنکھوں سے جو دیکھا، جو سنا اور جن لوگوں میں اُن کی اُٹھک بیٹھک رہی اور زندگی کے تجربات سے اُنہوں نے جو کچھ سیکھا اُس کی گہری چاپ اُس کی تمام تخلیقات میں خاص کر سفر ناموں میں موجود ہے۔ وہ اپنی بات کی توثیق کے لیے، وہ اپنے مقصد کی وضاحت کے لیے اور تحریر میں جاذبیت پیدا کرنے کے لیے قدم قدم پر چھوٹی چھوٹی حکایت سناتے ہیں، اُن کی چھوٹی چھوٹی مثالیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے کسی عورت نے اپنے بالوں میں موتی ٹانکے ہوں یا کسی مصور نے کسی منظر کو اُجاگر کرنے کے لیے پھولوں کی کیاری بنائی ہو۔ یقیناً یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں ادب کا وہ خزانہ ہے جسے مستنصر نے سفر ناموں میں چھپا کر ہمیں اس کی جھلکیاں دکھا رہا ہے۔

مستنصر ایک وسیع المشرب انسان ہیں۔اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اُنہوں نے انسانوں کو، بیابانوں کو، معاشروں کو، مختلف تہذیبوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قریہ قریہ، نگر نگر گھوم پھر کر اُنہوں نے زندگی کو جتنا قریب سے دیکھا ہے اتنا قریب سے بہت کم ادیبوں نے دیکھا ہو گا یہی وجہ ہے کہ اُنہیں ہر ملک، ہر قوم، ہر علاقے اور ہر معاشرے کی معاشرت، وہاں رہنے والے لوگوں کی بود و باش، اُن کا ذریعۂ معاش اور اُن کی ذہنی، نفسیاتی، جذباتی سطح کا بخوبی علم ہے۔ مستنصر بلتی تہذیب سے بھی واقف ہیں۔ کالاش کی معاشرتی زندگی بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے ہے اور چترالیوں، پٹھانوں اور افغانیوں کی زندگیاں بھی اُن کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں جن کا تذکرہ مستنصر نے اپنے سفر ناموں میں جابجا کیا ہے۔ ثبوت کے لیے ذیل کا اقتباس بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں :

> "مقامی روایت تھی کہ ایک چترالی قدرے آرام طلب ہوتا ہے۔ وہ اگر ایک دن میں بیس روپے کمالے تو تب تک دوبارہ کام پر نہیں جاتا جب تک وہ بیس روپے خلاص نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے بچا تا کچھ نہیں۔
>
> ایک پٹھان ہر کام کرلیتا ہے۔ پنجاب کی کشمیری برادری کی طرح، مشقت اس کے لیے ایک ایسی محبت ہے جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے۔ وہ روزانہ پچاس روپے کماتا ہے تو ان میں سے صرف پانچ روپے خرچ کرتا ہے اور باقی شلوار کے نیفے میں سنبھال لیتا ہے۔
>
> جب کہ ایک افغان۔۔ اگر وہ بدخشاں کا افغان ہے تو محنت مشقت سے اپنا بدن توڑلیتا ہے، سو روپے روزانہ کماتا ہے اور پھر عمدہ خوراک کھاتا ہے، قہوہ پیتا ہے اور بدخشانی قالینوں پر براجمان ہو کر موسیقی سنتا ہے، اگر ممکن ہو تو کچھ بچا لیتا ہے اور اگر نہیں تو نہ سہی"۔ ۳۲۔

کالاش یا کیلاش قبیلہ کوہ ہندوکش میں واقع ہے۔ اس قبیلے کی زبان کالاشی ہے۔ یہ قبیلہ خیبر پختونخوا کے ضلع چترال میں آباد ہے اور چترال شہر سے دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ کالاش کو کافرستان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جو بنیادی طور پر تین درّوں پر مشتمل ہے۔ بمبوریت، رمبور اور بریر۔ یہاں رہنے والے لوگ کالاشہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد یہاں پر بہت کم ہے۔ کیلاشیوں کی ثقافت اور رسوم ورواج دیگر تمام قبائل سے بالکل جدا ہے اس وجہ سے سیاح ان لوگوں

کی شادیوں، اموات، مہمان نوازی، میل جول، محبت، مذہبی رسومات اور سالانہ تقاریب وغیرہ میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ کالاشیوں کا خیال ہے کہ وہ سکندر اعظم کی لشکر سے یہاں رہ گئے تھے اس لیے وہ نسلاً خود کو یونانی کہتے ہیں۔ یہاں کے لوگ کئی خداؤں کو مانتے ہیں اور یہ قدرت اور روحانی تعلیمات کے ساتھ گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ کالاشی قبائل میں قربانی کا عام رواج ہے جو ان کی تین وادیوں میں خوشحالی اور امن کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ یہ قبیلہ مختلف رواجوں، قصے کہانیوں اور تاریخی حوالوں سے قدیم روم کی ثقافت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی سے پہلے یہاں پر مختلف رسوم ورواج رائج تھے مگر یہاں پر بے شمار لوگوں کے قبول اسلام سے ان رواجوں میں کافی کمی آئی۔ یہاں پر مساجد بھی ہیں۔ تین ہزار کے قریب کالاشیوں یا اُن کی اولاد نے اسلام قبول کیا مگر یہ لوگ آج وہی آباد ہیں اور اپنی زبان اور قدیم ثقافت پر کاربند ہیں۔ ان لوگوں کو اب "شیخ" کہا جاتا ہے اور یہ کیلاش قبیلہ میں اب جداگانہ اثرورسوخ رکھتے ہیں۔

کیلاش میں مرد عام پاکستانی پوشاک شلوار قمیص پہنتے ہیں۔ بچوں میں بھی یہ لباس زیادہ مقبول ہے۔ یہاں کی عورتیں سیپیوں اور موتیوں سے سجائی گئی لمبی اور سیاہ رنگ کی پوشاکیں زیب تن کرتی ہیں۔ کالے لباس کی وجہ سے یہ " سیاہ پوش" کے نام سے مشہور ہیں۔ کیلاش میں " باشیلانی" نام کا ایک گاؤں یا جگہ ہے جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ جب عورت کے مخصوص ایام شروع ہو جاتے ہیں یا کوئی عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو اُنہیں بچہ جننے تک لازماً " باشیلانی" میں رہنا پڑتا ہے۔ پیدا ہونے والے بچے کو " باشیلانی" کہا جاتا ہے۔ خواتین حیض والی عورت کو یا حاملہ عورت کو اپنے مرد وزن کے درمیان رہنے کو بد شگونی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ان مخصوص ایام میں عورتوں کا مردوں کے درمیان رہنے سے اُن کے رزق کی برکت ختم ہو جاتی ہے۔ موسم چاہے جتنا بھی شدید ہو۔ وہ مخصوص ایام میں اپنا گھر چھوڑ لیتی ہیں اور ' بشالینی ' میں ان کے گھر سے کھانا لایا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کو باہر کہیں پر بھی جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مردوں کے لیے اس احاطے کی دیواریں چھونا سخت منع ہے۔ اگر کسی خاتون کا خاوند مر جائے تو وہ چالیس دن تک گھر کے ایک کمرے میں مقیّد ہوتی ہے اور لوگوں سے بات چیت بند کر دیتی ہے۔

یہاں پر بھی عورتیں گھروں سے فرار ہو کر بیاہ رچاتی ہیں۔ گھر سے بھاگ کر شادی کا رجحان یہاں پر عام ہے۔ بیشتر قبائل اسے ایک عمومی کام کے طور پر لیتے ہیں اور جشن کے موقع پر اس عورت کو

قبول کرلیا جاتا ہے یا بعض اوقات اس پر تنازعہ شروع ہو جاتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مرد جس عورت کے ساتھ فرار ہو جائے وہ اس عورت کے خاندان یا پہلے شوہر کو قیمت ادا کرتا ہے۔ یہ قیمت عام طور پر دگنے خرچے کے برابر ہوتا ہے جو اس عورت کا شوہر شادی اور عورت کے خاندان کو ادا کرتا ہے۔

درج بالا تفصیل دینے کا مقصد ایک تو کالاشی قوم کے تہذیب و ثقافت سے آگاہی ہے اور دوسرا مقصد مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے "چترال داستان" میں کالاشی قوم سے متعلق حقائق کی تصدیق بھی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی ان کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ لوگ قدرتی مظاہر کی پوجا کرتے ہیں۔ اپنے موسمی تہوار مناتے ہیں، رقص کرتے ہیں اور ان لوگوں کی خاص بات یہ ہے کہ آپس میں محبت سے رہتے ہیں۔ تکبر ان میں نام کو بھی نہیں۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہیں اور ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔

مستنصر نے وادئ کالاش کی بہت سی رسوم ورواج کے ساتھ ساتھ 'بشالینی' یا 'باشالی' کے بارے میں بھی مفید معلومات پہنچائی ہیں اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی کیا ہے کہ اگرچہ بالاشی عورتیں قدرت سے زیادہ قریب ہیں کیونکہ وہ اپنی قدرتی تبدیلیوں کو آشکارا کرنے میں کوئی شرم یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں اور ہم جو ان کے مقابلے میں مہذب قوم ہیں، قدرت سے دور بھاگتے ہیں اور اپنی فطری تبدیلیاں آشکارا کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں حالانکہ انسان سے جڑی یہ سب فطری چیزیں ہیں جن کو چھپانے یا آشکارا کرنے سے کچھ بنتا نہیں۔ مستنصر نے کالاشی عورت کے اس پہلو کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "بازار کے آغاز میں "باشالی" تھا۔۔۔۔۔ کالاش میں قدیم روایت ہے اور جس پر سختی سے عمل ہوتا ہے کہ جن خواتین کے ایام کے دن ہوتے ہیں انہیں وہ مدت یہاں اس باشالی گھر میں گزارنی ہوتی ہے کہ وہ ناپاک ہوتی ہیں۔ اس طور اگر کسی خاتون کا بچہ ہونے والا ہو تو وہ بھی اپنا گھر چھوڑ کر اس باشالی ریسٹ ہاؤس میں آکر استراحت فرمائے گی۔ اس کے لواحقین اسے تین وقت کا کھانا پہنچائیں گے۔ یہیں وہ بچہ جنے گی۔ شاید جئے گی شاید مر جائے گی۔

کالاش خواتین اپنے ایام کے حوالے سے ازحد بے باک ہیں۔وہ ابھی تہذیب یافتہ نہیں ہوئیں کہ ایک قدرتی تبدیلی کو چھپاتی پھریں اور اس کے بارے میں شرمندہ ہوں۔

ہم جو تہذیب یافتہ کہلاتے ہیں۔ قدرت سے دور چلے گئے ہیں۔اپنے بدن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔اُنہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔کالاش نہیں کرتے"۔ ۳۳؎

شادی بیاہ اور فوتگی کے موقع پر بھی کالاش والوں کے رسوم و رواج دیگر مذاہب اور تہذیبوں سے یکسر مختلف ہیں۔وہ جس طرح بچے کی پیدائش یا شادی کی تقریبات میں جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں بالکل اسی طرح فوتگی کے موقع پر بھی ان کے ہاں جشن ہوتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ نے بھی اپنے سفر نامے میں کالاشیوں کے ان رواجوں کا ذکر کیا ہے۔وہ فوتگی کے موقع پر لاش کو کھلی فضا میں رکھ کر تین روز ماتم کرتے ہیں۔ناچتے اور رقص کرتے ہیں۔شراب کا انتظام کیا جاتا ہے۔گیتوں کی صورت میں مردے کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔

فوتگی کی طرح ان کے ہاں شادی کی رسم بھی عجیب و غریب ہے۔لڑکے اور لڑکی کے مابین شادی اس طرح ہوتی ہے کہ لڑکے کو لڑکی پسند آجاتی ہے تو اسے بھگا کر اپنے گھر لے آتا ہے۔لڑکے کے والدین کی طرف سے لڑکی کے گھر والوں کو خبر کی جاتی ہے اور اس کے بعد باقاعدہ بات چیت کر کے شادی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

شادی شدہ خاتون کو بھی بھگایا جا سکتا ہے مگر پھر اس کے بدلے میں اس کے سابقہ شوہر کو اس کی شادی کے اخراجات کا دگنا ادا کرنا پڑتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ نے کالاش کے علاقے کی اس رواج کو بیان کیا ہے جس کے بارے میں کالاش کے علی نامی نوجوان نے بتائی۔مستنصر لکھتے ہیں:

"اور جناب اگر ایک شادی شدہ لڑکی اگر کسی اور مرد کے ساتھ جانا چاہے تو اپنے خاوند کو چھوڑ جا سکتی ہے۔لیکن۔۔۔۔اسے تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔"

"کس قسم کا تاوان"؟

"جرمانہ ہوتا ہے صاحب، قبیلے کا رواج ہے۔ رواج پورا کرو تو لڑکی کو لے
جاؤ۔ لڑکی کا خاوند کہتا ہے کہ ٹھیک ہے میری بیوی اگر تمھیں پسند کرتی ہے
تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔ میں نے اپنی شادی پر پچاس بھیڑیں قربان کی
تھیں۔ دو ٹین گھی اور پنیر کا خرچ کیا تھا اور قبیلے والوں کو دو دن دعوت کیا تھا
تو تم اب سو بھیڑیں قربان کرو اور قبیلے والوں کو چار دن کھانا کھلاؤ اور میری
بیوی لے جاؤ"۔ ۳۴۔

مستنصر حسین تارڑ نے "سنولیک" میں جہاں راستے کی دشواریوں، برفیلی ہوا کی سختیوں، پوٹروں کے ناز نخروں، اہلِ ہیسپر کے رجحانات و مشاغل اور اُن کی عادات و خصائل کا شمالی علاقہ جات کے دوسرے خطے سے فرق کا ذکر کیا ہے وہاں اُن کے مقامی ڈش کا ذکر بھی بطور خاص کیا ہے۔ ساتھ ہی اُن کے پکانے کا طریقہ بھی قلم بند کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"دوپہر کے کھانے میں ہمارے سامنے " چھَپ شورو" تھا۔
یہ مقامی ڈش سلمان کی دریافت تھی۔۔ اُس نے بیتان مَل میں محمد علی
سے خاص طور پر پوچھا تھا کہ ہیسپر کے گاؤں میں کوئی ایسی خوراک بنائی
جاتی ہے جو صرف اور صرف انہیں علاقوں سے مخصوص ہو تو اُسے بتایا
گیا تھا کہ ہاں یہ۔۔۔ چھَپ شورو ہے اور پورے گاؤں میں صرف۔۔۔
ہے جو اسے بنانا جانتا ہے۔
یہ دراصل ایک " پائی" کی طرح تھی۔ ایک بہت بڑی " پیٹی" کی مانند
۔۔۔ میدے کے اندر مرغی کے قتلوں، دھنیہ، ٹماٹر اور مقامی جڑی
بوٹیوں کو دم پخت کیا گیا تھا۔۔ ہلکا سا نمک حسب ذائقہ تھا اور مرچ
وغیرہ کا نام و نشان نہ تھا۔ گوشت ہمارے نازک دانتوں کے لیے ذرا
سخت تھا لیکن " چھَپ شورو" ایک ایسا منفرد طعام تھا جسے میں آج بھی
یاد کرتا ہوں کہ اُس میں شمال کے برفوں اور ہیسپر کے اُمڈتے ہوئے
وجود اور کوہستانی تنہائیوں کے عجیب ذائقے تھے۔ ۳۵۔

انسان گھر میں رہتا ہے، معاشرے میں رہتا ہے تو اسے محبتوں، ہمدردیوں اور مسرتوں کے ساتھ ساتھ مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ کہیں پر خاندانی جھگڑے سر اُٹھاتے ہیں تو کہیں پر اپنوں پرایوں کی نفرتوں اور کدورتوں کا سامنا کرتا ہے۔ کہیں پر رفقائے کار کی پیشہ ورانہ حسد انسان کو پیچھے کی طرف دھکیلتی ہے تو کہیں پر مذہب کے نام نہاد ٹھیکیدار انسان پر زمین تنگ کر دیتے ہیں۔ غرض اَن گنت اور بے شمار جکڑبندیاں اور پابندیاں انسان کے پیروں میں زنجیریں ڈالے انسان کے راستے کی رکاوٹ بنتی ہیں جن کی وجہ سے انسان ایک عجوبۂ روزگار بن جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس تلخ حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور اس کا حل صحرانوردی اور سیاحت بتایا ہے کیونکہ اُس کے خیال میں یہی وہ واحد فرار کا راستہ ہے جو انسان کو خاندانی رنجشوں، معاشرتی بندشوں اور مذہبی منافرت سے نجات دلا کر کچھ عرصے کے لیے سکون آور زندگی بخش دیتا ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> ”ہم بھی فرار ہو کر آئے تھے۔۔۔۔۔۔ ہمارے تعاقب میں۔۔۔۔ ہمارے گھروں کی آسائشیں اور خاندانی کدورتیں تھیں۔۔ دوستوں کے پیشہ ورانہ حسد تھے جو بے لگام گھوڑوں کی طرح ہمارا پیچھا کرتے تھے۔۔۔ جکڑیاں بندیاں اور زنجیریں تھیں جو ایک شخص کو تہذیب یافتہ اور معزز بناتی ہیں اور دراصل اُسے نامرد بناتی ہیں۔
>
> اخلاقی قیود تھیں جن سے تجاوز کرنے پر گھر والے خودکشی کی دھمکی دے کر آپ کو زیر کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔
>
> شناخت اور مذہب کے لبادے تھے جو دم گھونٹ دیتے تھے۔۔
>
> ہمارے تعاقب میں بھی بہت کچھ تھا اور ہم اُس سے ۔۔۔۔۔ چلیئے ایک شب کے لیے ہی سہی فرار ہو کر سوختر آباد میں آگئے تھے۔۳۶ ۔

بزرگوں، پیروں اور نیک لوگوں کے مزارات ہر جگہ ہوتے ہیں اور ہر علاقے کے لوگ ان نیک لوگوں سے نہ صرف محبت و عقیدت رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان سے اندھی عقیدت ہونے کی وجہ سے اُن سے ایسی ایسی باتیں منسوب کی جاتی ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ آج کل پیروں اور بزرگوں کے مزارات پر عرس کے نام پر جو بیہودگی دیکھنے میں آتی ہے اگر پیر صاحب خود اُٹھ کر یہ بیہودگی اور خرافات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو شاید وہ غم و غصے سے دوبارہ مر جائیں۔ بہر حال ایسی باتوں سے پیر

وں اور بزرگوں کی بزرگی پر کوئی حرف نہیں پڑتا البتہ وہاں کے لوگوں کی جاہلیت ضرور آشکارا ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ جب وادیٔ شمشال کی سیاحت پر تھے تو اُنہیں بھی رجب شاہ کی زبانی ایک بزرگ شاہ شمس کے بارے میں معلوم ہوا جن پر باقاعدہ عرس ہوتی تھی اور جن سے لوگ مرادیں مانگتے تھے اور مراد پوری ہو جانے کے بعد لوگ اپنی جان جھوکوں میں ڈال کر انتہائی دشوار گزار بلند و بالا پہاڑی پر بزرگ شاہ شمس کے مزار پر پہنچتے اور وہاں جھنڈے گھاڑ دیتے۔ شمشالیوں کا عقیدہ تھا کہ شاہ شمس اُن کی ہر مراد پوری کر سکتا ہے۔ اس لیے جو بے اولاد ہوتے تھے وہ اولاد کی مراد مانگتے تھے، بیمار، بیماری سے نجات کی مراد مانگتے تھے، غرض ہر شخص اپنے من کے مطابق مراد مانگتا تھا۔ ان تمام گفتگو سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وادیٔ شمشال جیسا مہذب دنیا سے کوسوں دور علاقہ ہو یا کوئی جدید ترین شہر، ہر جگہ لوگوں نے پیروں، بزرگوں سے غلط اور گمراہ کن عقائد منسوب کیے ہیں جن سے ان بزرگوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

"کبھی برف گرتی ہے اور کبھی موسم خشک گزر جاتا ہے۔۔ تب لوگ نیچے آتے ہیں، ضروریات زندگی کے لیے۔۔۔ اور ہر برس شاہ شمس کے عرس پر شمشالی خواتین آتی ہیں۔۔۔۔ زیارت میں لوگ خاص طور پر ٹھہرتے ہیں اور شاہ شمس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ موسم عافیت سے گزرا۔۔۔۔۔۔ وہ ہم شمشال والوں کے بزرگ ہیں، پیر ہیں، ہم ان سے بہت کچھ مانگتے ہیں۔۔۔ جن کی مرادیں پوری ہوتی ہیں وہ جان جھوکوں میں ڈال کر وہاں پہنچتے ہیں اور جھنڈے نصب کرتے ہیں ۔۔۔۔۔ عام طور پر بچے کا مراد مانگتے ہیں جن کی اولاد نہیں ہوتی ۔۔۔ کوئی بیماری ہو تو عرض کرتے ہیں اور ہر شخص کا اپنا اپنا مراد ہوتا ہے۔۔۔۔ وہ مانگتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ادھر شمشال میں تارڑ صاحب ۔۔۔۔ تین بڑے بزرگ ہیں جن کی بہت برکت ہے۔ چہ پُرساں کی وادی میں بابا غُندی کی زیارت ہے ۔۔۔ بہت مشہور ہے ۔۔۔۔ پھر آپ جب گل مِت سے پسوّ آتے ہیں تو شاہراہ ریشم کے کنارے شاہ طالب کی زیارت ہے جدھر ڈرائیور لوگ رکتے ہیں اور اُن کے جھنڈے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔۔۔ اور پھر یہ ہمارے شاہ شمس ہے۔" ۳۷؎

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے محض کسی خطے کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت تک محدو نہیں۔ اُنہوں نے اپنے سفر ناموں میں متنوع موضوعات پر اظہار خیال کر کے اسے مختلف طبقہ فکر کے لیے دلچسپ اور قابل مطالعہ بنایا ہے۔یوں بظاہر تو اُن کی تخلیقات کو سفر ناموں کا نام دیا جاتا ہے مگر بباطن یہ تاریخ نامے، سیاست نامے، منظر نامے اور ثقافت نامے ہیں کیونکہ ان میں ان سب موضوعات پر کسی نہ کسی حوالے سے گفتگو ہوتی رہی ہے جس کی مثال زیرِ نظر اقتباس ہے جس میں مستنصر نے بظاہر جنرل نذیر احمد سے ملاقات کا احوال بیان کیا ہے مگر درپردہ مارشل لائی حکومتوں پر چوٹ بھی کی ہے جنہوں نے جمہوری حکومتوں کا بوریا بستر لپیٹ کر ملک میں مارشل لاء نافذ کیا۔چونکہ اکثریت نے رات کے اندھیرے میں یہ کاروائی کی اس لیے مستنصر نے اُن کا ذکر ' نائٹ آف دی جنرلز کے نام سے کیا ہے۔ جنرلز نے جس طرح جمہوری حکومتوں کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا۔اس کا اثر عوام کے ساتھ ادیبوں پر بھی پڑا اور چونکہ ادیب معاشرے کا ایک فعال کردار ہے اس لیے وہ جذباتی طور پر ان چیزوں کا اثر زیادہ لیتے ہیں۔ مستنصر کی نظروں میں مارشل لائی حکومتوں کا کردار کبھی مستحسن نہیں رہا اس لیے اُنہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں جنرلز پر تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "میں کبھی بھی زیادہ سوشل نہیں اور یہ بہت کم ہوا کہ میں ہائی اَپس کے پاس پہنچا یا وہ نیچے میرے پاس آئے۔۔اور جنرلز کے لیے میرے دل میں کبھی بھی کوئی نرم گوشہ نہیں رہا کیونکہ جو جنرل جانے گئے وہ پاکستان کی نائٹ آف دی جنرلز ۔۔۔کے کردار تھے لیکن یہ جو جنرل نذیر تھے مختلف نظر آتے تھے۔ ۳۸۔

اساطیری کہانیاں، دیومالائی قصے، بھوتوں پریوں کی کہانیاں یہ ہر خطے اور ہر علاقے کی ثقافت کا جز ہوتی ہیں مگر پاکستان کے شمال میں ان توہمات اور فرضی قصے کہانیوں کی جتنی کثرت ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ شمال میں دیومالائی قصے ثقافت کا اہم جز تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ لوگ پریوں، چڑیلوں اور جن بھوتوں کی ایسی ایسی کہانیاں سناتے ہیں کہ اگر اُن پر ذرا شک کا بھی اظہار کیا جائے تو وہاں کے لوگ فوراً چراغ پا ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ مافوق الفطرت کہانیاں نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہیں اس لیے وہ ان کہانیوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں۔ مستنصر نے اپنے سفر ناموں میں شمال کی دیگر خصوصیات کے ساتھ وہاں کی ثقافت کے اس رخ کا بھی جابجا تذکرہ کیا ہے اور اس ضمن میں اُن کے بہت سے مشہور

واقعات کا حوالہ بھی دیا ہے۔" نانگا پربت" میں تو ایک مولوی نے مستنصر کو باقاعدہ پریوں کے بچے دکھانے کی دعوت دی۔ 'چترال داستان' میں بھی مستنصر نے ان کے مافوق الفطرت واقعات کا ذکر کیا ہے اور اگر اُن کو مانا نہیں ہے تو یکسر مسترد بھی نہیں کیا کیونکہ مستنصر کے خیال میں جب تک کوئی صدیوں سے اس کوہستانی علاقے کا باسی نہیں ہو جاتا اور تحقیق کر کے کوئی نتیجہ اُس کے سامنے نہیں آتا تب تک ان قصوں کہانیوں پر شک کرنا ٹھیک نہیں۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"اور یہاں گوپس میں روایت یہ ہے کہ ـــ۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے دریائے اشکومن پر بلند ہوتے پہاڑ پر جو لکیریں ہیں وہ۔۔ایک اژدھے کی ہیں۔ ایک عفریت ایک ایسی بلا کی ہیں جو ہزاروں برس پہلے اس پہاڑ سے اُتری تھی۔ اُس کی دُم بہت لمبی تھی اور اُس کا جبڑا بہت چوڑا تھا۔ وہ پہاڑ سے اُتر کر وادی میں آتی تھی اور ہر رات چند نوجوانوں کو ہڑپ کر کے واپس چلی جاتی تھی اور یوں آہستہ آہستہ وادی انسانوں سے خالی ہونے لگی۔

لوگ بے بس تھے اور اب یہ معمول بن چکا تھا۔ وہ بلا چنگھاڑتی تھی اور آگ برساتی تھی اس لیے کوئی اُس کا سامنا نہ کر سکتا تھا۔ تب ایک بزرگ کا ظہور ہوا۔ وہ پہاڑ پر گئے، اُس بلا کو اُس آماجگاہ سے باہر آنے کا حکم دیا اور پھر اپنے زہد و تقویٰ کے زور سے اُسے بھسم کر ڈالا۔۔ پہاڑ پر یہ نشان اُسی بلا کے ہیں۔۔ اُسی عفریت کی نشانیاں ہیں۔

اُس وادی کے لوگ حلفیہ بیان کرتے ہیں کہ وہاں بلندی پر جہاں وہ کبھی کبھار بھیڑیں چرانے جاتے ہیں، اب بھی ایسے ڈھانچے اور ہڈیاں موجود ہیں جو کسی عام جانور یا انسان کی نہیں ہو سکتیں۔" ۳۹؎

مستنصر ایک طرف تو شمال کی اساطیری کہانی سنا کر ہمیں اُن کی ثقافت کا یہ رخ دکھا رہے ہیں تو دوسری طرف وہ بہت سنجیدہ قسم کے سوالات بھی کھڑا کر رہے ہیں جن کے جوابات کا جاننا اہلِ علم حضرات کے لیے ضروری ہے کیونکہ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ ہڈیاں اور ڈھانچے سچ مچ بلاؤں یا عفریتوں کے ہوں۔ وہ ہڈیاں ڈائنوسار کی بھی ہو سکتی ہیں جن کی باقیات بہت سی جگہوں پر دریافت ہو چکی ہیں اور لوگ ابتدا میں اُن ہڈیوں کو دیکھ کر انہیں عفریت کا نام دیتے تھے لیکن بعد میں جب تحقیق کی گئی تو

پتہ چلا کہ ازمنہ قدیم میں دیو قامت جسامت کے ڈائنوسار نامی جانور گذرے ہیں جو اب معدوم ہیں اور اُن کی صرف باقیات رہ گئی ہیں۔اس طرح دیو قامت ڈھانچوں کی بھی تحقیق کی جاسکتی ہے کہ یہ قدیم دور کے انسانوں کے ڈھانچے ہیں یا جانوروں کی باقیات ہیں اور یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ وہ سچ مچ انسانوں کے ڈھانچے ہوں مگر اُن کا قدو قامت اور جسامت موجودہ انسانوں کے تین گنا، چار گنا ہوں۔اب یہ ماہرین آثار قدیمہ کے لیے ایک چیلنج ہے کہ وہ ان ہڈیوں اور ڈھانچوں کے بارے میں تحقیق کر کے بتائیں کہ یہ ہڈیاں اور ڈھانچے اصل میں کس چیز کے ہیں اور ان کا تعلق کس دور سے ہے؟

مستنصر نے بڑے دکھ کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ہماری تحقیق کا پیمانہ محض چند علاقوں ہڑپہ، موہنجوداڑو اور مہر گڑھ تک محدود رہا ہے حالانکہ شمال میں ماہرین آثار قدیمہ کے لیے تحقیق کا بہت سارا سامان موجود ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"ہم نے ماضی کی بازیافت کے حوالے سے صرف اور وہ بھی کسی حد تک ہڑپہ، موہنجوداڑو اور مہر گڑھ کو ہی اپنی توجہ اور تحقیق کا مرکز بنایا۔شمال کے پہاڑوں کی جانب ہم نے کبھی نگاہ نہیں کی۔ ہمارے خیال میں ان برف زاروں اور ویرانوں میں ازل سے صرف بلندیاں اور گلیشیئر تھے لیکن بہت کم لوگ آگاہ ہیں کہ ان علاقوں میں موہنجوداڑو وغیرہ سے کہیں زیادہ قدیم اور شاندار تہذیب کے آثار ہیں پتن کا ہار بابل اور نینوا کی تہذیبوں سے کئی ہزار سال پہلے کے ہنر مندوں نے تخلیق کیا۔چلاس، ہنزہ، سکردو اور گلگت کی چٹانوں پر جو نقش ہیں وہ ایک جاندار تہذیب کی گواہی دیتے ہیں اور اب وادئ اشکومن کے پہاڑوں میں قدیم اور حیرت انگیز دریافت ہو رہے ہیں"۔ ۴۰؎

مستنصر حسین تارڑ کو سوات کی سیر کے دوران بہت سے پٹھانوں سے واسطہ پڑا۔ جن سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ مستنصر نے اُن کی تعریف میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔جہاں وہ پٹھانوں کے اخلاص، محبت، مہمان نوازی اور فراخ دلی سے متاثر ہوئے وہاں وہ اُن کی لالچ نہ کرنے کے جذبے سے حیران بھی ہوئے۔جب وہ منگورہ پہنچ کر " پامیر ہوٹل"نامی ایک عالیشان، جدید اور مکمل ایئر کنڈیشنڈ فور سٹار ہوٹل میں قیام کی غرض سے گئے تو اُس ہوٹل کے مالکان نے اُسے نہ صرف خوب عزت دی بلکہ ہوٹل میں وہ اور اُس کی فیملی کے مفت رہائش کا بھی انتظام کیا۔مستنصر لکھتے ہیں:

"اُنھوں نے ہماری آمد پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔۔۔ہوٹل کے رجسٹر پر نام پتے کا اندراج کرتے ہوئے میں نے اقبال صاحب سے کہا۔۔۔ہم ذرا مختصر بجٹ کے ساتھ آئے ہیں اس لیے شاید کل کوچ ہو جائے۔اس پر اقبال صاحب ذرا ناراض ہو گئے اور کہنے لگے" آپ ہمارے بھائی ہیں اور اتنی دور سے آئے ہیں۔۔۔۔آپ ہمارے مہمان ہیں۔اس لیے بھول جایئے کہ آپ کو کرایہ بھی ادا کرنا ہے۔۔۔۔بڑے خان صاحب نے بھی بے پناہ محبت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کسی قسم کا فکر نہ کریں۔آرام سے سوات دیکھیں ۔۔۔۔۔چنانچہ مجھے تسلی ہوئی کہ ان خالص اور محبت کرنے والے پختونوں کی موجودگی میں مجھے کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔مجھے اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ اگر بڑے خان صاحب یہ ہوٹل منگورہ کی بجائے اسلام آباد یا کراچی میں بناتے تو شاید بے پناہ فائدے میں رہتے لیکن اُن کا کہنا تھا کہ ٹھیک ہے یہاں فائدہ تو زیادہ نہیں لیکن کم از کم ہم سوات کی خدمت تو کر رہے ہیں اور اپنے بھائیوں کی مہمان نوازی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔" ۴۱؎

مستنصر حسین تارڑ کی یہ عادت ہے کہ جہاں سے گزرتا ہے وہاں کے ثقافتی ورثے اور تاریخی اثاثوں کا ذکر ضرور کرتا ہے جن سے اگر ایک طرف پرانی یادگاروں سے مستنصر کی دلی وابستگی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان آثار و یادگار کا ذکر کر کے مستنصر حسین تارڑ اُس علاقے کی ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی اہمیت کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔کچورا گاؤں سے نیچے اتر کر سکردو جانے والی سڑک پر سفر کے دوران مستنصر حسین کی نظر ایک خستہ حال حویلی پر پڑی۔اس حویلی کی عمارت بس کھنڈرات میں تبدیل ہونے ہی والی تھی۔ مستنصر قارئین کے سامنے جہاں اس حویلی کا خاکہ کھینچتے ہیں وہاں اس عظیم الشان ثقافتی اور تہذیبی ورثے کو مٹی میں ملتے دیکھ کر حکومتی بے حسی کا رونا بھی روتے ہیں۔اُس کے خیال میں ان تاریخی اور ثقافتی ورثوں اور یادگاروں کے خاتمے سے ہماری اپنی شناخت ختم ہو کر رہ جائے گی۔مستنصر لکھتے ہیں:

"ایک کچے بلند پلیٹ فارم پر ایک خستہ حال عمارت اپنے آخری دنوں میں تھی۔اس کا عالی شان منقش دروازہ مقفل تھا۔اس دروازے کے نقش اور

اوپر کی پر پیچ جالیاں کسی قدیم ہاتھ نے عقیدت سے تراشی تھیں۔ کھڑکیاں
ٹوٹ کر گرنے کو تھیں اور کھلی تھیں۔ مقفل دروازے کو دیکھنے سے اندر کا
منظر ایک لکیر کی صورت دکھائی دیا۔ وہاں نیم تاریکی تھی اور جہاں جہاں سے
کھڑکیاں اور روشندان ٹوٹ چکے تھے وہاں سے دھوپ کی تیزی اندر آکر
اس عبادت گاہ کے آخری لمحوں میں مخل ہوتی تھی۔ گیلریاں اور ساری
چھت لکڑی کی تھی۔۔۔ فرش پر چند چٹائیاں تھیں اور طاقوں میں بجھے
ہوئے دیئے اور اُن کی سیاہی تھی۔ یہ ایک عظیم الشان شاندار ورثہ تھا جو مٹی
ہو رہا تھا۔ بلتستان کے مختلف قصبوں میں بے شمار ایسی خانقاہیں ہیں جو بے
توجگی کا شکار ہیں۔۔۔ ایسی پر کشش اور شاندار یادگار کو تباہ ہونے کے لیے
کیوں چھوڑ دیا گیا۔۔ اس کی مرمت کیوں نہیں کی جاتی۔۔۔۔ یہ بلتستان
کے طرز تعمیر اور ثقافت کے نمائندہ ہیں اور اُن کے خاتمے پر ہمارے ہاں
کچھ بھی باقی نہ بچے گا"۔ ۴۲؎

پشتون چاہے جتنا بھی تعلیم یافتہ ہو اُس کے لہجے سے نہ صرف اُس کی قومیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ تذکیر و تانیث کی غلطیاں اُس کی قومیت کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو جاننے والے خصوصاً پنجابی، پٹھانوں کی اس عادتِ بد یا کمزوری کا حد سے زیاد مذاق اُڑاتے ہیں حالانکہ یہ اتنی فاش غلطی بھی نہیں کہ زبان کے معاملے میں کسی کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی پٹھانوں کی اس کمزوری کو نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ چھپے لفظوں میں طنز کے تیر بھی برسائے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پٹھانوں کی اس عادت کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے کہ پنجابیوں کے برعکس پٹھان گھرانوں میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور عورت کو ہمیشہ چاردیواری کے اندر محکوم رکھا جاتا ہے۔ سوات کی سیر کے دوران منگورہ سے واپسی پر مستنصر حسین تارڑ مع اہل خانہ ایک پٹھان ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے رکتے ہیں۔ آگے کا بیان مستنصر حسین تارڑ کی زبان سے سنئیے:

"ہم منگورہ سے واپس آرہے تھے۔۔۔۔

راستے میں ہم نے ایک پٹھان کیفی میں بہت مزیدار اور عمدہ کھانا کھایا اور اس
کے ساتھ جو روٹیاں تھیں اُن کی لذت اور گرم مہک ہم اب تک یاد کرتے
ہیں۔ بلاشبہ ایسی روٹی کے ساتھ کسی سالن کی ضرورت نہیں بلکہ اسے روکھا ہی

> کھایا جائے تو لطف آتا ہے اور ہاں اس کیفی کا نام "کہکشاں کیفی" تھا۔۔۔ اور کیفے کی بجائے وہ کیفی اس لیے تھا کہ پختون بھائی مؤنث کو مذکر اور مذکر کو مؤنث بنانے میں بڑے ماسٹر ہیں۔۔۔ اگرچہ وہ اکثر مذکر کو ترجیح دیتے ہیں' اپنا اپنا رواج ہے۔۔۔" ۴۳؎

اچھا سالن بنانے کے لیے لازم ہے کہ اس میں سالن کے اجزاء ایک خاص تناسب سے موجود ہوں۔ کسی ایک چیز کی کمی بیشی سالن کو بدمزہ اور بے ذائقہ بنا دیتی ہے۔ دنیا کا ماہر سے ماہر کک بھی اگر سالن میں اجزاء کے تناسب کا خیال نہ رکھے تو اُس کا سالن کبھی بھی ذائقے دار نہیں ہو سکتا، اس طرح دنیا کا کوئی ادیب بھی اس وقت تک کامیاب اور کامل ادیب نہیں کہلایا جاسکتا جب تک اُس کی تخلیق میں توازن نہ ہو، تناسب نہ ہو اور اعتدال سے عاری ہو۔ اس لیے کسی بھی فن پارے میں اعتدال و توازن کے عنصر کا ہونا از حد ضروری ہے۔ اگر اس کسوٹی پر مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کو پرکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مستنصر نے سالن کے اجزاء کی طرح حسب ذائقہ ہر چیز کا خیال رکھا ہے۔ مستنصر کو قاری کے رجحان کا علم ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے اور اسے کس قسم کی غذا اور کس قسم کی تحریر کی ضرورت ہے، اس لیے اُنھوں نے اپنے سفر ناموں کو مرغوب بنانے کے لیے ہر قسم کا مسالہ ڈالا ہے۔ اس میں قاری کو ایک کہانی بھی نظر آتی ہے ، اس میں تہذیب و معاشرت کی عکاسی بھی موجود ہے۔ مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ سفر کی صعوبتوں اور مشکلات کا بھی ذکر ہے۔ عورت کے حسن و جمال کے قصے بھی دہرائے گئے ہیں اور رومانوی رنگ کا غلبہ بھی اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔ اشعار کے بر محل استعمال کا تڑکا بھی لگا ہوا ہے۔ مختلف کرداروں کی تحلیل نفسی بھی کی گئی ہے۔ علاقائی رسوم و رواج اور اُن کے رجحانات پر بھی بات کی گئی ہے ، غرض وہ کونسے عناصر اور اجزاء ہیں جو مستنصر کے سفر ناموں میں موجود نہ ہوں اور ایک خاص تناسب، اعتدال اور توازن کے ساتھ نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر کا نام زبان زد خلائق ہے اور اُس کے سفر نامے مقبولیت کے اُس مقام پر ہیں جہاں تک پہنچنے کا ہر ادیب کا خواب ہوتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے بیشتر سفر نامے شمالی علاقہ جات کی زندگی کی کماحقہ ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ موازناتی اور تقابلی طرز تحریر اپنا کر زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بیان میں ایسا رنگ بھرتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کو نتیجے تک پہنچنے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ مستنصر ایک عام مسافر کی گرد و پیش پر سرسری نظر نہیں ڈالتے اور نہ وہ آنکھ بند کیے کوئی نتیجہ نکالتے ہیں۔ وہ مختلف تہذیبوں کا مختلف ثقافتوں، مختلف لوگوں کا، اُن کے ذہنی رجحانات کا، لوگوں کی باہمی چپقلش کا اور اس چپقلش کے نتیجے میں ظاہر

ہونے والے اثرات کا اور لوگوں کے عمل اور رد عمل کا قریبی نظروں سے مشاہدہ کرتے ہیں، پھر اسے ضبط تحریر میں لا کر نتیجے کی ذمہ داری قاری پر چھوڑ جاتے ہیں اور خود ایک کونے میں کھڑے ہو کر قاری کے عمل اور رد عمل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چترال اور گلگت کے لوگوں کے درمیان باہمی مخاصمت کو مستنصر نے کچھ یوں پیش کیا ہے:

> "چترال ہمیشہ اپنی ثقافت اور زبان کے حوالے سے اپنے آپ کو برتر سمجھتا رہا اور شاید وہ حق بجانب بھی ہے۔۔۔ اور اس نے گلگت کو ہمیشہ غیر مہذب یافتہ قرار دیا۔۔ چترال پرامن اور تہذیب یافتہ تھا اور گلگت کی کوئی شناخت نہ تھی۔۔ چترال والے برسک کے سیون اپ چشمے تک اپنی ریاست پھیلاتے ہیں اور درہ شندور کو اپنی جائیداد گردانتے ہیں اگرچہ اب وہ نصف گلگت کا ہے اور بقیہ چترال کے حصے میں آتا ہے۔۔۔ جب کبھی شندور ٹاپ پر پولو ٹورنامنٹ ہوتے ہیں تو گویا انڈیا پاکستان کے مقابلے ہوتے ہیں۔ چترالیوں کے لیے اہل گلگت کے گھوڑے نرے خچر اور گدھے ہیں۔۔۔ اور گلگت والوں کا کہنا ہے کہ پولو تو ہم نے ایجاد کیا ہے، یہ سست چترالی تو گھوڑوں کی پشت پر سو جاتے ہیں۔ ۴۴۔

جنس نگاری

جنس نگاری کے حوالے سے مغربی ادب خاصا زرخیز ہے مگر اُردو ادب میں جنسی موضوعات کی کمی نہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ سفر نامے میں جنسی موضوعات کی موجودگی ایک منفرد اور اچھوتا تجربہ ہے جس نے اُردو سفر نامے کو خاصا دلچسپ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنسی موضوعات کی وجہ سے کسی بھی معاشرے کا اصلی چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔

ویبسٹر ڈکشنری (Webster Dictionary) نے جنس یعنی " Sex " کو یوں بیان کیا ہے۔

The character of being male or female all the attributes by which males and females are distinguished any thing connected with sexual gratification or production or the urge for these especially, the attraction of those of one sex for those of other." Page 139 ۴۵۔

بعض لوگ جنس نگاری کو فحش نگاری سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ جنس نگاری اور فحش نگاری میں بعد المشرقین ہے کیونکہ جنس نگاری اصل میں جنسی جبلت کا اظہار ہے جس کا بنیادی مقصد نسل انسانی کا بقا ہے۔انسانوں میں جنسی جبلّت مخصوص حدود و قیود کے تابع ہے جس میں انسانی رشتوں کا خیال رکھا جاتا ہے جبکہ فحاشی میں انسان ایک وحشی جانور بن جاتا ہے جس میں اس کی حیوانیت کسی انسانی رشتے، معاشرتی تقاضے اور مذہبی اقدار کی پابند نہیں ہوتی۔ نیاز فتح پوری نے فحاشی کی بڑی جامع تعریف کی ہے لکھتے ہیں:

> ”فحاشی نام ہے ہر اس طریق عمل کا جو قانون قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اُصول کے خلاف خواہش نفسانی پورا کرنے کے لیے اختیار کیا جائے۔اس صورت میں وہ صورت بھی شامل ہے جس کا تعلق صرف کسبِ زر سے ہے اور جس کو عصمت فروشی کہتے ہیں۔“ ۴۶؎

اگر جنس نگاری کو وسیع مفہوم میں لیا جائے تو یہ حقیقت نگاری کے زیادہ قریب ہے۔ جنس نگاری دراصل انسانی زندگی کی عمیق نگاہ سے مطالعے کا نام ہے جس میں انسانی جذبات کی پیمائش کی جاتی ہے۔اگر حدود و قیود سے نکل کر اس جذبے کی تشریح کی جائے تو اس کے ڈانڈے فحاشی اور عریاں نگاری سے جا ملتے ہیں۔ جنسی تجربات کے تناظر میں مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں:

> ”جنسی تجربہ انسان کی زندگی کا نہایت اہم تجربہ ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں اور اس کے ساتھ اور بہت سے اہم اور سنگین تجربات انسانی زندگی کی ترکیب میں داخل ہیں، کسی ایک تجربے کو اور تجربات سے جدا کر کے اس پر ضرورت اور حق سے زیادہ زور دینا حقیقت کی ایک بگڑی ہوئی تصویر پیش کرتا ہے۔اس سے زندگی کا غلط اندازہ ہوتا ہے“۔ ۴۷؎

اُردو ادب میں جنس نگاری کا رجحان عام نہیں مگر بیشتر ادیبوں کے ہاں جابجا اس کے نمونے ملتے ہیں۔اگر اسی تناظر میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مستنصر کے ہاں بھی یہ رجحان موجود ہے مگر کہیں پر اُنہوں نے کھل کر اس بابت اظہار خیال کیا ہے اور کہیں پر دبے دبے لفظوں میں اس کی وضاحت کی ہے۔خاص طور پر مستنصر کے بیرونی ممالک پر لکھے گئے سفر ناموں میں اس کی مثالیں زیادہ ملتی ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب و معاشرت میں جنس کے معاملے میں زیادہ حدود و قیود نہیں البتہ اندرون ملک شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں میں جنس نگاری

کم کم دکھائی دیتی ہے اور کہیں پر موجود بھی ہے تو اُنھوں نے اشاروں کنایوں سے اس کا ذکر کیا ہے یا پھر کسی مجرد چیز کو مجسّم بنا کر اپنی اس جذبے کی تسکین کی ہے جیسا کہ درج ذیل مثال سے ظاہر ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"دیوسائی کی جو چوٹیاں اُٹھتی ہیں، وہ ہمیشہ پستہ قد اور ٹھگنی سی دکھائی دیتی ہیں اور ان پر برف کی چادر دیکھ کر لگتا ہے جیسے ایک لڑکی وقت سے پہلے جوان ہو گئی ہو اور اپنے غیر مناسب بند کو چھپانے کی کوشش میں ہو۔ اس کے بدن پر وہی اُبھار اور بناوٹ ہو جو ایک خاص عمر میں ہی چھب دکھا لیتے ہیں اور اب غیر قدرتی لگ رہے ہوں۔ اس کا جواز بے حد سادہ ہے۔ جس چوٹی کی بنیاد ہی چودہ ہزار فٹ سے شروع ہو، وہ آخر کتنی بلندی تک جا سکتی ہے۔" ۴۸؎

جنس نگاری مستنصر کا اُسلوب اور موضوع نہیں اور نہ ہی وہ اس کے سہارے اپنی تخلیق کی عمارت کھڑی کرتے ہیں البتہ وہ کسی علاقے کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کی حقیقی تصویریں دکھانے کا خواہاں ہو تو وہ اس جذبے کو بطور وسیلہ استعمال کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ عورت کی سراپا کا ذکر کرتے وقت قلم اُن کی گرفت میں رہتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں ہمیشہ مشرقی روایات کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں۔ مستنصر کو چونکہ زبان و بیان پر کمال حاصل ہے اس لیے وہ جنس کے بیان میں نہایت اعتدال سے کام لیتے ہیں اور کبھی اپنے اس جذبے کو بے لگام گھوڑے کی طرح کھلا نہیں چھوڑتے بلکہ وہ ہمیشہ حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔

"چنگیزی صاحب یہ جو اسکولے کے راستے میں مشہور زمانہ گرم چشمے ہیں۔ یہ کس مقام پر ہیں ہم نے سنا ہے کہ جونہی کوئی غیر ملکی کوہ پیما ٹیم ان کے قریب پہنچتی ہے تو یہ واہیات لوگ اور ان میں خواتین پیش پیش ہوتی ہیں۔ اپنے تمام کپڑے اُتار کر قدرتی حالت میں ان میں ڈبکیاں لگانے لگتے ہیں" یہ سوال عامر نے پوچھا تھا۔

"اچھا۔۔ ڈاکٹر عمر جو آنکھیں بند کر کے دھوپ کے مزے لے رہے تھے یک دم بیدار ہو گئے۔ "ویری انٹرسٹنگ۔۔۔ طبی نکتہ نگاہ سے نیوڈ میں نہانا صحت کے لیے مفید ہوتا ہے"۔

خالد صاحب کو پسینہ آگیا اور ذرا شرما شرما کر پوچھنے لگے ۔۔۔" تو چنگیزی صاحب بالکل ننگے ہوتے ہیں کافر کے بچے۔۔۔۔" جی جناب" چنگیزی مسکرائے۔۔۔" ہاں تو چنگیزی صاحب یہ جو گرم چشمے ہیں تو یہ۔۔۔۔ کیا ہم بھی ان میں نہا سکتے ہیں۔ہم تو خیر جانگیے پہن کر نہائیں گے اور اگر وہ میمیں بھی نہار ہی ہوں تو ہم اُن کی طرف دیکھیں گے ہی نہیں۔۔۔۔۔۴۹۔

مستنصر کی یہ خوبی ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے لیے جنس کا سہارا لیتے ہیں اورانسان کی ذہنی، جسمانی اور جذباتی ضروریات اور آرزوؤں کو رومانوی اور جنسی مناظر کے رنگ میں پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے انداز تحریر اور اُسلوب میں ایسی رنگینی اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کہ قاری گھنٹوں اس کی لذت محسوس کرتا رہتا ہے وہ الفاظ و بیان کے کمال سے ایسی جذباتی تصویریں بناتا ہے کہ انسان کا اصلی روپ سامنے آجاتا ہے۔وہ انسانی نفسیات کی گرہیں کھول کر اُس کی ذہنی اور جذباتی آسودگی کو رام کرتا ہے اور واقعات و تجربات کو بیانیہ رنگ میں تحریر کرکے قاری کو ذہنی سکون پہنچاتا ہے۔

"آپ جس شکل کے عشق میں ہوں اور وہ بے شک دنیا کی خوبصورت ترین شکل ہو۔۔۔اگر آپ۔۔۔اُسے میلے کچیلے لباس میں باورچی خانے میں برتن صاف کرتے دیکھیں گے یا اگلی صبح اسے بستر پر خراٹے لیتے ہوئے سنیں گے ، منہ کھلا ہوا، نیند کی ناگوار مہک کے ساتھ۔۔۔یا اخبار کے بِل پر بحث کرتے ہوئے عینک لگائے ہوئے اس کے دانتوں میں جو دراڑیں ہیں اور جو گھن لگا ہوا ہے اسے غور سے دیکھتے ہوئے تو آپ فرار ہو جانے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں۔۔۔ لیکن اسی خاتون کو اگر آپ ایک شاندار دمک والی دعوت میں داخل ہوتے دیکھتے ہیں۔۔اس کے بہترین ملبوس میں۔۔۔اس کے بدنی زاویوں کی کشش اور دودھیا اُبھاروں کی مناسب نمائش کے ساتھ اور اس کی مسکراہٹ کے ساتھ اور آنکھوں میں کنٹیکٹ لینز کی ہلکی چمک کے ساتھ تو آپ۔۔۔ حواس کھو بیٹھتے ہیں۔۔۔اور مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جھیلیں بھی عورتوں کی طرح ہوتی ہیں۔ آپ جانے کس روپ میں دیکھتے ہیں۔۔۔ کس رنگ میں نگاہ کرتے

ہیں جب ہم یہاں پہنچے تھے تو ہم نے جھیل کرومبر پر تھکاوٹ اور پژمردگی کی
بدنی کیفیتوں سے نگاہ کی تھی۔۔۔۔ ۵۰؎

جنس ایک ایسی حقیقت ہے جن سے انکار انسان کے اپنے وجود سے انکار کے مترادف ہے مگر اس تلخ حقیقت کے سرِعام اظہار کا نہ قانون اجازت دیتا ہے اور نہ تہذیب۔ پھر بھی بے شمار ادیبوں نے اپنی اپنی تہذیب اور حدود کے اندر رہتے ہوئے اس بارے میں اظہار خیال کیا ہے خاص طور پر رومانوی ادیبوں نے تو جنس نگاری میں بہت سوں کو پیچھے چھوڑا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی جنس نگاری کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے خاص کر اُن سفر ناموں میں جنس نگاری کا رنگ زیادہ ہے جن میں مغربی ممالک اور مغربی تہذیب کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اپنے سفر ناموں میں جنسی تسکین کے لیے بے تحاشا عورت کا کردار سامنے لائے ہیں۔ اکثر ناقدین اُس کے اس انداز تحریر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اگرچہ اس بات میں کلام نہیں کہ مستنصر کے ہر سفر نامے میں میموں اور نوجوان لڑکیوں کا ذکر ملتا ہے مگر مستنصر کا دامن فحاشی اور عریانی سے پاک ہے۔ وہ یورپ کی فحاشی کا تذکرہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ یہ چیز اُن کی تہذیب و معاشرت کا ایک جزوِ لاینفک ہے البتہ اندرون ملک سفر ناموں میں اگر کہیں عورت کا موضوع عود کر آیا ہے تو وہ قاری کی نفسیات کو سامنے رکھ کر اپنے تجربات میں اُسے شریک کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کا قاری مستنصر کا قاری ہے اور جتنی رغبت اور شوق سے مستنصر کے سفر نامے پڑھے جاتے ہیں یہ سعادت بہت کم سفر نامہ نگاروں کو ملی ہے۔ " سنو لیک" میں عورت کے حسن کے بارے میں مستنصر یوں رقم طراز ہیں:

"میں نے سنا تھا کہ اسکولے کی عورتوں کے بدن چھونے سے پگھل جاتے ہیں۔
لیکن وہ عورت نہ تھی ابھی کچی ہریاول اور پانیوں کی پہلی روانی والے موسموں
میں تھی۔ وہ ڈری ہوئی تھی اور میں نے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا واقعی
اُس کا بدن یاک کے سفید دودھ سے بنا ہے، آگے بڑھ کر اُس کے پہناوے کے
گلے کو نیچے کیا۔۔۔ اور وہ دودھ تھی۔ ۵۱؎

اس مثال سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مستنصر جنس کے بیان میں بڑے توازن سے چلتے ہیں۔ وہ الفاظ کے استعمال سے ایک فضا بناتے ہیں لیکن وہ فضا ایسی ہوتی ہے جس میں عورت کا تقدس پامال نہیں

ہوتا، اُن کی شائستہ بیانی اور متوازن اُسلوب اُس کی تخلیقات کی مقبولیت کا سبب ہے۔ ذوالفقار علی احسن، مستنصر کے بارے میں یوں گویا ہے:

> ''مستنصر آج سفر نامہ پڑھنے والوں کے سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف ہیں کیونکہ اُنھوں نے ہر سفر نامہ لوگوں کی نفسیات اور پسند کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تخلیق کیا ہے۔ اُنہوں نے بارہ مصالحے کی چاٹ اور معلومات جس کے بارے میں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جہاں بھی مستنصر گئے وہاں کے معلوماتی کتابچوں کی مدد سے افسانوی انداز میں وہ سب کچھ تحریر کر دیا جو قاری پڑھنا چاہتا ہے۔ ایک عام قاری جسے پڑھنے سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ چاہتا ہے کہ ہلکے پھلکے انداز میں سفر نامہ نگار اسے بیرون ملک کی معلومات مہیا کر دے جو اُس کے لیے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہوں، اس طرح وہ گھر بیٹھے سیر بھی کرلے اور جنس لطیف یا میموں کے حوالے سے چٹخارے دار باتوں سے حظ بھی اُٹھالے۔ مستنصر کی یہ خوبی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے'' ۵۲؎

زبان و بیان اور اُسلوب

زبان پر قدرت اور بیان میں مہارت کسی بھی ادیب کا سرمایہ کا ہوتا ہے کیونکہ زبان و بیان کی خوبی ایک ادیب کو قاری کی نظر میں ہر دلعزیز بناتا ہے۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ اسے مشق وریاضت سے نکھارا تو جاسکتا ہے مگر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مستنصر حسین تارڑ کو اس خصوصیت اور اس صلاحیت سے فراخدلی سے نوازا ہے۔ اُس کی زبان نکھری ہوئی ہے اور بیان میں روانی اور شستگی ہے۔ وہ فصیح اللسان بھی ہیں اور بلیغ الکلام بھی ہیں۔ مستنصر سوچ کر الفاظ نہیں جوڑتے اور نہ ہی وہ رٹے رٹائے جملے دہراتے ہیں۔ اُس کے ذہن کی سکرین پر الفاظ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہوتے ہیں موقع اور محل کے مطابق الفاظ و محاورات اُس کے ذہن سے قلم کی چونچ تک آتے ہیں اور پھر قرطاسِ ابیض پر بکھر جاتے ہیں۔ الفاظ و محاورات کی یہ آمدوآورد کسی سوچ، کسی تجربے یا کسی خاص وقت

کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ سلسلہ چشمے کے پانی کی طرح ہر وقت رواں دواں رہتا ہے۔ مستنصر کا کام محض یہ ہوتا ہے کہ وہ تشبیہات واستعارات کے نگینوں سے مناظر وواقعات کے دامن میں گل کاری کرتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر مثال اس کا بیّن ثبوت ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"شتونگ کی شب میں ۔۔۔ اپنے غار نما خیمے میں ۔۔۔ میں ایک زخمی اور نڈھال براؤن ہمالین بیئر (ریچھ) کی طرح کراہتا اور اپنے زخم سہلاتا رہا۔۔ یہ بھورا ہمالیائی ریچھ اپنی سرمائی نیند کے لیے اپنے مخصوص غار میں پہنچ تو گیا تھا لیکن سو نہ سکتا تھا۔۔۔۔

عمر کے لمبے سفر نے میرے بدن کی رگ رگ میں تھکاوٹ کا زہر بھر دیا تھا ۔۔ جیسے موہنجودڑو کی ایک ایک اینٹ پانچ ہزار برس کی مسافت کے بعد بُھربھری اور شکستہ ہو جاتی ہے، ایسے میرا بدن تھا۔

اگرچہ اب میں وہ سنو ٹراؤٹ تھا جسے خشکی پر تڑپنے کے بعد یکدم پانی مل گئے تھے لیکن میرے گلپھڑے ابھی تک پھڑکتے تھے۔

میں وہ گولڈن ایگل تھا جو بالآخر ایک طویل پرواز کے بعد اپنے گھونسلے میں اُتر آیا تھا لیکن چونچ کھولے ہانپتا تھا۔۔۔۔۔

میں وہ سنو ٹائیگر تھا جو اپنے خون آلود پنجوں کو چاٹتا تھا"۔ ۵۳؎

ہر تخلیق کار کے لکھنے کا اپنا انداز ہوتا ہے اور یہی انداز تحریر اُن کی اور دوسرے لکھاریوں کے درمیان خطِ تنصیف کھینچتا ہے۔ اسی کا نام اُسلوب ہے۔ ہر فن پارہ اپنے خاص اُسلوب کا متقاضی ہوتا ہے اور اگر تخلیق کار اُس خاص اُسلوب کو اپنی تحریر میں نہ برتے تو اُس کا پایہ ادبی معیار سے گر جاتا ہے ۔ سفر نامہ لکھنے کے لیے شگفتہ اُسلوب کو اپنانا بے حد ضروری ہے کیونکہ قاری سفر نامہ نگار کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ سفر نامہ نگار اُنہیں جس جگہ کی سیر کراتا ہے، قاری اُس کے ساتھ ساتھ چلتا پھرتا ہے۔ اس صورت حال میں اگر سفر نامہ نگار کی زبان میں مٹھاس نہ ہو، اُس کی طرزِ تحریر میں کشش اور جاذبیت نہ ہو تو قاری زیادہ دیر سفر نامہ نگار کے ساتھ چل نہیں پاتا اور اس طرح سفر نامہ نگار یک و تنہا رہ جاتا ہے اس لیے سفر نامہ میں زبان و بیان کی شستگی، شائستگی اور شگفتگی کا بطور خاص خیال رکھنا چاہیئے تاکہ وہ قاری کو آغاز سے اختتام تک اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکے۔

شگفتہ اُسلوب کے حوالے سے جہاں تک مستنصر حسین تارڑ کی بات ہے تو یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ مستنصر کا جاندار اور پر کشش اُسلوب ہی اُس کی کامیابی کا ضامن ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں نے سفر نامے لکھے ہیں اور زمانۂ حال میں بھی سفر نامے لکھ رہے ہیں مگر جو کامیابی مستنصر کے حصے میں آئی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اُردو ادب میں سفر نامے کا قاری کم یاب نہیں بلکہ نایاب ہے۔ معدودے چند لوگ ہیں جو سفر نامہ کی کتاب اُٹھاتے ہیں مگر وہ بھی بے دلی سے اُن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سفر نامہ لکھنے والے تخلیق کاروں میں یہ سہرا مستنصر حسین تارڑ کے سر بندھتا ہے جس کے سفر نامے لوگ ناولوں اور افسانوں کی طرح پڑھتے ہیں اور اشعار کی طرح اس پر سر دھنتے ہیں۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی لائبریری ایسی ہو جس میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کی کتابیں موجود نہ ہوں بلکہ بے شمار لوگوں کی ذاتی لائبریریوں میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کے سیٹ پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ ان کی کتابوں کو تحفوں میں دیتے ہیں اور اس کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مستنصر کا شگفتہ اور شائستہ اُسلوب ہے جنھوں نے مستنصر کو پاکستان بھر میں ہر دلعزیز بنایا ہے۔ زیر نظر اقتباس اُس کے شگفتہ اُسلوب کا ایک ٹکڑا ہے جو اُس کی کتاب 'رتّی گلی' کے آغاز سے لیا گیا ہے جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی جانب سے 'رتی گلی' جھیل کی سیر کے لیے کالج انتظامیہ کو سلیکشن کے لیے پیش ہوئے تھے اور اُن کا انٹرویو لیا جا رہا تھا۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> ”پھر ہماری شناخت ہوئی۔ خواجہ صاحب یہ جاننے کے آرزومند تھے کہ ہم میں سے کون کون کوہ نوردی کی صعوبتیں برداشت کرنے کا اہل ہے۔ اُنہوں نے ہمیں خوب ٹھونک بجا کر چیک کیا اور ایسے نازک مقامات پر چیک کیا کہ ہم شرم کے مارے سرخ ہو گئے۔ اس تفصیلی ٹھونک ٹھکائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ صاحب نے تمام رضاکاروں کو اس مہم کے لیے اہل قرار دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُنہیں بالکل اُمید نہ تھی کہ گورنمنٹ کالج میں اتنے بے وقوف داعی مہیا ہو جائیں گے جتنے کہ ہو گئے۔ ۵۴

رتی گلی جھیل کی سیر کے لیے طلباء منتخب کر لیے گئے اور اُنہیں کچھ سامان اور آلات مہیا کرنے کے لیے ایک فہرست تھما دی گئی۔ دوسرے طلبہ کے ساتھ ساتھ مستنصر کو بھی مطلوبہ آلات کی فہرست ملی۔۔۔۔ یہاں پر مستنصر نے جو شگفتہ اُسلوب اپنایا ہے اُس کی ایک جھلک ملاحظہ کریں:

"اور یہ تمام کے تمام " آلات " ہمارے لیے تو یونانی زبان میں لکھے ہوئے تھے ۔۔۔ عجیب و غریب آلات تھے۔۔۔ مثلاً۔۔ ایک رک سیک " بھئی یہ کیا بلا ہے کس قسم کا سیک یعنی تھیلا جو رُکتا ہے۔۔ اور یہ آئس ایکس۔۔۔۔ یہ کیا ہوتا ہے جناب ۔۔۔ ہم نے تو اپنے محلے میں برف فروخت کرنے والے کو دیکھا تھا جو ایک سُوئے سے برف کے ٹکڑے کرکے پاؤ پاؤ بیچتا ہے تو اس برف کو توڑنے کے لیے ایک کلہاڑا کیوں درکار ہے۔۔۔۔۔ اور یہ الا بلا اور نا قابل فہم سامان کوہ نوردی کہاں سے دستیاب ہو گا۔۔۔ ۵۵ ے

انسانی نفسیات کی عکاسی

انسانی نفسیات کو سمجھنا فن بھی ہے اور علم بھی ہے۔ وہی لوگ انسانی نفسیات اور اس کی گہرائیوں کو سمجھ سکتے ہیں جو بھانت بھانت کے لوگوں میں بیٹھا ہو، اُن کی حرکات و سکنات، اُس کی اندازِ گفتگو، اُن کی نشست و برخاست اور اُن کی طرز زندگی کا خوب باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہو اور انسان کے پس منظر اور پیش منظر سے پوری طرح آگاہ ہو۔ مستنصر حسین تارڑ میں یہ خوبی ہے کہ وہ انسانی نفسیات کا گہرا ادراک رکھتے ہیں کیونکہ اُن کا واسطہ ہر قسم کے لوگوں اور ہر طبقے کے افراد سے پڑا ہے اس لیے اُنہیں اُن کی نفسیات جانچنے میں کوئی دقت اور دشواری پیش نہیں آتی۔ اُن کی تخلیقات میں ہزاروں قسم کے کردار موجود ہیں۔ جن میں اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں اور نچلے طبقے مثلاً ڈرائیور حضرات، مزدور،، ہنر مند، پورٹر، ملازمت پیشہ لوگ بھی بطور کردار سامنے آتے ہیں۔ اُنہیں پتہ ہے کہ کون سا کردار کس قسم کی بولی بولتا ہے اور کس قسم کے معاشرتی پس منظر سے اُن کا تعلق ہے اس لیے وہ اُن کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر اُن کا کریکٹر اُجاگر کرتے ہیں۔ زیر نظر مثالوں میں مستنصر نے دو طبقوں کی تحلیل نفسی کرکے اُن کے کرداروں کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے۔ ان میں سے ایک پورٹر (قلی) طبقہ ہے۔ اگرچہ یہ مزدور پیشہ لوگ ہوتے ہیں مگر چونکہ یہ معاشرے میں ایک خاص قسم کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور یہ خاص ماحول اُن کی نفسیات پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے بہت سی معیوب اور ناشائستہ طور طریقے اُن کی نظر میں شائستہ اور قابل قبول ہوتے ہیں حتیٰ کہ ماں بہن کی گالیاں اُن کو عام سی گفتگو لگتی ہے اور اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ مستنصر اور اُن کے ساتھی ایک مشکل برساتی

نالہ عبور کرتے ہیں اُن کے ساتھ پورٹر بھی اُس نالہ کے پار جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی بیویوں کو گالیوں کی صورت میں اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں:

"پار پہنچ کر پورٹرز نے بے پناہ شور مچایا، چیخیں ماریں اور ایک دوسرے کی گھر والیوں کی شان میں گستاخی کر کے خوشی کا اظہار کیا" ۵۶؎

آرمی میں سپاہیوں کو جس قسم کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور ایک خاص قسم کے ماحول میں اُن کی جو نفسیات بن جاتی ہیں اُس نفسیات کا اظہار وہ گاہے بگاہے اور جانے انجانے میں کرتے رہتے ہیں۔ حالات ساز گار ہوں یا ناساز گار، غمی کا موقع ہو، خوشی کا موقع ہو، اُن کی دل آزاری ہوتی ہو یا اُن کی دل براری ہوتی ہو، اُن کی زبان پر ہر وقت جی سر، رائٹ سر، گڈ سر کے الفاظ چپکے ہوتے ہیں۔ وہ عقل سے زیادہ زبان سے سوچتے ہیں اور زبان ہمیشہ تابعداری کا سبق سکھاتی ہے۔ مستنصر نے سپاہیوں کی اسی نفسیات کو سامنے رکھ کر اُن کے اس پہلو کو اُجاگر کیا ہے نیز لوئر رینک کے سپاہیوں کو میس میں جو کھانا دیا جاتا ہے وہ اتنا غیر معیاری ہوتا ہے کہ انسان تو انسان اسے جانور بھی کھانا گوارا نہیں کرتے۔ مستنصر اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"لوئر سٹاف کے کچن میں جب آرمی کے کمانڈنگ افسر تشریف لا کر جوانوں کے لیے تیار کردہ خوراک چکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا پکا ہے کیونکہ چکھنے سے اُنہیں ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ کیا پکا ہے تو صوبیدار اپنی گرجدار آواز میں بتاتا ہے کہ کیا پکا ہے اس پر کمانڈنگ آفسر ہمیشہ "گڈ بندوبست" کی شاباش دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز جب بدمزہ خوراک سے تنگ آئے ہوئے ایک جوان سے انہوں سے پوچھا کہ کیا پکا ہے تو اُس نے شُن ہو کر زیر لب کہا " والدہ صاحبہ کا بھیجا پکا ہے سر۔۔۔۔ تو افسر صاحب نے فوراً کہا "گڈ بندوبست۔۔۔ ۵۷؎

نیاریےّ وہ لوگ ہیں جو راکھ، مٹی اور ریت سے چاندی سونے کے ذرات نکالتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً ایسے پہاڑوں کی تلاش میں نکلتے ہیں جہاں مصدقہ طور پر سونے کے ذرات پائے جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ وہ ان پہاڑوں سے مٹی اور ریت اکٹھا کر کے کسی دریا کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں اور اس مٹی اور ریت کو پانی میں بھگو کر دھوتے ہیں اور اس میں سے سونے کے ذرات تلاش کرتے ہیں۔ یہ بڑی کٹھن

اور مشقت طلب کام ہے۔ کبھی کبھار ان نیاریوں کی مراد بھر آتی ہے۔ اکثریت ان میں سے ناکام ہوتی ہے اور اگر بالفرض مل بھی جائے تو وہ سونا اتنا نہیں ہوتا کہ ان کی تقدیر بدل دے۔ شمشال کے سفر میں مستنصر حسین تارڑ نے بھی ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو دریائے شمشال میں سونے کی تلاش میں اپنی قسمت آزما رہے تھے۔ مستنصر کے بقول یہ لوگ اگرچہ سونا تلاش کر کے خوب محنت کرتے ہیں مگر اُنھوں نے کبھی خوشحالی کا منہ نہیں دیکھا۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"سونے والے ہیں صاحب۔۔۔۔۔ یہ لوگ دریا شمشال میں سے سونا
نکالتے ہیں۔"
"عجیب بات ہے۔۔۔ سونا تلاش کرنے والے کبھی خوش نہیں ہوتے۔
کبھی خوشحال نہیں ہوتے۔۔۔۔۔" ۵۸؎

ہمارے ہاں پیزا اس طرح بنایا جاتا ہے کہ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لے کر، نمک اور کالی مرچ لگا کر، میدے میں خمیر، نمک، تیل ڈال کر آٹے کی طرح گوندھ لیتے ہیں اور سب چیزوں کو آپس میں خوب گھل مل لیتے ہیں پھر پین میں تیل گرم کر کے ان سب کو ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے لیے ایک مقامی ڈش پیش کی گئی جس کا نام 'چھپ شورو' تھا اور اس میں آٹے کے اندر گوشت کو دم پخت کر کے پکایا جاتا ہے مستنصر حسین تارڑ نے اس ڈش یعنی چھپ شورو کو ہنزہ کا پزا کہا ہے جس سے ایک تو مقامی ڈش سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہنزہ میں بھی قسما قسم خوراک پکانے کا رجحان پایا جاتا تھا۔

خوراک انسان کی ضرورت بھی ہے اور اس کی کمزوری بھی۔ ضرورت اس وجہ سے ہے کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے اور توانائی حاصل کرنے کے لیے خوراک کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا انسان کسی نہ کسی طرح خوراک حاصل کر کے اپنی توانائی کی ضرورت پوری کرتا رہتا ہے مگر مہذب انسان خوراک کو اپنی کمزوری نہیں بناتا، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور جانور میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ جانور موقع محل دیکھے بغیر اپنا پیٹ بھرنے کی فکر میں رہتا ہے جبکہ انسان کا مطمع نظر صرف پیٹ بھرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس طریقے سے شکم سیری کرتا ہے کہ انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔

یوں تو ہمارے مہذب معاشرے میں رکھ رکھاؤ، وضعداری اور ادب و آداب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے مگر کھانے کی میز سامنے ہو تو سب تہذیب اور اَدب و آداب بالائے طاق رکھ کر کھانے کی میز پر

ایسے ندیدوں کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں جیسے صدیوں کے بھوکے ہوں۔ کھانے کے موقع پر ایسی دھکم پیل ہوتی ہے کہ اس میں شمال، جنوب اور مشرق، مغرب کا سوال نکل جاتا ہے، بس انسان ہوتا ہے اور اس کی حرص ہوتی ہے باقی سب چیزیں ثانوی رہ جاتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی انسان کی اس بدخوئی، حرص ولالچ اور ندیدے پن پر گہرا طنز کیا ہے اور بتایا ہے کہ کھانا ہر جگہ وافر مقدار میں ہوتا ہے مگر انسان کی بھوک اُسے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ ہنزہ میں دربار ہوٹل میں مستنصر کو کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اس بارے میں وہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں :

> "میں دعوتوں میں کئی بار بھوکا رہا ہوں لیکن دھکم پیل کرکے۔۔۔ اپنی پلیٹ سے لوگوں کی کمر میں کچوکے دیتا کبھی خوراک حاصل نہ کرسکا۔۔۔۔۔ اگرچہ یہاں خوراک وافر تھی لیکن لوگوں کی بھوک اس سے کہیں زیادہ تھی۔۔۔۔۔۔ جنرل عبدالمجید ملک نے متعدد اہلکاروں میں سے کسی ایک کو پکارا" بھئی تارڑ صاحب کے لیے کھانا لاؤ۔۔۔۔۔
>
> وہ اہلکار بھاگ دوڑ کرنے کے بعد ذرا ہانپتے ہوئے میرے پاس آئے اور سرگوشی میں بولے" جناب کھانا کچن سے چلتا ہے تو میزوں تک پہنچنے سے ہی لُوٹ لیا جاتا ہے۔۔۔۔ میں کہاں سے لاؤں۔۔ ۵۹؎

ہر انسان میں تھوڑی بہت لالچ ضرور ہوتی ہے اور جب موقع ملتا ہے تو یہ لالچ انسان کو حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کے استحصال پر ضرور اُکساتی ہے۔ کارخانہ دار، سرمایہ دار اور بااثر طبقہ تو استحصال کے لیے مشہور ہے۔ غریب اور مزدور طبقے کی نفسیات بھی جدا نہیں۔ وہ بھی وقت آنے پر اپنے استحصالی رویے کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ محض سفرنامہ نگار نہیں، وہ محض دل بہلاوے کے لیے افسانے نہیں تراشتے اور نہ ہی دل پشوری کے لیے دل خوش کن واقعات سناتے ہیں۔ وہ انسانی نباض بھی ہیں۔ وہ نفسیات دان بھی ہیں اور وہ مردم شناس بھی ہیں۔ وہ انسانی مزاجوں کا ایک وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اُنہوں نے پہاڑوں، برفوں، بلندیوں، جھرنوں، چشموں اور دیگر مظاہر فطرت کی رنگینیاں بیان کی ہیں وہاں اُنہوں نے انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں جھانک کر اُن کا وسیع اور گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ مزدور طبقہ کے استحصالی رویہ اور اُن کی موقع شناسی کا پردہ سب کے سامنے چاک کیا ہے اور لوگوں کو اُن کا یہ منفی رخ دکھا کر محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ

کی یہی مردم شناسی دیوسائی مہم کے دوران اُن کے کام آئی۔ ہوا یوں کہ پورٹروں نے بیچ راستے میں مزید پورٹر ہائر نہ کرنے کی صورت میں واپس جانے کی دھمکی دی۔ اس صورت حال میں مستنصر اور اُن کے ساتھ پریشان ہوگئے کیونکہ مزید پورٹر ہائر کرنے کا مطلب اخراجات کا مزید بڑھ جانا تھا جو اُن کی استطاعت سے باہر تھا۔ پہلے تو مستنصر نے افہام و تفہیم سے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی کیونکہ پورٹروں کے واپس جانے کا نتیجہ دیوسائی مہم کی ناکامی کی صورت میں واضح تھا جبکہ دوسری طرف مزید اخراجات کا بوجھ بھی اُن کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ پورٹروں کو مستنصر اور اُن کے ساتھیوں کی مجبوری کا پتہ تھا اس لیے وہ اُن کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر، مزید پورٹر ہائر کر کے اپنا اپنا بوجھ کم کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ اپنی ضد پر ڈٹے رہے۔ مستنصر کو اُن کے اس استحصالی رویے پر سخت غصہ آیا اور کہا کہ ہم ایک بھی پورٹر ہائر نہیں کریں گے چاہے تم سب کے سب واپس چلے جاؤ۔ پورٹروں نے جب بازی پلٹتے دیکھی تو فوراً اپنی اوقات میں آگئے اور اپنی ہار مان لی۔ مستنصر حسین تارڑ مزدور طبقہ کی اس استحصالی رویے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس شام کھانے کے بعد پورٹرز نے حسب روایت بغاوت کر دی۔ علی جسے میں پچھلے سفر کے نوسٹلجیا میں۔۔ دیوسائی کی فرقت کے مرض میں مبتلا ہونے کے باعث۔۔ سکردو بازار میں اس کی دکان سے اُٹھا کر گائڈ کے طور پر ساتھ لے آیا تھا۔ دوست اور قدیمی دوست جان کر ساتھ لایا تھا۔۔۔۔ اب وہی علم بغاوت بلند کیے، طبل جنگ بجا رہا تھا۔۔۔" صاحب بوجھ بہت ہے ۔۔پورٹر لوگ کہتا ہے۔۔۔۔ کہ ہم اتنا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔"
>
> لیکن علی ۔۔یہ پورٹر لوگ یہاں تک بوجھ لے آئے ہیں۔ سکردو میں جتنے پورٹر تم نے کہے تھے، اتنے ہم نے ہائر کر لیے تھے۔۔ تو اب کیا ہوا ہے؟"
>
> بس صاحب ۔۔۔ کیا کرے ۔۔۔ دو تین پورٹر اور درکار ہے۔ بہت ضروری ہے صاحب۔ مزید پورٹر نہیں لے گا تو یہ لوگ بوجھ چھوڑ کر چلا جائے گا۔۔ مجبوری ہے۔ اور یہ دو تین فالتو پورٹر ہمارے کیمپ کے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے کیونکہ علی نے اُن سے کہا تھا کہ وہ عین وقت پر دیوسائی ٹاپ

پر پہنچیں جب صاحب لوگ اگلی صبح کے سفر کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں
تب آپ آؤ اور کیمپ کے گرد منڈلاؤ تو میں تمہیں بھرتی کر لوں گا۔" ۶۰؎

ہر ادیب صرف لکھاری نہیں ہوتا بلکہ وہ تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا بھی مالک ہوتا ہے وہ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی رکھتا ہے اور یہی بصیرت اُس کے قلم سے ایسی موتیوں کی شکل میں ٹپکتی ہے کہ قاری کی زبان سے دادو تحسین کی آوازیں نکلتی ہیں۔ مستنصر کا شمار بھی انہی صاحب بصیرت لوگوں میں ہوتا ہے اور اُس کے بصیرت افروز اقوال نہ صرف موجودہ زمانے کے بزرگوں کے لیے مشعل راہ ہیں بلکہ آنے والی نوجوان نسل کے لیے بھی ایک واضح راستے کا تعین کرتے ہیں۔ مستنصر ارتقاء کی بڑی جامعیت کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بڑوں کو اپنی باتیں نوجوان نسل پر مسلط نہیں کرنی چاہیئے اور نہ زبردستی اُنہیں اپنی سوچ ظاہر کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے کیونکہ بزرگوں اور نوجوانوں کی ترجیحات میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ نوجوان نسل پر اپنے تجربات کو مسلط کرنا خلاف فطرت بھی ہے اور خلاف ارتقاء بھی۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"ہر نسل کا حق ہے کہ وہ اپنی سوچیں بزرگوں سے مخفی رکھے کہ بزرگ اُن کی سوچوں کی تاب نہیں لاسکتے۔۔۔ اُن کا ادراک نہیں رکھتے۔۔۔۔۔ نہیں رکھ سکتے کہ اُن کی مٹی مختلف ہوتی ہے، وہ کسی اور بھٹی میں پکے ہوتے ہیں۔۔۔ ہر نسل اپنی بھٹی میں اپنی آگ اور اپنے تجربوں میں پکتی ہے اور وہ اپنے تجربے اپنے نتائج کو آئندہ نسل پر لاگو نہیں کر سکتی۔۔۔ اور اسی کو ارتقاء کہتے ہیں۔ ۶۱؎

انگریزوں کو برصغیر پاک و ہند چھوڑے برسوں بیت چکے مگر اُن کی تہذیب اور اُن کی زبان کے اثرات شاید صدیوں میں بھی ختم نہ ہوں۔ ہم کل بھی انگریزوں کے غلام تھے اور آج بھی انگریزوں کے غلام ہیں۔ ہم انگریزی لباس اور انگریزی زبان سے ایسے چمٹے ہوئے ہیں جیسے اسی میں ہماری روح مقیّد ہے۔ ہم فخریہ انداز میں فر فر انگلش بول کر دراصل لوگوں کو اپنی غلامانہ ذہنیت دکھانا چاہتے ہیں۔ اُردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دینے کے باوجود ہماری اشرافیہ اسے قبول کرنے پر کسی طور بھی تیار نہیں، حالانکہ اس ضمن میں قراردادیں پاس ہوئیں، تحریکیں چلیں، مقدمات درج ہوئے۔ سپریم کورٹ کی طرف سے اُردو زبان کو سرکاری اور قومی زبان کا درجہ دینے کے حق میں باقاعدہ فیصلہ آیا مگر ہنوز دلی دور است کے مصداق ابھی تک اُردو کو سرکاری و قومی زبان کا درجہ دینا تو درکنار اُسے زبان ہی تسلیم نہیں کیا

گیا۔ ہمارے، صدر، وزیر اعظم، پارلیمنٹیرین، بیوروکریٹس، اعلی سرکاری افسران، آرمی آفیسر زحتیٰ کہ عدلیہ کے جج صاحبان سب کے سب نے اُردو زبان کو بے یارومددگار چھوڑا ہے۔ سب انگریزی بولتے ہیں اور انگریزی میں فیصلے لکھتے ہیں بلکہ پوری کی پوری دفتری زبان ہی ہماری انگریزی ہے۔ نتیجتاً عوام الناس کا رویہ بھی بدل گیا ہے۔ وہ بھی اشرافیہ کی دیکھا دیکھی اُردو کو کمتر اور انگریزی کو برتر سمجھ کر، اسے اعلی تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کی زبان سمجھتے ہیں۔

مستنصر نے بھی درج ذیل اقتباس میں انگریزی، اُردو کے حوالے سے بات کی ہے اور اس ضمن میں انگریزی بولنے والوں اور اُردو بولنے والوں کے ساتھ چوکیدار کا رویہ بھی بیان کیا ہے جس سے عوام الناس کے غلامانہ رجحان کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ جب اپنی بیوی بچوں کے ساتھ 'شندور ہٹ' چلا گیا تو وہاں کچھ وقت گزاری کے بعد جب واپس جانے لگا تو چوکیدار نے وزیٹر بک میں کچھ لکھنے کو کہا، مستنصر نے جب رجسٹر پر نگاہ دوڑائی تو بے نظیر بھٹو صاحبہ، ضیاء الحق، شہزادی ڈیانا اور دوسرے اعلیٰ افسران کے شندور سے متعلق تاثرات انگریزی میں لکھے ہوئے دیکھے۔ مستنصر نے اشرافیہ کو آئینہ دکھانے کے لیے اپنے تاثرات اُردو زبان میں قلم بند کیے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> "آپ ادھر رجسٹر پر کچھ لکھنا چاہتے ہو تو لکھو۔۔ سب مہمان لکھتا ہے' اس نے بادل نخواستہ رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا۔۔ میں نے پاکستان کی اہم شخصیات کے تاثرات بغور پڑھے اور چونکہ وہ سب بہت اہم شخصیات تھیں، اس لیے اُن کی زبان انگریزی تھی۔۔۔ میں نے بقلم خود اُردو اور پنجابی میں درہ شندور کی توصیف کی اور اس عجز کا اظہار بھی کیا کہ بندہ بے حد شرمندہ ہے کہ پورے رجسٹر میں صرف اس کے تاثرات دیسی زبانوں میں ہیں۔ اس لیے کہ وہ انگریزی سے نابلد ہے۔ میرے دستخط کرنے کے بعد بچہ لوگ نے فوری طور پر شندور میں اپنی موجودگی رجسٹر کرنے کی غرض سے اپنے نام درج کیے۔ نگہبان کی نظروں میں میرا جو تھوڑا بہت وقار تھا، مجھے اُردو میں لکھتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی زائل ہو گیا۔ ۶۲؎

پیسے کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ پیسے کی حرص نے اور راتوں رات دولت مند بننے کے ہوس نے انسان کو اتنا زیادہ مادہ پرست بنادیا ہے کہ وہ پیسے کی خاطر مذہب کو بھی بیچ ڈالنے کے لیے کمربستہ ہو گیا ہے۔ دولت کے اسی حرص و ہوس نے شمالی علاقہ جات کے حسن کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ وہ میدان جہاں تا

حدِ نگاہ سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا، پھولوں کے کھیت دکھائی دیتے تھے اور درخت اور پودے قطار در قطار ایک روح پرور منظر پیش کرتے تھے، انسان کے لالچ نے ان تمام قدرتی نظاروں کو بلڈوزروں کے پہیوں تلے روند ڈالا ہے۔ نئے نئے ہوٹلز، گیسٹ ہاؤسز اور مسافر خانے کھل جانے سے قدرت کا نظام بگاڑ کا شکار ہونے لگا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے انسان کے اس لالچ کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کیا کہ فیئری میڈو جہاں فطرت اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہوتی تھی اور جہاں خاموشی فطرت کے حسن کو چار چاند لگاتی تھی وہاں اب رہائش گاہیں ہیں، ہوٹلز ہیں اور انسانی قہقہے ہیں جو قدرتی حسن کے لیے ایک چیلنج بن گئے ہیں۔ مستنصر کو مستقبل میں یہاں میکڈانلڈ جیسی شاپ بھی کھلی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ وہ قدرتی ماحول کو مصنوعی اور غیر فطری ماحول میں بدلتے دیکھ کر انتہائی دکھی ہوا ہے اور طنز بھرے انداز میں انسان کی مادہ پرستی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''اور اب میں اس چھوٹے فیئری میڈو میں داخل ہوتا ہوں تو اُس کی ڈھلوان پر متعدد کمرے اور چوبی رہائش گاہیں منہ کھولے کھڑی ہیں ۔بے شک یہ کیبن دیدہ زیب ہیں اور ماحول کے مطابق ہیں لیکن اس کے باوجود یہ وہ قہقہے ہیں جو نانگا پربت کی ہزاروں برس کی خلوت میں مخل ہوتے ہیں۔ اگر میں بھی تاتو کا رہنے والا ہوتا اور چھوٹے فیئری میڈو کا یہ علاقہ میری ملکیت میں ہوتا تو میں بھی اس کی ابدی تنہائی کی چنداں پرواہ نہ کرتا اور ایک بہتر زندگی کے لیے اور آسائش کے لیے سیاحوں کے لیے بغیر سوچے سمجھے یہاں ہوٹل بنا دیتا۔ میں بھی ایسا ہی کرتا کہ روٹی دنیا کی سب سے خوب صورت منظر سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔۔ کل کلاں اگر نانگا پربت کے بیس کیمپ میں میکڈانلڈ کھل جاتا ہے اور اس کی ایک چوٹی پر ایک نیون سائن آویزاں کر دیا جاتا ہے جس پر میکڈانلڈ کا ایک مسخرہ آپ کو آنکھیں مارتا برگر کھانے کی تلقین کرتا ہے تو میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا ۔۔۔پیسہ ہمیشہ مذہب کو زیر کر لیتا ہے۔'' ۶۳

مستنصر جہاں سفر نامے میں حقائق کی ترجمانی کرتا ہے وہاں وہ انسان کی مادی زندگی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اُن کے خیال میں مال، دولت، جائیداد، زروجواہر اور اسبابِ دنیا جہاں انسانوں کے لیے ضروری ہیں وہاں یہ عناصر کسی پیر، بزرگ، صوفی یا شاعر کی شہرت میں اضافے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ مستنصر نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ کسی علاقے میں رہنے والے لوگ ہی کسی بزرگ یا کسی شاعر کی بڑائی اور عظمت کا تعین کرتے ہیں۔ اگر علاقے کے لوگ مالدار اور صاحب حیثیت ہیں تو وہ اس بزرگ یا شاعر کو اتنی پروجیکشن دیتے ہیں کہ وہ اس علاقے کا نامی گرامی بزرگ یا شاعر بن جاتا ہے لیکن علاقے کے لوگ اگر غریب اوراَن پڑھ ہوں اور مادی سہولیات سے محروم ہوں تو بڑے سے بڑا بزرگ یا شاعر بھی قعرِ گمنامی میں پڑا ہوتا ہے مستنصر نے اس نکتے کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں اُجاگر کیا ہے نیز اُنھوں نے اس نکتے کے ضمن میں چترالی لوگوں کی بزرگوں سے عقیدت، اُن کے مذہبی اور تہذیبی رجحانات اور علاقے میں پائے جانے والے بزرگوں کی مقبولیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

”۔۔۔بابا سیّار چترال کے لیے وہی کچھ ہیں جو دہلی کے نظام الدین اولیاء ہیں۔ اجمیر کے لیے معین الدین چشتی ہیں۔ سندھ کے لیے بھٹائی ہیں اور لاہور کے لیے داتا صاحب ہیں۔

دراصل ہر درویش، صوفی اور شاعر کا مرتبہ، اس کی درویشی، تصوف اور شاعری کی عرش مزاجی کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ اس شہر اور اس مقام کے مطابق ہوتا ہے جہاں وہ دفن ہوتا ہے۔ اگر وہ شہر یا مقام متموّل ہو تو وہ بزرگ بھی اہم اور برگزیدہ ہو جاتے ہیں ورنہ۔۔۔ بابا سیّار کی طرح گمنام ہو جاتے ہیں۔

داتا گنج بخش بھی اگر لاہور میں نہ ہوتے۔۔۔ کسی گوپس یا وادیٔ ترچ میر میں ہوتے تو شاید اتنے پیرِ کامل اور مشکل کشا نہ ہوتے۔۔ جتنے کہ اب لاہور میں ہیں۔ اس کے علاوہ شہر کی دولت اور ناجائز دولت بھی کسی بزرگ کو برتر ثابت کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہے“۔ ۶۴؎

مستنصر محض سفر نامہ نگار نہیں وہ منٹو کی طرح بڑی بے رحمی سے حقائق کا پردہ چاک کرتا ہے۔ اُسے جعلی اور نمود و نمائش کی زندگی پسند نہیں۔ وہ بحیثیت مسلمان جو کچھ ہے وہی نظر آنا چاہتا ہے۔ ظاہر

ی حلیہ مومناں کا بنا کر دل میں بتِ کافراں سجا کر اُسے پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے جابجا کھو کھلی مسلمانی دکھانے والوں پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ مستنصر خود کو بنیاد پرست مسلمان بھی کہتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ کافرستان میں رہنے والے کافرانہ طور طریقوں کے پیروکاروں سے اُنھیں گھِن بھی نہیں آتی۔ اُس کے خیال میں عبادت میں لین دین نہیں ہوتا۔ عبادت کا مقصود صرف اور صرف رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”میری پیشانی چٹائیوں کی سختی سے ایسے مسلسل آشنا نہیں ہوئی کہ اس پر جنت کا وہ ویزا ثبت ہو جاتا ہے جسے محراب کہتے ہیں۔۔۔ لیکن میں نے جب بھی سجدہ کیا، میرے اندر نے پکار کی کہ ۔۔۔ تینوں کافر کافر آکھدے، تُوں آہو آہو آکھ ۔۔ اور اپنی رضا اور رغبت سے کیا، ثواب عذاب کا حساب کر کے نہیں کیا۔ مول تول لین دین نہیں کیا۔ وہ ترشنگ کی پگوڈا نما مسجد ہو یا استنبول کی نیلی مسجد وہ سنولیک کی برف کائنات ہو جسے شاید آج تک صرف میری جبیں نے ہی چھوا ہو یا برجی لاء درے کی ٹاپ پر ہمالیہ کے سب سے پر شوکت منظر۔۔ وہاں میں نے ایک ہی رمز پائی ہے۔ جہاں برف کا ہو یا پتھر۔ آس پاس کفر ہو، اسلام ہو یا کچھ نہ ہو جب آپ سجدے میں جاتے ہیں تو سب کچھ معدوم ہو جاتا ہے“ ۶۵؎

حُب الوطنی

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفرناموں میں حب الوطنی کے بھی رس گھولے ہیں۔ وطن سے اُس کی بے پایاں محبت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں وطن عزیز کے پہاڑوں، بلند وبالا چوٹیوں، چشموں، جھرنوں، سبزہ زاروں، دہاڑتے چھنگاڑتے دریاؤں، رنگ برنگ پھولوں اور محیر العقول مناظرِ قدرت کے گیت گائے ہیں۔ اُنھیں وطن کی ہر گھاٹی سے محبت ہے۔ وہ دیس کا ہر رنگ دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ وہ اپنائیت کا درس دیتے ہیں اور اپنے دیس کی ہر زبان کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اور جہاں کہیں خود میں یا کسی اور ہم وطن میں اس ضمن میں کمی یا کوتاہی دیکھتے ہیں تو اُن پر طنز کسنے سے بھی نہیں چوکتے بلکہ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ خود کو بھی اکثر اوقات طنز و تنقید کا نشانہ بناتے

ہیں۔ سوات کی سیر کے دوران مستنصر حسین تارڑ کا بیٹا سمیر راستے میں ملنے والے بچوں سے پشتو کے چند بول سیکھ لیتا ہے اور اپنے ابو کو اس بابت بتاتا ہے۔ باپ بیٹے کی باہم گفتگو ملاحظہ کریں:

"ابو یہ بچے کہہ رہے ہیں ادھر ایک دوکان پر پٹاخے مل جائیں گے"۔

سمیر نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سنو۔۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا' یہ تم ان کے ساتھ کیسے گفتگو کر لیتے ہو"۔

"وہ ابو میں نے راستے میں بچوں سے پشتو کے مختلف فقرے پوچھ لیے تھے پھر اُنہیں لکھ کر یاد کرتا تھا اور اب مجھے تھوڑی سی پشتو آتی ہے"۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تب میں تھوڑا سا شرمندہ ہوا کہ مجھ میں اتنی عقل نہیں ہے کہ میں اپنے وطن کی ایک زبان کو تھوڑا سا سیکھ لوں۔ میں اپنے دھن میں بھی بے زبان پھرتا ہوں اور میری خواہش یہی ہوتی ہے کہ ہر شخص وہ زبان بولے جو مجھے آتی ہے اور یوں میں ان سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ ان کے قریب نہیں جاسکتا۔۔۔۔ اور میرے بیٹے نے دو دن کے اندر اندر یہ جان لیا ہے کہ اگر سوات کے بچوں کے قریب آنا ہے تو

اسے اُن کی زبان کے چند فقرے سیکھنے چاہیءں اور ہم سب پاکستانی چالیس برس سے یہ نہیں جان سکے"۔ ۶۶؎

ہر قوم میں ہیروز ہوتے ہیں اور ہر قوم کے لوگ اپنے ہیروز کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ اُنہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، اُن پر جان نچھاور کرتے ہیں اور اُن کی ایک ایک ادا سے پیار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی یہ بھی دلی تمنا اور خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے ہیروز کو دوسری اقوام کے لوگ بھی اچھی اور قابل قدر نگاہوں سے دیکھیں اور اُن کی عزت و احترام کریں۔ وہ اپنے ہیروز کے متعلق کوئی بھی ایسی بات یا کوئی ایسا تبصرہ نہیں کرتے جن کی وجہ سے اُن کے ہیروز کا وقار مجروح ہوتا ہو یا اُن کے قد کاٹھ میں کمی آتی ہو اور نہ وہ کسی دوسرے شخص کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ اُن کے ہیروز کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی قوم کے بعض پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ افراد کی جانب

سے اپنے ہیروز کی شان میں اُن سے منسوب بعض حقائق کو منظر عام پر لانے والوں کی سرزنش کی ہے اور ببانگ دہل بتایا ہے کہ اگرچہ ہمارے ہیروز اور نابغۂ روزگار شخصیات کے بارے میں بعض حقائق سچے ہیں مگر اُن کو منظر عام پر لانا، سب کے سامنے اُن پر تبصرہ کرنا اور محفلوں میں اُن کے چرچے کرنا اُن ہیروز کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہے۔ یہ حقائق اُن ہیروز کی شخصیت کو مجروح کرتے ہیں، اُن کی تحقیر کا باعث بنتے ہیں۔ عوام الناس نہ صرف اُن سے غلط تاثر لیتے ہیں بلکہ اُن ہیروز کی منفی تصاویر اُن کے ذہنوں میں بیٹھ جاتی ہیں جن کا واضح نتیجہ قوم کے اُن عظیم سپوتوں، بہادروں اور ہیروز کی تحقیر اور بے قدری کی صورت میں نکلتا ہے لہٰذا عوام تو عوام پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقے کو بھی اس معاملے میں حدر درجہ احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیئے اور قومی اور عوامی ہیروز سے منسوب کوئی بھی ایسی بات، کوئی بھی ایسا تبصرہ نہیں کرنا چاہیئے جو عوام الناس میں بے چینی کا سبب بنے اور لوگوں کے ذہنوں میں اپنے ہیروز کے بارے میں منفی تاثر پیدا ہو۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> ”مجھے یاد ہے کہ کسی یوم اقبال کے موقع پر ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام کی میزبانی کر رہا تھا اور میرے مہمانوں میں شریف کنجاہی، مرزا منور اور میم شین شامل تھے اور اس محفل میں ان بزرگوں نے بتایا تھا کہ شاعر مشرق کا فیورٹ لباس دھوتی اور بنیان تھا اور وہ ہمیشہ فالودے کو ”پھلودہ“ کہتے تھے تو اُس گفتگو کو سنسر کر دیا گیا کہ کمال ہے شاعر مشرق اور نظریۂ پاکستان کے خالق اتنے عوامی اور سادہ مزاج ہو سکتے ہیں۔۔ یہ حقائق اُن کی شخصیت کو مجروح کرتے ہیں جو ہم نے تخلیق کر رکھی ہے۔۔۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں سینٹ پیٹرز عیسائیت اور عیسیٰؑ کے اقوال کے بارے میں وعظ کر رہے تھے اور خدا کا کرنا کیا ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ بھی وہاں آ گئے اور اُنہوں نے کہا کہ اے پیٹرز، میں نے تو یہ سب کچھ نہیں کہا جو تم میرے نام سے بیان کر رہے ہو۔۔۔ اُس پر سینٹ پیٹرز نے کہا تھا کہ اے عیسیٰؑ یہ وہ ہے جو لوگ سننا پسند کرتے ہیں۔۔۔ اب اگر تم میرے برابر میں آ کر منبر پر کھڑے ہو کر بھی یہ اعلان کرو گے کہ میں نے تو یہ نہیں کہا تب بھی لوگ یقین نہیں کریں گے۔

> یوں اگر آج علامہ اقبال بہ نفس نفیس خود آ کر یہ کہیں کہ۔۔۔ تم لوگوں نے مجھ شاعر کو کیا نام دیا ہے۔۔۔ میں تو۔۔۔ تب بھی ٹھیکدار حضرات نہیں مانیں گے۔۔۔ اور اگر قائداعظم آکر یہ اعلان کر دیں کہ میں تو ایسا پاکستان نہیں بنانا چاہتا تھا میں تو ایک جیتا جاگتا انسانی کمزوریوں کا پتلا تھا۔۔۔ یہ کھاتا تھا، یہ پیتا تھا، تب بھی پوری قوم نعرہ لگا کر کہے گی کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔۔۔ ہم سچ کہتے ہیں۔ ۶۷ ؎

مستنصر حسین تارڑ کو سوات کی سیر کے دوران بہت سے پٹھانوں سے واسطہ پڑا۔ جن سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر نے اُن کی تعریف میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ جہاں وہ پٹھانوں کے اخلاص، محبت، مہمان نوازی اور فراخ دلی سے متاثر ہوئے وہاں وہ اُن کی لالچ نہ کرنے کے جذبے سے حیران بھی ہوئے۔ جب وہ منگورہ پہنچ کر " پامیر ہوٹل "نامی ایک عالیشان ، جدید اور مکمل ایئر کنڈیشنڈ فور سٹار ہوٹل میں قیام کی غرض سے گئے تو اُس ہوٹل کے مالکان نے اُسے نہ صرف خوب عزت دی بلکہ ہوٹل میں وہ اور اُس کی فیملی کے مفت رہائش کا بھی انتظام کیا۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> "اُنھوں نے ہماری آمد پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔۔ ہوٹل کے رجسٹر پر نام پتے کا اندراج کرتے ہوئے میں نے اقبال صاحب سے کہا۔۔ ہم ذرا مختصر بجٹ کے ساتھ آئے ہیں اس لیے شاید کل کوچ ہو جائے۔ اس پر اقبال صاحب ذرا ناراض ہو گئے اور کہنے لگے " آپ ہمارے بھائی ہیں اور اتنی دور سے آئے ہیں۔۔۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اس لیے بھول جائیے کہ آپ کو کرایہ بھی ادا کرنا ہے۔۔۔ بڑے خان صاحب نے بھی بے پناہ محبت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ آرام سے سوات دیکھیں۔۔۔۔ چنانچہ مجھے تسلی ہوئی کہ ان خالص اور محبت کرنے والے پختونوں کی موجودگی میں مجھے کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ اگر بڑے خان صاحب یہ ہوٹل منگورہ کی بجائے اسلام آباد یا کراچی میں بناتے تو شاید بے پناہ فائدے میں رہتے لیکن اُن کا کہنا تھا کہ ٹھیک ہے یہاں فائدہ تو زیادہ نہیں

لیکن کم از کم ہم سوات کی خدمت تو کر رہے ہیں اور اپنے بھائیوں کی مہمان نوازی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔" ۶۸؎

تحیر و تجسس

سفر نامے کا حسن بڑھانے والے عناصر تو بے شمار ہیں مگر تجسس و تحیر اور سسپنس ایسی خوبیاں ہیں جن سے سفر نامے کے حسن کو چار چاند لگ جاتا ہے۔ عموماً تجسس اور سسپنس جاسوسی ناولوں اور جاسوسی کہانیوں میں برتا جاتا ہے مگر مستنصر حسین تارڑ کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ادب میں خصوصاً سفر نامے میں نت نئے تجربات کر کے اسے قارئین کے لیے جاذب توجہ اور حد سے زیادہ دلچسپ بناتے ہیں۔ قاری جب ایسے واقعات اور مناظر کو پڑھتا ہے اور اسے چشم تصور سے دیکھتا ہے تو اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سفر نامے کی بجائے تجسس و سسپنس سے بھرپور کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔ دراصل مستنصر حسین تارڑ قاری کے رجحان اور نفسیات کو سمجھتا ہے اُسے بخوبی یہ ادراک ہے کہ آج کا قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے اور وہ کس چیز میں دلچسپی لینے کا خواہاں ہے۔ سیدھی سادی باتیں اور عام سے واقعات میں قاری کی دلچسپی صفر ہوتی ہے۔ آج کا قاری ایسی تحریریں پڑھنا چاہتا ہے جس سے نہ صرف اُس کے ذوق جمالیات کی تسکین ہو بلکہ اُس کی نفسیات کو ایسی مہمیز میسر ہو جس سے اُس کا قلب و ذہن ناقابل بیاں سرور سے آشنا ہو۔ مستنصر حسین تارڑ نے قاری کی نفسیات کو سامنے رکھ کر عام سے واقعات کو ایسے پرپیچ اور پر تجسس میں انداز میں بیان کیا ہے جو آج کے قاری کا مطالبہ ہے۔ " ہنزہ داستان" میں تجسس و تحیر اور سسپنس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں جن کو پڑھ کر قاری کا دل اُس سے آگے کے مناظر، واقعات اور اُس کے نتائج جاننے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اور ویگن میں سوار دوسرے مسافر ہنزہ کی جانب رواں دواں ہیں۔ بشام کے قریب راستے میں ایسی تنگ سڑک آجاتی ہے جہاں ویگن کا پہیہ بالکل سڑک کے کنارے پر چلتا ہے ۔ ایک طرف عمودی چٹانیں ہیں اور دوسری طرف ایک یا دو کلومیٹر نیچے انڈس پر شور آواز کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ اس وقت کی صورت حال مستنصر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے جن میں تجسس ہے، سسپنس ہے مگر خوف ان تمام جذبوں پر غالب ہے:

"تھوڑی دیر بعد تمام مسافر ایڈونچر کے تمام جذبوں سے خالی ہو جاتے ہیں اور اُن میں قراقرم کا سیاہ خوف بھر جاتا ہے۔

ویگن یکدم بلند ہو جاتی ہے اور ایک موڑ کاٹتی ہے۔

"یہاں سے پچھلے ماہ کوہستان والوں کی بس گئی تھی"۔ اکرم خان کہتا ہے۔

"کہاں گئی تھی" راجہ گھگھیا کر پوچھتا ہے۔

"اُدھر نیچے"

"پھر؟"

"پھر پتہ نہیں۔۔۔ پچاسی مسافر تھے۔

"نکالی نہیں" ؟

"اِدھر اِس کی گہرائی کا کچھ پتہ نہیں، نکالنا کیا تھا۔۔۔ اور نکالنے کے لیے کچھ بچتا بھی ہے۔۔ '

"کیوں کیوں "

"بس کا ڈھانچہ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر گیند بن جاتا ہے۔ صاحب اور پھر نیچے چلا جاتا ہے۔ کیا نکالنا ہے"۔

"سارے ڈوب گئے؟' ' راجہ یقین نہیں کرنا چاہتا"۔ ۶۹؎

تحیّر، تجسس اور سسپنس جاسوسی ناولوں کا خصوصیت بھی ہے اور مسالہ بھی مگر مستنصر حسین تارڑ نے ان اجزاء کو سفر نامے میں سمو کر ایک ایسا امتزاج تخلیق کیا ہے کہ گویا یہ چیزیں سفر نامے کے لیے بھی جزوِلاینفک بن گئی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے درّہ شمشال کو ایک ایسا خطرناک، ناقابل عبور اور ناقابل رسائی درّے کی شکل میں پیش کیا ہے کہ شمشال کا نام سنتے ہی انسان کے بدن میں اگر ایک طرف خوف کی وجہ سے کپکپی پیدا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف اس کا تجسس اور اس درے کو دیکھنے کا اشتیاق فزوں تر ہو جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ جس سے بھی درہ شمشال جانے کی بات کرتا ہے۔ سب کے سب اس کے اس فیصلے کو پاگل پن کا نام دیتے ہیں۔ بے شک درہ شمشال کوئی عام درہ نہیں، کوئی عام گزر گاہ نہیں مگر درہ شمشال مستنصر کے حواس پر کچھ ایسا چھایا ہوا ہے کہ ہر لمحہ وہ وہاں جانے کے لیے بے تاب

نظر آتا ہے، جس طرح کسی جادو گر کی جان کسی طوطے کے اندر بند ہوتی ہے بالکل اسی طرح مستنصر کی جان شمشال کے اندر مقیّد ہے۔ لکھتے ہیں :

"۔۔۔ شمشال۔۔۔ کسی افغان کارواں سرائے کی کچی گنبد دار کھوٹڑی کی تاریکی میں یکدم جل اُٹھنے والا ایک دیا تھا۔۔۔ اور اس نے میرے بدن کی کچی۔۔۔ مٹی کی کھوٹڑی کو روشن کر دیا۔۔۔ لوگ کہتے تھے کہ اس وادی کا راستہ جتنا جان لیوا ہے اس کی خوب صورتی اس پیمانے کی نہیں۔۔۔۔۔

تو میں وہاں کیوں جانا چاہتا تھا۔۔۔ اس کے باوجود کہ وہاں تک کا راستہ شمال کی تمام وادیوں کی نسبت زیادہ پر خطر ہے۔

اس لیے کہ۔۔۔۔۔ وہ وہاں ہے۔

جیسے کوہ پیما جارج میلوری سے پوچھا گیا کہ تم ایورسٹ پر کیوں جانا چاہتے ہو تو اس نے وہ فقرہ کہا تھا کہ جو اب ایک ضرب المثل بن چکا ہے کہ ۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ وہاں ہے۔

اسی طرح۔۔۔ میں بھی شمشال جانا چاہتا تھا

اس لیے کہ۔۔۔۔ وہ وہاں ہے۔ ۷۰؎

مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ " سفر شمال کے" دو اسفار پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سوات کے سیر کی روداد ہے جبکہ دوسرے حصے میں درہ خنجراب کی سیاحت کا احوال ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی بیگم میمونہ اور اپنے تین بچوں سلجوق، سمیر اور چھوٹی بیٹی عینی کے ہمراہ اپنی نیلی کار میں سوات کی سیر کے لیے نکلتے ہیں اور یوں پہلے سفر نامے کا آغاز ہوتا ہے۔ خنجراب کے سفر میں بھی نہ صرف اُس کا پورا گھرانہ اُس کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ اس بار اس کا دوست قاضی غلام صابر اور اُس کے تین بچے بھی شریکِ سفر ہوتے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایسے خطرناک مہمات میں مستنصر حسین تارڑ کیوں کر اپنے بچوں کو خطرات میں ڈالتے ہیں۔ شاید یہ اُس کا جذبۂ جنون ہے جس نے اُنھیں خطرات کا عادی بنا دیا ہے اگر مستنصر حسین تارڑ کو خطروں کے کھلاڑی کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ مستنصر حسین تارڑ کے تمام

سفر ناموں میں اس قسم کے بیسیوں واقعات موجود ہیں جن میں تجسس، خوف اور سسپنس اپنی پوری آب و تب کے ساتھ موجود ہوتا ہے جو قارئین کے نفسیاتی ذوق کی تسکین پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔

ہنزہ کی طرف سفر کے دوران ایک مقام پر پتھروں اور پانی کا ملا جلا سیلاب، تودوں کی صورت میں سڑک پر زور و شور کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس سیلاب کے دونوں جانب گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور اُن کے ہیڈ لائٹس مہیب اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ اس وقت کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں:

> ایک تاریک شب۔ شاہراہِ قراقرم پُر مہیب چٹانوں میں سے بہتا ہوا پتھروں کا شور۔ دریائے سندھ اگرچہ کہیں گہرائیوں میں گم لیکن اس کی موجودگی کا وسوسہ۔ پہاڑ جھکے ہوئے۔ سڑک پر ایک سیلاب اور جیپوں اور ٹرکوں کی فُل ہیڈ لائٹس جو تاریکی میں آسمانی چڑیلوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس شور اور اس روشنی میں گھومتے ہوئے چند نامانوس چہرے۔۔ اور بھوک اور جسم اور اعصاب کی تھکاوٹ۔۔۔۔۔ ’ رات تو یہیں کاٹنی پڑے گی صاحب‘‘ اکبر خان نے اندھیرے میں سے بر آمد ہوتے ہوئے مجھے کہا۔’’ ویگن پار تو نہیں جا سکتی ‘‘ ’’یار تم کوشش تو کرو‘‘ نواز نے مشورہ دیا۔ ’کوشش؟ وہ ٹینکر والے نے بھی کوشش کی تھی اُس کا حشر دیکھ رہے ہو۔ بابا بڑے بڑے ٹرک رکے ہوئے ہیں یہ چھوٹی سی ویگن تو منٹوں میں جائے گی نیچے، ڈرائیور سمیت۔۔ بس رات تو یہیں پر سر ہو گی۔ ویگن میں سو جائیں گے‘‘ ۱۷۔

مستنصر حسین تارڑ ایک مہم جویانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ ہر بات کو ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں جس میں حد سے زیادہ سسپنس، ڈر، تحیر اور تجسس پایا جاتا ہے۔ وہ عام بات کو بھی گھماتے ہیں اور اُس میں تحیر کا پہلو ڈھونڈتے ہیں اور اس کے لیے نِت نئے حربے اور طریقے استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ جاسوسی ناولوں میں پایا جاتا ہے مگر مستنصر کے ہاں یہ چیز سفر ناموں میں ملتی ہے جس کی وجہ سے قارئین اُن کے سفر نامے بے حد شوق سے پڑھتے ہیں۔ سوات کی سیر کے اختتام پر مستنصر

نے سوات کی بد امنی اور لا قانونیت کا ذکر کیا تھا اور ایک مسلح ڈاکو سے اپنی مڈ بھیڑ کا واقعہ بھی سنایا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ اُس نے قاری کے تجسس اور خوف کو بر قرار رکھنے کے لیے خنجراب کے سفر کا آغاز ہی مسلح ڈاکوؤں کی آمد سے کیا اور بعد میں اس واقعے کو خوب صورت موڑ دے کر ان ڈاکوؤں کو اپنے دوستوں کے روپ میں پیش کیا۔ مسلح ڈاکوؤں کے نمودار ہونے سے پہلے پہل تو قاری ڈر اور خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر ڈاکوؤں کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے تو 'کھودا پہاڑ نکلا چوہا' کے مصداق قاری ایک خوشگوار تحیر میں ڈوب جاتا ہے اور سفر نامہ نگار کے اس اچھوتے اندازِ بیاں کو بے اختیار داد دینے لگ جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ڈاکوؤں کی آمد کا جو سماں کھینچا ہے اور جو منظر بیان کیا ہے یقیناً یہ سن کر اور تصور کی آنکھ سے اسے دیکھ کر انسان کے جسم میں خون کی روانی تیز ہو جاتی ہے اور جسم کا رواں رواں خوف و دہشت سے لرزنے لگ جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس واقعہ کی جو منظر کشی کی ہے اور خوف و دہشت کی جو فضا تخلیق کی ہے وہ اُن کی زبان سے سنئیے:

> "درختوں کے گھنے جھنڈ میں سے ایک سفید گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا نکلا اور اس کے سوار کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف بلند تھی جس کا رخ ہماری کار کی جانب تھا۔ درختوں کے گھنے جھنڈ پھر جیسے زندہ ہونے لگے ۔اُن میں متعدد مسلح افراد دوڑتے ہوئے ہماری جانب آ رہے تھے۔ ان کے سینوں پر گولیوں کے پٹے زیورات کی طرح سجے ہوئے تھے۔ان میں سے دو سیاہ پوش تھے اور اُنھوں نے اپنے چہرے کالی پگڑیوں کے پلوؤں سے ڈھانپ رکھے تھے۔ پھر ایک سیاہ جیپ ہماری جانب حرکت کرنے لگی جسے ایک بانکا نوجوان ڈرائیو کر رہا تھا اس کی کمر سے ایک ریوالور لٹک رہا تھا۔۔۔ مسلح افراد ہماری جانب دوڑتے چلے آ رہے تھے۔" یہ ڈاکو ہیں۔۔۔"
>
> میری بیوی میمونہ نے میرا بازو سختی سے پکڑ لیا اور اس کی آواز میں خوف بیٹھا ہوا تھا میرا حلق بھی خشک ہو رہا تھا کہ یا الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے۔۔۔۔
>
> مسلح افراد نے ہماری کار کو گھیرے میں لے لیا"۔ ۷۲۔

ڈاکوؤں کے گروہ کو مستنصر اور اُس کی فیملی کے کار کو گھیر نا ظاہر کرتا ہے کہ اگلا لمحہ وہ کار سوار وں کو زبر دستی گاڑی سے نکالے گا اور اُن سے اُن کا سب مال و اسباب چھین کر اور اُنھیں زدو کوب کر کے فرار ہو جائے گا مگر یا حیرت! مستنصر نے یہاں صورت حال کو یک دم ایسے گھما دیا ہے کہ ساری کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ مستنصر کہتا ہے:

"یہ تو ڈاکو ہیں۔۔۔" میری بیوی میمونہ نے میرا بازو سختی سے پکڑ لیا اور اس کی آواز میں خوف بیٹھا ہوا تھا۔

"نہیں۔۔۔۔" میں نے نقاب پوشوں کے درمیان میں مسکراتے ہوئے ایک لمبے تڑنگے نوجوان کو پہنچاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "یہ ریاض آفریدی ہے۔"

ریاض آفریدی اُن خطوں میں ایک خط تھا جو صبح کی نشریات کے حوالے سے مجھ موصول ہوتے رہتے تھے۔۔۔ میں نے اُسے واپسی خط لکھا۔۔۔۔ چنانچہ آفریدی ایک فین سے دوست بن گیا۔اسے خنجراب کے سفر کے بار میں علم ہوا تو اس نے سوچا کہ ایبٹ آباد کے باہر مجھے "سرپرائز دی جائے۔۔۔ یہ ریاض آفریدی کے استقبال کا ایک منظر تھا"۔ ۷۳؎

مستنصر حسین تارڑیوں تو ہر سفر کے آغاز میں اپنے مہم کی ایسی خوفناک تصویر کھینچتے ہیں کہ جسم میں پھریری سی دوڑ جاتی ہے۔ وہ سوچ کے دھارے میں کبھی ماضی کی پنہائیوں میں کھو جاتے ہیں تو کبھی مستقبل میں اپنے مہم کے دوران پیش آنے والے حالات سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور اُن پر یاسیت کی گہری تہہ چھا جاتی ہے۔ مستنصر کے قلم کی رنگینی اور اُن کے مزاج کی ظرافت کے برعکس اُن کے ہاں یاسیت کا یہ رنگ اور کیفیت دیکھ کر قاری پر ایک افسردگی اور مردنی سی چھا جاتی ہے کیونکہ اُس کا مزاج مستنصر کا یہ رنگ قبول کرنے میں تذبذب کا شکار نظر آتا ہے۔ "کے ٹو کہانی" میں مستنصر اکثر اوقات خیالات میں کھو کر مایوسی اور نا امیدی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ کر قاری کے مزاج پر ایک منفی تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ پر مستنصر یوں گویا ہے:

اور پچھلی شب صد پارہ جھیل سے واپسی پر میں نے اپنے ہائیکنگ بوٹوں کے تسمے بھی کھولے ۔۔۔۔ تو مجھے خیال آیا کہ ایک روز ایسا بھی ہو گا جب میں یہ تسمے کھولوں گا اور اس لمحے کھولوں گا جب میں کنکورڈیا سے واپس آؤں گا۔۔ اور ان بھاری بوٹوں کی بجائے عام شوز پہن لوں گا۔۔ امید تو یہی تھی کہ ایسا لمحہ آجائے گا۔۔۔۔ اگر نہیں آتا تو میں ان بوٹوں سمیت کہاں ہو گا۔۔۔۔۔ ہر سیزن میں کچھ کوہ نورد وہیں رہ جاتے ہیں، کسی گلیشیئر کے دراڑ کے اندر اتھاہ اندھیرے اور یخ بستگی میں، کسی کھائی میں، کسی منجمد جھیل کی تہہ میں۔۔ کسی موت رفتار دریا کے پانیوں میں ۔۔۔۔ اُن پر ایسا لمحہ نہیں آتا کہ وہ اپنے بوٹوں کے تسمے کھول سکیں۔۔۔ اُن کے تسمے ہمیشہ کے لیے بندھے رہتے ہیں۔ میں خواہش کر سکتا تھا۔ دعا کر سکتا تھا کہ میرے ساتھ ایسا نہ ہو۔۔ میں کے ٹو سے واپسی پر اپنے اپنے تسمے خود کھول سکوں۔۔۔۔۔" ۴۷؎

حوالہ جات

۱۔ ہنزہ داستان — مستنصر حسین تارڑ — ص : ۱

۲۔ ایضاً — ص:۲

۳۔ ایضاً — ص :۳

۴۔ ایضاً — ص :۱۰

۵۔ سنولیک — مستنصر حسین تارڑ — ص :۳۳۷

۶۔ شمشال بے مثال — مستنصر حسین تارڑ — ص :۵۶

۷۔ ایضاً — ص :۱۷

۸۔ یاک سرائے — مستنصر حسین تارڑ — ص :۱۲۰

۹۔ راکاپوشی — مستنصر حسین تارڑ — ص :۶۶

۱۰۔ ہنزہ داستان — مستنصر حسین تارڑ — ص :۱۳

۱۱۔ نانگاپربت — مستنصر حسین تارڑ — ص :۵۷

۱۲۔ ایضاً — ص :۴۷

۱۳۔ نانگاپربت — مستنصر حسین تارڑ — ص :۱۲

۱۴۔ سفر شمال کے — مستنصر حسین تارڑ — ص :۲۴

۱۵۔ نانگاپربت — مستنصر حسین تارڑ — ص :۳۶

۱۶۔ کے ٹو کہانی — مستنصر حسین تارڑ — ص :۲۱۲

۱۷۔ سفر شمال کے — مستنصر حسین تارڑ — ص :۱۹

۱۸۔ ایضاً — ص :۲۰

۱۹۔ راکاپوشی — مستنصر حسین تارڑ — ص :۱۰

۲۰۔ ایضاً — ص :۱۱۲

۲۱۔ ایضاً — ص :۱۲

۲۲۔ ہنزہ داستان — مستنصر حسین تارڑ — ص :۲۷

۲۳۔ ایضاً ص:۹

۲۴۔ شمشال بے مثال مستنصر حسین تارڑ ص:۱۹

۲۵۔ ایضاً ص:۳۵

۲۶۔ ہنزہ داستان مستنصر حسین تارڑ ص:۱۴

۲۷۔ راکاپوشی مستنصر حسین تارڑ ص:۴۸

۲۸۔ ایضاً ص:۵۰

۲۹۔ راکاپوشی مستنصر حسین تارڑ ص:۶۲

۳۰۔ ایضاً ص:۳۶

۳۱۔ نانگاپربت مستنصر حسین تارڑ ص:۷۵

۳۲۔ چترال داستان مستنصر حسین تارڑ ص:۱۱۳

۳۳۔ ایضاً ص:۱۷۲۔۱۷۳

۳۴۔ ایضاً ص:۱۸۲

۳۵۔ سنولیک مستنصر حسین تارڑ ص:۴۷۳

۳۶۔ یاک سرائے مستنصر حسین تارڑ ص:۱۹۵

۳۷۔ شمشال بے مثال مستنصر حسین تارڑ ص:۱۱۲۔۱۱۳۔۱۱۴

۳۸۔ چترال داستان مستنصر حسین تارڑ ص:۱۰

۳۹۔ ایضاً ص: ۷۔۸۔۱۰

۴۰۔ ایضاً ص:۷۱

۴۱۔ سفر شمال کے مستنصر حسین تارڑ ص:۱۸

۴۲۔ نانگاپربت مستنصر حسین تارڑ ص:۳۴

۴۳۔ سفر شمال کے مستنصر حسین تارڑ ص:۲۳

۴۴۔ چترال داستان مستنصر حسین تارڑ ص:۳۹

۴۵۔ Webster's Dictionary ص:۱۳۹

۴۶۔ جنسی ترغیبات نیاز فتح پوری ص:۷۵

۴۷۔ ادب اور زندگی — مجنوں گورکھپوری — ص:۲۳۹

۴۸۔ دیوسائی — مستنصر حسین تارڑ — ص:۸۰

۴۹۔ ایضاً — ص:۷۹

۵۰۔ ایضاً — ص:۱۷۲

۵۱۔ سنولیک — مستنصر حسین تارڑ — ص:۲۲

۵۲۔ اُردو سفر نامے میں جنس نگاری کا رجحان — ذوالفقار علی احسن — ص:۲۱۱

۵۳۔ دیوسائی — مستنصر حسین تارڑ — ص:۱۵۳

۵۴۔ رتّی گلی — مستنصر حسین تارڑ — ص:۱۳

۵۵۔ ایضاً — ص:۱۳

۵۶۔ پاک سرائے — مستنصر حسین تارڑ — ص:۹۷

۵۷۔ ایضاً — ص:۱۰۲

۵۸۔ شمشال بے مثال — مستنصر حسین تارڑ — ص:۱۷

۵۹۔ ایضاً — ص:۵۴

۶۰۔ دیوسائی — مستنصر حسین تارڑ — ص:۸۱

۶۱۔ چترال داستان — مستنصر حسین تارڑ — ص:۵۳

۶۲۔ ایضاً — ص: ۸۹۔۹۰

۶۳۔ برفیلی بلندیاں — مستنصر حسین تارڑ — ص:۴۹

۶۴۔ چترال داستان — مستنصر حسین تارڑ — ص:۱۲۷

۶۵۔ ایضاً — ص:۱۷۶۔۱۷۷

۶۶۔ سفر شمال کے — مستنصر حسین تارڑ — ص:۲۵

۶۷۔ سنولیک — مستنصر حسین تارڑ — ص:۳۷۳

۶۸۔ سفر شمال کے — مستنصر حسین تارڑ — ص:۱۸

۶۹۔ ہنزہ داستان — مستنصر حسین تارڑ — ص:۱۱

۷۰۔ شمشال بے مثال — مستنصر حسین تارڑ — ص:۳۸

۷۱۔ ہنزہ داستان — مستنصر حسین تارڑ — ص :۱۲

۷۲۔ سفر شمال کے — مستنصر حسین تارڑ — ص :۲۹

۷۳۔ ایضاً — ص :۲۹

۷۴۔ کے ٹو کہانی — مستنصر حسین تارڑ — ص :۶۳

فصل سوم

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا فنی جائزہ

منظر نگاری

کسی منظر کی تصویر الفاظ میں کھینچنا یعنی منظر کشی بہت مہارت کا کام ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر اچھا ادیب اور نامی گرامی سفر نامہ نگار اچھا منظر نگار بھی ہو کیونکہ یہ ملکہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ کسی منظر، کسی مظہر، کسی پہاڑ، کسی رواں چشمے یا فطرت کے کسی رنگ کو کم سے کم اور سادہ سے سادہ الفاظ میں ایسے دلچسپ انداز میں قاری کے سامنے بیان کرنا کہ وہ اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دے، یہ صلاحیت مستنصر حسین تارڑ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ فی الواقع خارج سے داخل میں جھانک کر واقعات کی تصویر کھینچنے کا ایک انوکھا تجربہ اور ایک مثالی صلاحیت ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا کمال یہ ہے کہ وہ جب کسی منظر کی عکاسی کرتے ہیں تو اُس کی ذات فنا فی المظہر ہو جاتی ہے۔ گرد و پیش کی ساری چیزیں اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ اس منظر، اُس مظہر کے اندرون میں جھانک کر اپنی داخلی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں گویا کسی مقام کی تصویر کشی میں اُس کا وجدان اُس کی رہنمائی کرتا ہے اور یہ تو مسلمہ اُصول ہے کہ کسی شخص کی جتنی بصیرت وسیع اور گہری ہو گی اُسی قدر اُس کی تخلیق میں رنگینی اور تحریر میں اثر پذیری زیادہ ہو گی اور اُس کا پیش کردہ ادب قارئین کے دلوں میں گھر کرے گا۔ مستنصر حسین تارڑ نے مناظر فطرت کی پیشکش میں جس ہنر مندی اور گہرے ویژن کا مظاہرہ کیا ہے اور خارج کی تصویر کشی میں اپنے وجدان کی جو قوت صرف کی ہے وہ نہ صرف قارئین کو پسند آیا ہے بلکہ اُس نے ناقدین کا منہ بھی بند کر دیا ہے۔ " سفر خنجراب میں" مستنصر حسین تارڑ کی تصویر کشی کا ایک رنگ ملاحظہ کریں:

> "اور پھر دور وادی میں ایک گھر کے در و دیوار تاریکی سے الگ ہو کر جھلملانے لگے۔۔۔ آہستہ آہستہ کریم آباد کے مختلف گھروں میں دِیے جیسے خود بخود جلنے لگے۔۔ چراغاں جنگل کی آگ کی طرح تھا، پھیلتا جاتا تھا۔۔۔ اور پھر یہ دِیے اور روشنی کے اَلاؤ جیسے ارد گرد کے بلند پہاڑوں پر بھی ظاہر ہونے لگے۔ دور دراز کی گھاٹیاں اور گلیشیر کے قریب کی چٹانیں روشن ہو رہی تھیں اور یہ ایک خوابناک اور ناقابل یقین منظر تھا

کہ پوری وادی میں جگہ جگہ روشنی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔"وہ اُدھر۔۔۔" سمیر نے اُن پہاڑوں کی جانب اشارہ کیا جہاں قیمتی پتھروں کی کانیں واقع ہیں۔۔۔۔وہاں سینکڑوں دِیے جل رہے تھے اور اُن کی روشنی سے " یا علی " کے حروف ظاہر ہو رہے تھے۔اسی طرح ایک پہاڑ پر آگ کی مدد سے ایک تاج بنایا جا رہا تھا۔۔مبارک باد کے لفظ کئی گھاٹیوں میں دکھائی دیتے تھے۔ پھر التر کی بلندی سے جیسے آگ کے گولے تیزی سے نیچے آنے لگے۔ پھر ایک اور پہاڑی سے بھی الاؤ نیچے آتے گئے"۔ ا۔

مستنصر کی حواس خمسہ انتہائی قوی ہے۔ یہ حواس خمسہ قدم قدم پر اُن کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سوات کی سیر کے دوران مستنصر حسین تارڑ نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کی منظر کشی وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"پہلے وادیٔ سوات کی ایک خوشبو اندر آئی اور یہ خوشبو بہت ہی اجنبی اور ہر لمحہ پھیلتی ہوئی تھی۔شاید یہ سفید پھولوں کے اُن گچھوں سے پھوٹتی تھی جو سڑک کے دورویہ کھڑے درختوں سے چینی لالٹینوں کی طرح لٹکتے تھے اور شام کی ہوا میں جھومتے تھے۔۔۔یا ان کھیتوں اور باغوں میں سے فرار ہوتی تھی جو دور تک۔۔وہاں تک جہاں اُفق پر دھندلاتے پہاڑوں پر برف سفید تھی وہاں تک جاتے تھے اور یہ سب کے سب ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں سے زرد اور پر امن ہوئے جاتے تھے۔ ہوا میں خوشبو تیرتی تھی اور پھیلتی تھی اور اس میں وہ آسودہ ٹھنڈک تھی جو گرمی سے جلے ہوئے جسموں کو آسودگی عطا کرتی ہے۔ ۲۔

سفر نامہ لکھتے ہوئے سفر نامہ نگار کے پاس قلم کا ہتھیار ہوتا ہے اگر وہ اپنے قلم کے استعمال کا ہنر جانتا ہے تو پھر وہ بے جان اور بے روح چیز میں بھی جان اور روح ڈال سکتا ہے اور اسے نطق و گویائی دے کر بات چیت پر آمادہ کر سکتا ہے اور اگر وہ اپنے قلم کو ایک ماہر فن کی طرح چلانے میں ناکام ہے تو پھر اس کی بنائی ہوئی تصویر نامکمل اور ادھوری نظر آئیں گی۔ مستنصر حسین تارڑ کو قلم سے نہ صرف تصویریں کھینچنے کا ہنر آتا ہے بلکہ وہ اس میں ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے کہ تصویریں خود بولتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مستنصر جیسا حساس مزاج شخص ظاہری آنکھ سے مظاہر قدرت کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ ان مناظر کو اپنے روح میں جذب کرتا ہے اور پھر جب وہ الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے اس روحانی جذبے کو قلم

بند کرتا ہے تو اس کا وجود درمیان سے غائب ہو جاتا ہے اور قاری بنفسہٖ ان مناظر سے ہم کلام ہوتا ہے۔ سفر نامہ 'دیوسائی' میں یہ منظر نامہ مستنصر نے کچھ یوں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ کے ٹو تھا۔
یہ شاہ گوری تھی۔
دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ۔۔۔ کے ٹو ۔۔۔ شاہ گوری ، ایک اہرام کی طرح۔۔۔ برف کے ایک کوہ نور ہیرے کی طرح اس مجموعے میں سے بلند ہوتی تھی۔۔ اس کے گورے بدن پر میری آنکھوں کے بوسوں کے جو نیل تھے، وہ یہاں سے دکھائی نہیں دیتے تھے۔۔۔ اگرچہ وہ وہاں تھے۔۔ ایسے نیل جو معدوم ہو جائیں،
تب یاد رہتا ہے کہ کہاں کہاں تھے۔۔۔
اور پھر اس قطار میں گشابرم ایک، دو اور چار کی مشہور زمانہ چوٹیاں اپنی دیدہ زیب شکلوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور آخر میں۔۔۔ مشابرم تھی۔ عقابی چونچ والی چوٹی جسے میں کے ٹو کے علاوہ کسی کی مدد کے بغیر پہچان سکتا تھا،
اس عظیم مجموعے میں چوغولیزا کے برف زار بھی نظر آتے تھے۔۔ بقیہ چوٹیوں کے پہلو میں سے جھانکتے ہوئے۔۔۔۔۔ [۳]

مستنصر حسین تارڑ جیسے ہی درۂ شمشال میں داخل ہوا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ اُرون کے صحراؤں میں پوشیدہ پیٹرا کے رومی شہر کے قدیم گلابی کھنڈر کا نظارہ کر رہا ہو کیونکہ وہاں کی ہر چٹان اُجڑی ہوئی رومی محل تھی یا کسی دیوی کا ویران معبد تھی، جہاں خزانہ جمع کرنے کا ایک کمرہ تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح اُردن کے صحراؤں میں اس تاریخی شہر کے کھنڈرات صدیوں تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے اور کسی گڈریے کے اچانک وہاں جانے اور وہاں چٹانوں کی آغوش میں صدیوں سے ویران پیٹرا کا شہر موجود تھا یہاں بھی ویسی صورت حال تھی، درّہ شمشال میں ابھی تک ایک دوسرا پیٹرا مخفی تھا جس سے بیرونی دنیا لاعلم تھی اور ہماری مثال بھی اُس گڈریے کی طرح تھی جو کوہ نوردی کی گم شدہ بھیڑ کی تلاش میں اتفاقاً ادھر آ نکلے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ درّہ شمشال کے حسن اور ہیبت ناکی اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے:

''اُس کی پر ہیبت اور بڑی شان والی بلند چٹانیں گلابی ہو رہی تھیں۔۔۔۔ جیسے
خالص پاسے کے سونے کے منجمد اہرام بلند ہو رہے ہوں۔ سونے کے یہ اہرام،
یہ گلابی عبادت گاہیں حجم اور مسافت میں اتنے عظیم تھے کہ ہمیں ہماری جیپ کو
حقیر اور بے وقعت کرتے تھے۔۔۔ اور یہ اُن کی فراخ دلی تھی کہ وہ ہمیں اپنی
پوشیدہ سلطنت میں سے گزر جانے دے رہے تھے۔ درۂ شمشال کا گلاب۔ پتھریلا
اور سنگدل۔۔۔ شمشال روڈ پر رواں جیپ کے اوپر کھلتا جا رہا تھا۔'' ۴؎

مستنصر حسین تارڑ کو درّہ شمشال کی چٹانوں، بلند و بالا چوٹیوں اور گلاب رنگ گرد و پیش اور اس پر مستزاد سورج کے کرنوں کی صنم تراشی نے اتنا مسحور کیا تھا کہ کبھی ڈرّے کی چٹانی حصار کو سیمسن کے مندروں سے تشبیہہ دیتا تھا تو کبھی ابو سنبل کے معبد کہہ رہا تھا، کبھی اُن کوہان نما چوٹیوں پر ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کے گنبد کا گمان ہو رہا تھا تو کبھی اُسے کسی مدرسے کے سر بریدہ مینار کہہ رہا تھا۔

''درّے کے چٹانی حصار سیمسن کے مندر کے ستونوں میں بدلتے تھے۔ کبھی
ابو سنبل کے معبد دکھائی دیتے تھے۔ یہ ہرات کی صبح میں تیمور کی ملکہ گوہر شاد
کے مقبرے کے گنبد تھے۔ مدرسے کے سر بریدہ مینار تھے جن پر روشنی ہو رہی
تھی۔ یونانی دیو مالا کے سمندروں میں، شاعر ہومر کی بیان کی گئی صبحوں میں
۔۔۔ ان سب جگہوں پر جتنے بھی آفتاب اُبھرے تھے وہ سارے کے سارے
اس لمحے درّہ شمشال کی چٹانوں پر اتر رہے تھے۔
منتظر کب سے ہیں ماہتاب۔۔۔ نہیں، آفتاب اُبھرے۔۔۔ اگرچہ وہ اُبھر چکا
تھا لیکن نظروں سے ابھی اوجھل تھا۔۔۔۔۔ وہ درے کی تنگنائی میں اُتر نہ سکتا
تھا۔۔۔ صرف اس کی کرنیں کھوج لگاتی اندر تک آتی تھیں اور اُن چٹانوں سے
ان دیکھے صنم تراشتی تھی۔
پیٹرا تو ایک شہر تھا۔۔۔۔ یہاں کئی شہر آباد تھے۔'' ۵؎

مستنصر حسین تارڑ ایک ایسے لکھاری ہیں جنہیں کائنات کی ہر چیز میں حسن نظر آتا ہے چاہے یہ حسن پھولوں میں ہو، پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیوں میں ہو، کھیت اور کھلیانوں میں ہو، جھرنوں اور چشموں میں ہو یا کسی شوخ والھڑ دوشیزہ میں ہو۔ وہ کائنات کا ہر رنگ اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے۔ مستنصر عورت

کے حسن سے زیادہ متاثر ہے یہی وجہ ہے اُنھیں قدرت کے حسین نظاروں میں بھی عورت کا سراپا نظر آتا ہے۔اُنہیں پہاڑ کی بلندیاں ایک محبوبہ کے روپ میں نظر آتی ہیں۔اُن کی تحریروں میں عورت کے حسن کا تذکرہ بالواسطہ یابلاسطہ طورپر بار بار دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ جب کسی علاقے کی سیاحت پر نکلتے ہیں تو مقامی رنگوں کی منظر کشی کے ساتھ وہاں کے نسوانی حسن کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں جن سے واضح طور پر مستنصر حسین تارڑ کے ذوقِ جمالیات کا پتہ چلتا ہے۔

"شمشال وہاٹ ہارن پر سورج ڈوبتا تھا اور زردی میں نہائی ہوئی ایک وادی میری نظروں کے سامنے ایک پکچر کارڈ کی مانند زندہ ہو رہی تھی اور اس میں زندگی کا شور تھا، آوازیں تھیں، کھیتوں کی منڈیروں پر بھاگتے ہوئے بچے تھے اور یہ کھیت سرسوں کے تھے، کوئی درخت نہ تھا جو اس منظر میں رکاوٹ بنتا۔ صرف سرسبز کھیت تھے اور ان میں سرسوں پھولتی تھی اور ان کھیتوں میں جو شمشالی لڑکیاں جھکی تھیں،وہ سر اُٹھاکر ہمیں دیکھتی تھیں تو وہ بھی زرد تھیں جیسے چینی کی شہزادیاں ہوتی ہیں اور زرد ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔
خواتین جو خوش کل اور خوش لباس تھیں۔ قدیم طرز کی ٹوپیوں میں، کھیتوں میں کام کرتی اور اپنے دور افتادہ دیار میں اجنبیوں کی آمد سے پُر تجسس ہوتیں۔ اپنے آپ کو اس وادی کی مانند پوشیدہ بھی رکھتیں اور ظاہر ہو کر ہمیں بھی تکتیں۔ کھیتوں میں پانی لگاتے، گوڈی کرتے اور رات کے وقت چولہے کے لیے سرسوں کا ساگ توڑتی، خوش شکل اور خوش لباس حیرتیں۔۔۔۔۔ایک مختصر اور دنیا جہان سے چھپی ہوئی جنت ارضی۔۔۔۔۔۔۔جو زرد تھی۔ایک پوشیدہ راز جس کا چہرہ ۔۔۔۔۔جب میں نے دیکھا تو زرد تھا۔ ۶؎

مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اُن کے سفرناموں میں نہ صرف انسانی زندگی کے تمام رنگ موجود ہیں بلکہ اُنہوں نے مظاہر فطرت اور مناظر قدرت کی تصویر کشی کرکے اُنہیں انسانی زندگی سے ہم آہنگ کردیا ہے جن سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ قدرت کے پیدا کردہ مظاہر کے بغیر انسانی زندگی نامکمل اور اَدھوری ہے۔انسان کو اپنی ذات کے خول سے نکل کر کائنات کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے تاکہ اُن کو اپنے

رب کی وسیع و عریض دنیا کے بارے میں آگاہی حاصل ہو۔ اس سے جہاں انسان کو وسعت نظر اور کشادگیٔ قلب میسر ہو گی وہاں وہ قدرت کے سربستہ رازوں کے بارے میں جان کر سجدہ شکر بجالائے گا اور اُس کے قلب وروح میں رب کی عظمت اُجاگر ہو گی۔ مستنصر نے اپنے سفر ناموں میں بظاہر شمالی علاقہ جات کے لوگوں کے خلوت و جلوت کے قصے سنائے ہیں مگر بحیثیت مجموعی اُنہوں نے انسان کو موضوع بنایا ہے۔ اُنہوں نے انسان کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلو، اُن کے ثقافتی اقدار، مذہبی عقائد، اُن کے طبعی رجحانات، میلانات، رکھ رکھاؤ، میل میلاپ، غمی خوشی اور زندگی کی مماثلت اور تضادات پر بات کر کے مختلف معاشروں میں رہنے والے انسانوں کو قریب تر لانے کی کوشش کی ہے اور انسان کو یہ باور کرایا ہے کہ ہر خطہ میں رہنے والا انسان، انسانیت کے رشتے کے حوالے سے ایک دوسرے کا دست و بازو ہے۔ جب تک انسان اس رشتے کا پاس رکھے گا، اُس کی ذاتی اور معاشرتی زندگی امن و سکون اور چین سے کٹے گی اور جس دن اُس نے اس رشتے کو بالائے طاق رکھا اُس دن دنیا میں جنگل کا قانون نافذ العمل ہو گا۔

مستنصر حسین تارڑ کی اس خصوصیت کا بارہا ذکر ہوا ہے کہ جب وہ کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو وہ محض اس کا سرسری نظروں سے مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ وہ خود اس منظر میں ڈوب جاتے ہیں اور اس کے حواس خمسہ بس اسی منظر کا طواف کرتے نظر آتے ہیں۔ اُس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ اس کی اندورنی کیفیات، جذبات اور احساسات کا مظہر ہوتا ہے۔ ایک موقع پر اُنہوں نے چودھویں کے چاند کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "چودھویں کا پورا چاند۔۔۔ ایک سنہری تھال کی صورت۔۔۔ ایک سنہری چھاج کی صورت۔۔۔ ایک ایسا چھاج جسے محبوب کو قید کرنے کے لیے۔۔ کہیں وہ چلا نہ جائے۔ اس خدشے کے تحت صحن کی دیواریں اونچی کرنے کے بعد اُس کی چھاج کو بتاشوں سے بھر کر اُچھال دیا جائے۔۔۔ ایسا سنہری چھاج راکاپوشی کی اُس شب میں اُبھرتا، ہر پتھر، گھاس کے ہر تنکے، برفانی ندیوں کے پانیوں کی ہر بوند، بیس کیمپ کے اختتام پر جو گلیشیئر بچھا ہوا تھا جو اُن ندیوں کو جنم دیتا ہے اُس کی برفوں کی ہر کرچی کو منور کرتا تھا۔۔۔ [۷]

کردار نگاری وخاکہ نگاری

جس طرح ڈراموں میں کرداروں کی اہمیت مسلّم ہے بالکل اسی طرح سفر ناموں میں بھی کرداروں کا چناؤ اور انتخاب انتہائی مہارت کا متقاضی ہے۔ کیا سفر نامہ نگار فی الواقع ایسے کردار تخلیق کرتا ہے یا وہ کردار حقیقتاً موجود بھی ہوتے ہیں اور سفر نامہ نگار محض حالات و واقعات کی مناسبت سے اُسے آگے پیچھے کر لیتا ہے ؟ ناول، افسانے اور ڈراموں میں تو یقیناً سب فرضی کردار ہوتے ہیں۔ تخلیق کار اپنی ضرورت کی بنیاد پر کردار تخلیق کرتا ہے، اُن سے جتنا کام لینا ہوتا ہے وہ لے لیتا ہے اور پھر اُسے پس پردہ کر دیتا ہے۔ سفر نامہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سفر نامہ کا تعلق حقیقی دنیا، حقیقی واقعات اور حقیقی کرداروں سے ہوتا ہے۔ اُن کی ملاقات کسی نہ کسی موڑ پر سچ مچ سفر نامہ نگار سے ہو چکی ہوتی ہے اور وہ اپنی شخصیت سے سفر نامہ نگار کو متاثر کر چکا ہوتا ہے تبھی سفر نامہ نگار اُسے اپنے سفر نامہ کا حصہ بنا لیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ شخص کوئی بڑا جاگیر دار ہو، کارخانے دار ہو، کوئی اہم ادبی و غیر ادبی شخصیت ہو یا کسی بڑے عہدے پر براجمان ہو۔ وہ کوئی مزدور، دکاندار اور پورٹر بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری اور قابل توجہ چیز یہ ہے کہ وہ شخص دنیا میں بنفس نفیس موجود ہو، کوئی خیالی یا فرضی کردار نہیں ہو کیونکہ فرضی اور خیالی کردار سفر ناموں میں نہیں ہوتے اور اگر ہوں گے تو پھر وہ سفر نامہ نہیں ہو گا کوئی اور ادبی کاوش ہو گی۔ ایک ماہر اور اپنے فن سے آگاہ سفر نامہ نگار وہ ہوتا ہے جو اپنے سفر نامے کے لیے حقیقی دنیا سے کردار لے کر تخیل کے امتزاج سے اُس میں ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے کہ وہ کردار اَمر اور ناقابل فراموش بن جاتے ہیں۔

مستنصر کے سفر ناموں میں ہمیشہ دو قسم کے کردار سامنے آتے ہیں ایک مستقل کردار جو شروع سے لے کر سفر نامے کے اختتام تک چلتے رہتے ہیں اور اپنا کردار نبھاتے رہتے ہیں اور دوسرے عارضی قسم کے کردار ہوتے ہیں جو بوقتِ ضرورت سامنے لائے جاتے ہیں یا سفر نامہ نگار خود ایسی فضا بنا لیتا ہے جس میں اُس کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مستنصر کے دونوں قسم کے کردار لاجواب ہیں اور اُن کا تعلق حقیقی دنیا سے ہوتا ہے کیونکہ وہ کردار بار بار اُس کے سفر ناموں کا حصہ بنتے ہیں اور مستنصر اُن کرداروں کو مد نظر رکھ کر واقعات کو ترتیب دیتا ہے۔ عارضی کرداروں میں مستنصر بے شمار ایسے کرداروں کو متعارف کرا چکا ہے جن کی وجہ سے سفر نامہ کی فضا پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں جن میں بطور

خاص ’ پسّو ‘ کا ماسٹر ’حقیقت ‘ ہے جن کا ذکر مستنصر نے متعدد سفر ناموں میں کیا ہے۔’سنو لیک ‘ میں مستنصر اچانک جاپانی عورت ” ویدہ “ کا کردار سامنے لاتے ہیں جن کی وجہ سے سفر نامے کا ماحول یکسر بدل جاتا ہے۔سب ساتھیوں کی زبان پر ’ویدہ ‘ کا ذکر چڑھ جاتا ہے اور بقول اقبال کے ” وجود زن سے تصویرِ کائنات میں “ بالکل اسی طرح زن کی موجودگی سے سفر نامے کی کل کائنات میں رنگینی آجاتی ہے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مستنصر کو سفر نامے میں اپنے کرداروں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا ہے۔دوسری اہم بات یہ کہ مستنصر کے سفر ناموں میں سارے کردار حالات وواقعات کے نتیجے میں ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں۔ کہیں پر بھی یہ گمان نہیں ہوتا ہے کہ یہ کردار زبردستی ٹھونسا گیا ہے یا فلاں کردار کی ضرورت نہیں تھی اُس کا ذکر بلا ضرورت ہوا ہے۔ مستنصر کا ہر کردار اپنی جگہ ایک مستقل اکائی ہوتا ہے اور اپنی شخصیت اور اپنے جاندار کردار سے قاری کے ذہن میں جگہ بنالیتا ہے لہٰذا جب کسی دوسرے سفر نامے میں اُس کا ذکر ہوجاتا ہے یا وہ خود بنفس نفیس موجود ہوتا ہے تو قاری فوراً اُسے پہچان جاتا ہے اور اُس کردار سے اُس کی اجنبیت ختم ہوجاتی ہے۔ ’ سنولیک ‘ میں ’ ویدہ ‘ نامی جاپانی عورت کا کردار اتنا جاندار ہے کہ قاری اُسے برسوں فراموش نہیں کر سکتا۔ جہاں کہیں مستنصر کی ملاقات اُس سے ہو گی قارئین فوراً اُسے پہچان جائیں گے۔

> ”یہ بھی درخواست کی کہ ایک جاپانی لڑکی بہت بیمار ہے۔ اکیلی جا نہیں سکتی۔ جانا بھی اسکولے ہے تو کیا آپ لوگ اسے اپنی جیپ میں بٹھالیں گے ؟“
>
> تمام اہل ٹیم فوری فوری طور پر چیری بلاسمز کی طرح کھلے ۔۔۔اتنے کھلے کہ مرجھانے کے نزدیک ہوگئے۔۔ جاپانی لڑکی ؟۔۔۔ کتنی عمر ہے ؟۔۔۔ جیپ میں تو جگہ نہیں ہے لیکن خیر ہم اوکھے سوکھے ہو کر لے جائیں گے۔۔۔۔۔۔
>
> صرف ایک لڑکی کے حوالہ نے ہمیں آباد کر دیا تو ہر سو۔۔ کوہ فوجی یاما کی ٹھنڈک اور چیری کے شگوفوں کی مہک آنے لگی۔۔۔ بدھ مت اور شنتو کے گیت گونجنے لگے۔۔۔۔

بیشتر جاپانیو کی طرح ایک دھیمی '[آہ'] کر کے جھک جانے والی لڑکی ویدہ ۔۔۔سیاہ جیکٹ، نیلی جین اور پی کیپ میں ایک لڑکی اور ہمیں خبر تھی کہ بیشتر جاپانیوں کی طرح ان ملبوسات میں بہت کچھ پوشیدہ نہ تھا۔۔۔ اس کے باوجود ایک لڑکی تھی۔۔ ۸ ۔

مستنصر کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کو دورانِ سفر اپنا ہم سفر بنالیتا ہے۔وہ جہاں جہاں جاتا ہے، جن مقامات اور نظاروں سے لطف واندوز ہوتا ہے، جن جن مشکلات اور صعوبتوں کا سامنا کرتا ہے قاری بچشم خود ان مناظر کا نظارہ کرتا ہے بلکہ بجسمِ خود چشمِ تخیل سے ان تکالیف اور صعوبتوں سے گزرتا ہے اور اُسے بعینہٖ ویسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ خود سفرنامہ نگار کو محسوس ہوتا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ مستنصر پسنجر گاڑی میں سوار لوگوں کو بھی قاری سے متعارف کراتا ہے اور ان کا ذکر ایسی تفصیل سے کرتا ہے جیسے یہی سفرنامے کے مرکزی کردار ہوں۔ یہ مستنصر کی خاص صفت ہے کہ وہ کسی بھی کردار سے پیچھا نہیں چھڑاتا اور نہ وہ جلدبازی میں ان کا ذکر کر کے آگے بڑھنے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے ۔مستنصر عام کو خاص بنانے کا گُر جانتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے گاڑی میں سوار عام لوگوں کو بھی ایسے انداز میں پیش کیا کہ وہ سفرنامے کی ضرورت بن کر سامنے آئے اور جن کی موجودگی سے سفرنامے کی فضا پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ مستنصر کی زبان سے خود اُن کا تعارف سنئیے، کہتے ہیں:

"میں نواب ہوں" ڈرائیور کی نشست پر براجمان ایک بھاری تن و توش اور چمکتے پالش شدہ شین قاف والے صاحب نے پیچھے دیکھے بغیر فرمایا۔۔۔۔۔" میں ڈرائیور ہوں صاحب، اکبر خان میرا نام ہے"
میں نے اوائل سفر میں ہی یہ دریافت کرنا مناسب نہ جانا کہ اگر اکبر خان ڈرائیور ہے تو نواب صاحب جو کہ پسنجر ہیں سٹیرنگ کیوں گھما رہے ہیں۔۔۔۔۔راجہ صاحب تھے۔۔۔نواب۔راجہ۔اکبر۔۔۔۔ویگن میں خاصی رائلٹی جمع تھی۔ راجہ صاحب اسلام آباد انٹر نیشنل ایئرپورٹ پر کسٹم انسپکٹر ہوا کرتے تھے۔ جوانی کے دن اور کسٹم کی راتیں لیکن کسی حاسد کی نظر بد کا شکار ہوئے اور اُن کی پوسٹنگ چینی سرحد کے قریب پاکستان کسٹم چوکی، سُوست میں ہو گئی تھی۔۔۔ایک احسان صاحب

تھے، نوجوان تھے اور گلگت میں اپنے سنیما کے لیے مار دھاڑ سے بھرپور
پنجابی فلموں کے پرنٹ لئے جا رہے تھے۔ سکردو کے رہنے والے ایئر
فورس کے ایک ملازم تھے جو چھٹی پر جا رہے تھے اور سب سے پچھلی
نشست پر نیم دراز سیامی بلیوں کی طرح لاڈ کرتے ہوئے میاں بیوی
اطالوی تھے۔
سینورفیودورواور اُن کی بیگم صاحبہ ۔ دونوں کی شکلیں ، دبلے جسم اور
لباس تقریباً ایک جیسے تھے اور عینک سے پتہ چلتا تھا کہ یہ سینور فیودورو
ہیں"۔ ۹

مستنصر حسین تارڑ آغاز میں ہی ماہر سفر نامہ نگاروں کی طرح بڑے نپے تلے اور ماہرانہ انداز میں سب مسافروں کا تعارف کراتا ہے نیتجتاً اُن کا ناک نقشہ نہ صرف ایک عام قاری کو بھی ازبر ہو جاتا ہے بلکہ اُن کے متعلق ابتدا میں قاری جو رائے گھڑ لیتا ہے آخر اُ بھی وہی کچھ سامنے آ جاتا ہے۔

اچھا اور کامیاب سفر نامہ نگار وہ ہوتا ہے جو قاری کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ سفر نامہ نگار بیٹھتا ہے تو قاری بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے، سفر نامہ نگار چلتا ہے تو قاری بھی اُس کے ساتھ قدم ملا کر چلتا ہے اور سفر نامہ نگار خاموش، گم صم، کہیں دور خلاؤں میں تکتا ہے اور محض اپنی محسوسات سے اپنی بے چین روح کو تھپک تھپک کر سلاتا ہے تو قاری بھی ہر لمحہ اُس کی پیروی کرتا ہے۔ قاری کے لیے حال، ماضی اور مستقبل ایک بے نام سی شئے ہوتے ہیں۔ وہ زمان و مکان کے حدود سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار ہی اُس کے ماضی، حال اور مستقبل کا تعین کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ہپناٹزم کا فن جانتے ہیں وہ قاری کے ذہن کو اپنے منفرد اندازِ بیاں کی بدولت ایسا مسحور کر لیتے ہیں کہ وہ قاری کی آنکھ اور کان بن جاتا ہے ۔وہ قاری کی سوچ پر ایسا حاوی ہو جاتا ہے کہ اُنہیں ادھر اُدھر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ مستنصر قاری کو ایک ایسی خیالی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وہ چھوٹے بچے کی طرح قاری کی انگلی تھامے اُنہیں جھیل کی اتھاہ گہرائیوں میں زندگی کا سبق سکھانے لگ جاتا ہے۔

"وہی جھیل اب میری جانب آ رہی تھی۔۔۔ اُس کے پانی شفاف تھے اور اُن
کی تہہ میں جتنے پتھر تھے، وہ سب دکھائی دیتے تھے اور اُن پتھروں پر کیا کیا رقم
تھا۔۔۔ جدائی اور ناآسودگی کی تحریریں۔۔۔ جنہیں پڑھنے کے لیے جھیل

کے کناروں پر جھک کر پانی کی لہروں کو منفی کر کے جھکنا پڑتا تھا۔۔۔۔اُن پر کیا کیا رقم تھا۔۔۔پانیوں کے ساتھ آنسو آتے تھے۔۔۔۔اُن پتھروں پر کندہ عبارتوں کے لیے پوری زندگی درکار تھی کیونکہ اُن پر پوری زندگی رقم تھی۔۔۔" ۱۰ے

سفر نامے میں واقعات کے ساتھ ساتھ مختلف کرداروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی صداقت پر کھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی کسوٹی نہیں۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ سفر نامہ نگار کے تمام واقعات من گھڑت ہوں یا اُن کے بیان کردہ جملہ کردار فرضی ہوں ،ہاں البتہ اس میں کسی حد تک مبالغہ کا احتمال ہو سکتا ہے یا سفر نامہ نگار قوت متخلیہ سے اُن میں رنگ آمیزی کر سکتا ہے مگر بنیادی واقعات اور کرداروں کی حقیقت میں غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا کیونکہ اس طرح وہ قارئین کی نظروں میں ناقابل اعتبار ہو کر اُس کے اصلی اور حقیقی کرداروں کی حیثیت بھی مشکوک ہو جاتی ہے اور اُس کے سفری واقعات کو قارئین محض قصہ کہانی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں بھی مختلف کردار بڑے دلچسپ انداز میں ہمارے سامنے آئے ہیں جن کے بارے میں حقیقت حال معلوم کرنا اگرچہ مشکل لگتا ہے مگر بادی النظر میں وہ کردار کسی بھی لحاظ سے فرضی اور مَن گھڑت معلوم نہیں ہوتے جن کی ایک مثال " ہنزہ داستان " کی ایک کردار خانم ہے جن سے مستنصر حسین تارڑ کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ خانم ایک ایرانی خاتون تھی جو اپنے بیٹے کے ساتھ تن تنہا مانسہرہ میں رہتی تھی۔ اُن کی شادی مانسہرہ کے رہنے والے ایک شخص سے ہو گئی تھی جو اُس وقت پاکستان فارن سروس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ مانسہرہ میں مستقلاً رہائش پذیر ہو گئیں۔ خانم کے بارے میں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اُن کے پڑوسی اس بات کے شاہد ہیں کہ یہاں خانم نامی ایرانی عورت رہائش پذیر تھیں۔

مستنصر حسین تارڑ ہمیشہ اپنے سفر ناموں میں ہمیں ایسے ایسے کرداروں سے متعارف کراتے ہیں جو نہ صرف دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں بلکہ اپنی منفرد خوبیوں کی وجہ سے زندہ جاوید بن جاتے ہیں۔ "شمشال بے مثال" میں اسّی نوّے سالہ بڑھیا اور بوڑھے کے جاندار کرداروں نے سفر نامہ کے حسن و چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس پر مستزاد بوڑھے شخص کی مہمان نوازی کی عادت کہ اس عمر میں انسان کا دل دھیلہ خرچ کرنے کو بھی نہیں چاہتا مگر بوڑھا شخص مہمان کی مہمان نوازی کے لیے بار بار بھیڑ ذبح

کرنے کا اصرار کر رہا ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شمالی علاقہ جات کے لوگ کس قدر مہمان نواز، فراخ دل اور وضعدار لوگ ہیں جو محنت مزدوری کرنے کے باوجود مہمان کی خاطر مدارت کے لیے بھیڑ کی قربانی تک سے دریغ نہیں کرتے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"وہ بڑھیا بے حد ضعیف تھی۔۔۔ شاید اسی برس۔۔۔ شاید نوے برس، وہ اس کی سفید برفوں کو تکتی رہتی تھی۔ یہ بڑھیا اس وادی میں سب سے بہترین عرق کشید کرتی ہے، چونکہ ایمان دار ہے اس لیے اس کے کام میں برکت بہت ہے۔

"بوڑھا تخت پوش پر بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ " فضل تم دو گھنٹے ٹھہرو گے ؟ اس نے پوچھا۔۔۔

"نہیں نہیں ماموں۔۔۔۔۔ میں نہیں ٹھہر سکتا۔۔"

"تم ٹھہرو تو میں ایک بھیڑ ذبح کرتا ہوں مہمان کے لیے۔۔۔۔ اسے پکانے میں دو گھنٹے لگیں گے۔۔۔۔ تم ہمیشہ جلدی کرتے ہو۔۔۔ آج ٹھہر جاؤ۔۔۔ بھیڑ ذبح کرتا ہوں"۔ [۱۱]

کسی واقعے کو خوبصورت انداز میں بیان کرنا ایک فن ہے۔ مستنصر اس فن سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ وہ واقعات و مشاہدات کی اس طرح دلکش انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ قاری کے داخلی احساسات اور جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ مستنصر واقعات کے پیچ و خم میں جذبات کا کھیل کھیلتا ہے۔ یہ کھیل قاری کے مَن کو ایسا بھاتا ہے کہ شعوری اور لاشعوری طور پر ہر عمل اور رد عمل کو اپنے دل پہ لیتا ہے جو مستنصر کا منشا ہوتا ہے۔ مستنصر ہنستا ہے تو قاری بھی اُن کا ہنسی میں ساتھ دیتا ہے۔ مستنصر کہیں نوحہ کناں ہوتا ہے تو قاری بھی پیچھے نہیں رہتا۔ مستنصر شعر و سخن کی چاشنی دے کر اپنی تحریر کو گرماتا ہے تو قاری بھی اس کی تقلید میں گنگناتا ہے۔ غرض مستنصر قاری کو مَن و تُو کے چکر سے نکال کر ایک نکتے پر مرتکز کر دیتا ہے کہ وہ ہر منزل پر، ہر قدم پر، ہر آہٹ پر قاری کی آنکھ، کان، دماغ اور دل بن کر اُنہیں طرح طرح کی دنیائیں دکھاتا ہے اور قاری دنیا و مافیہا سے بے خبر مستنصر کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہتے ہوئے اُس کا ساتھ دیتا ہے۔ یہی ایک کامیاب تخلیق کار کی نشانی ہوتی ہے کہ قاری کے جذبے کو مہمیز دے۔ اس کے اندر کی دنیا فتح کر دے۔ اُس کے جذبات کو طلاطم خیز موجوں سے آشنا کرے اور اُس کے حواس خمسہ کو اپنے قبضے میں اُسے زندگی کا سبق سیکھنے پر آمادہ کرے۔ مستنصر حسین تارڑ کو واقعات کی

حسین تصویر کشی کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی تصویر کشی میں بھی کمال حاصل ہے۔وہ جس طرح چٹکیوں میں کسی انسان کا سراپا بیان کرتے ہیں یہ اُنہی کا خاصا ہے۔سفر نامہ " چترال داستان" میں چترال جانے کے بعد وہاں ایک صوبیدار صاحب اور اُن کے بیٹوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ مستنصر اُن کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

"۔۔۔مہمان خانے کے عقب میں سے ایک خلقت نمودار ہو رہی ہے اور اس خلقت کی ایک جنرل کی طرح رہنمائی کرتا ہوا ایک بلند قامت، رعنا اور مضبوط شخص ہے جو شلوار قمیض اور ہلکے سویٹر میں ہے اور اس کے سر پر ایک ترچھی براؤن رنگ کی چترالی کیپ ہے اور اس کے پیچھے پیچھے نہایت مؤدب اور ڈری ہوئی ایک ایسی خلقت ہے جس میں شام کی سیر کرتا ہوا ہر چین کا وہ فلسفی بھی شامل ہے جس نے کہا کہ۔۔۔ "میں دیکھتا ہوں"۔انہوں نے اپنے پیچھے ، سر جھکائے مخلوق کی جانب اشارہ کیا" یہ سب میرے بیٹے ہیں"۔ اس دوران صوبیدار ساحب کی مطیع مخلوق جسے ہم نے مسلسل ہاتھ باندھے، سر جھکائے ان کے پیچھے کھڑے دیکھا تھا جیسے وہ امام ہوں۔ان میں سے ایک صاحب یعنی یکے از بیٹا جانی محبوب نام کے ہم پر خصوصی عنایت کرتے تھے اور مہربان ہوتے تھے۔ محبوب آغا خان رورل سپورٹ پروگرام کے کسی شعبے کے انچارج تھے اور پشاور اور ہر چین کے درمیان اپنی طاقتور جیپ میں سرگرداں رہتے تھے ۔بلند قامت تھے اور عینک پہنتے تھے۔ کسی بھی گفتگو کا آغاز جھک کر باقاعدہ کورنش بجالاتے ہوئے ایک نہایت سازشی سرگوشی میں ۔۔۔۔" یور مجیسٹی" ۔۔۔میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں" سے کرتے تھے کہ۔۔۔اب یہ " یور مجیسٹی " کی عادت اُنہوں نے پرنسس ڈیانا کے دورے کے دوران اختیار کی تھی یا اُن کی خصلت میں شامل تھی، یہ میں نہیں جانتا۔" ۱۲؎

ہر کہانی میں کردار ہی سب سے اہم ہوتے ہیں۔ اگر کرداروں کا چناؤ صحیح نہ ہو تو ظاہر ہے اُن کا ہر فعل، اُن کا ہر ایکشن اور اُن کا ہر کردار غیر متوازن، بے تاثر اور غیر نتیجہ خیز ہو گا گویا ہر کہانی کرداروں کے گرد گھومتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر کہانی کو کردار ہی گھماتے ہیں۔ کرداروں کا جاندار کردار کسی

کہانی کو جان بخشتے ہیں اور کمزور کردار کہانی کو بے روح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ سفر نامہ اگرچہ کوئی کہانی نہیں بلکہ حقائق نامہ ہے اس کے باوجود بھی سفر نامے یا حقائق نامے کے لیے مستنصر حسین تارڑ نے ہمیشہ کرداروں کے چناؤ میں انتہائی احتیاط اور باریک بینی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے کردار اپنے سفر نامے میں ساتھ لایا ہے یا اُنہوں نے اپنے سفر پر جانے سے پہلے ہمیشہ ایسے ہم سفروں کا انتخاب کیا ہے جن میں کوئی نہ کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے اور اس پر مستزاد مستنصر جس جاندار طریقے سے قاری کو اپنے ساتھیوں سے متعارف کراتے ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔

سفر نامہ " برفیلی وادیاں " میں مستنصر نے اپنی عادت کے برعکس ابتدا ہی میں اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا ہے بلکہ اسے تعارف کی بجائے اگر اُس کے کسی ساتھی کی شخصیت کا چھوٹا سا خاکہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ مستنصر نے جس ماہرانہ طریقے سے اور شگفتہ اُسلوب میں اپنے ساتھیوں کی لفظی تصویر کھینچی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ جیسے خود بخود دوڑ جاتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ خود بھی اپنے سفر نامے کے ان کرداروں سے خاصا متاثر ہوا ہے جس کا اظہار اُنہوں نے تمہیدی الفاظ میں بھی کیا ہے۔ ذیل میں اُس کے ایک ساتھی کا تعارف بطور مثال یہاں پیش کیا جاتا ہے جس سے نہ صرف مستنصر کے طبع ظریف کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ اُس کے چنیدہ کردار کی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مستنصر پرنس سلیم کے تعارفی کلمات میں یوں رقم طراز ہیں:

> "اس سفر میں پرنس سلیم بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ سچ مچ تو پرنس نہیں محض نام کا فائدہ اُٹھا رہا تھا جیسے ہمارے کالج کی کینٹین کا ٹھیکدار چنگیز محمود اپنے نام کی وجہ سے دنیا بھر کے منگولوں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا۔ سلیم شکل سے ایسا ولن لگتا تھا جو ہیرو کی خلوتوں میں رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے۔ اگرچہ اُس نے میرے ساتھ جانے کا ارادہ توکے ٹو کہانی کے زمانے میں باندھا تھا لیکن پھر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اُس نے یہ بندھا ہوا ارادہ کھول دیا اور اب اتنے برسوں بعد جب اُس نے پھر سے یہ ارادہ باندھا تو ہم نے خصوصی بندوبست کیا اور اُس کے بندھے ہوئے ارادے کی گانٹھ کو دوستی کے پانی سے سینچ کر ایسا پکا پیڈا کر دیا کہ وہ چاہے بھی تو اسے کھول نہ سکے یہ طریقہ پرانے زمانے میں دُولہا کے ازار بند کی گانٹھ پر آزمایا جاتا تھا۔ پرنس سلیم نے نہایت بکھری ہوئی واہیات نوعیت کی مونچھیں پالی ہوئی

ہیں اور جب وہ مسکراتا ہے تو اپنے ناہموار دانتوں کے باعث بگز بنی کا بڑا معلوم
ہوتا ہے لیکن پرنس چارمنگ ایسا ہے کہ کسی بھی نور جہاں کو ملنے پر اُسے کبوتر
نہیں تھماتا کہ اُن کا خیال رکھنا بلکہ اپنا فون نمبر تھما دیتا ہے کہ کر لینا۔ لاہوریوں کی
خاص حسِ مزاح کا حامل ہے اور اس کے اکثر لطیفے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن پر حاملہ
ہونے کا گمان ہوتا ہے۔" ۱۳؎

مستنصر حسین تارڑ کی یہ خوبی ہے کہ وہ ناول کی طرح سفر نامے میں بھی ایسے کردار لاتے ہیں یا بالفاظ دیگر دورانِ سفر اُن کی ملاقات ایسے افراد سے ہو جاتی ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ مستنصر کے ان کرداروں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ یہ فرضی اور من گھڑت کردار ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اکثر کردار نہ صرف حقیقی بلکہ اس مادی دنیا کے باسی ہوتے ہیں اور جن سے اُس علاقے کے مقامی لوگ اکثر واقف ہوتے ہیں جس کی مثال "ہنزہ داستان" کی ایرانی خاتون خانم ہے۔ اس کے علاوہ اسی سفر نامے میں قصبہ پسّو کے رہنے والے "ماسٹر حقیقت" ہے جن سے مستنصر کی نہ صرف ملاقات ہو جاتی ہے بلکہ وہ اُس کا دوست بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر نے اپنا دوسرا سفر نامہ "سفر شمال کے" "پسّو کے ماسٹر حقیقت کے نام" معنون کیا ہے۔ اس سفر نامے میں مستنصر نے ماسٹر پسّو کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اسے ایک مخلص، انسان دوست اور پر عزم انسان بتایا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اسے یوں متعارف کراتے ہیں:

"پچھلی شب میں نے عظیم سے کہا تھا کہ وہ گاؤں جا کر ماسٹر محمد حقیقت کو میری
آمد کی اطلاع کر دے۔۔۔ ماسٹر حقیقت۔۔۔ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔۔۔
واخی زبان اور ثقافت کے ماہر، ٹریکنگ پر ایک انگریزی کتاب کے مصنف اور
آلو اُگانے والوں کی ایسو سی ایشن کے صدر۔۔۔ پہلی ملاقات دو برس
پیشتر ہوئی اور اب وہ میرے عزیز دوست تھے" ۔ ۱۴؎

ماسٹر حقیقت کے علاوہ اسی سفر نامے میں مستنصر نے غل کن کے رہنے والے اور نشتر میڈیکل کالج ملتان سے فارغ ہونے والے اور چھوٹے سے گاؤں 'گل مت' میں اپنے وطن کی خدمت کرنے والے ڈاکٹر نیامت اللہ شاہ سے ہماری ملاقات کرائی ہے۔ اس کے بعد ہنزہ میں جانی پہچانی شخصیت 'جر من' نامی شخص سے ملتے ہیں جس کے بارے میں ہنزہ کے طول و عرض میں بے شمار کہانیاں پھیلی ہوئی

ہیں۔ جو کچھ عرصہ یورپ میں بھی رہا ہے مگر کسی جھگڑے کی وجہ سے یورپ چھوڑ دیتا ہے اور یہاں ہنزہ میں رہائش اختیار کرلیتا ہے وہ 'جرمن ہوٹل' کے نام سے اپنا ہوٹل چلاتا ہے اور سیاحوں کی خدمت کرتا ہے۔ اسی سفرنامے کا ایک اور دلچسپ کردار 'علی امان' ہے اور جو بقول اُس کے 'وہ ہنزہ گوجال کا واحد آرٹسٹ' ہے۔ جسے اداکاری کرنے اور گانا بجانے کا شوق ہے۔ وہ مستنصر سے درخواست کرتا ہے کہ اسے ٹیلی ویژن پر اپنا ہنر دکھانے کا موقع دیا جائے مستنصر حسین تارڑ اس نوجوان کے بارے میں کہتے ہیں:

"ٹیلی ویژن کے ناظرین نے بعد میں اسی نوجوان کو موسیقی ۸۹ء کے پروگرام میں ہنزہ کے روایتی لباس میں گاتے دیکھا اور پسند کیا۔۔۔ لیکن وہ ٹیلی ویژن پر میری وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ٹیلنٹ کی وجہ سے پہنچا"۔ ۱۵؎

الغرض ان جیسے دلچسپ اور متنوع کرداروں سے مستنصر کا سفرنامہ نہ صرف مقبول ہو گیا بلکہ قارئین کا ایک وسیع حلقہ ان دلچسپ اور زندہ کرداروں سے بھی واقف ہو گیا جن سے مستنصر سیاحت کے دوران کسی نہ کسی صورت میں ملتا رہا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی یہ عادت ثانیہ ہے کہ جب بھی وہ کسی مہم پر جاتے ہیں یا کسی علاقے کی سیر کا پروگرام بناتے ہیں تو وہ اُن کے ہمراہ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا ہے چاہے وہ اُن کے فیملی کے افراد ہوں یا اُن کے دوست احباب وغیرہ ہوں۔ یہ افراد گویا اُن کے سفرنامے کے لیے سیمنٹ چونے کا کام دیتے ہیں اور وہ نہ صرف اُن کے سفرناموں کے میک اپ اور تزئین و آرائش میں ممد و معاون ہوتے ہیں بلکہ اُن کے ساتھ نوک جھوک میں دلچسپی کا جو عنصر پیدا ہوتا ہے وہ قاری کو آغاز سے لے کر اختتام تک اپنے سحر میں جکڑے رہتا ہے۔ کے ٹو کہانی میں بھی مستنصر حسین تارڑ نے چند ایسے احباب بلکہ کرداروں کو جمع کرلیا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے اپنی ایک دلچسپ شناخت کے مالک ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر مستنصر حسین تارڑ ان کرداروں کو شامل کیے بغیر کے ٹو کا سفرنامہ لکھتا تو وہ محض ایک سفری کہانی سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتا۔ اس سفرنامے کو پڑھ کر بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ "کے ٹو کہانی" ایک سفرنامے کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ یا ناول بھی ہے کیونکہ اس میں جہاں ادبیت کا رنگ ہر ہر سطر میں واضح طور پر چھایا ہوا نظر آتا ہے وہاں کرداروں کی تحلیل نفسی، کہانی کی بُنت، اس کا آغاز، ارتقاء اور انجام میں ایک خاص قسم کا ربط، مختلف واقعات کا آپس میں تعلق اور ایک خاص سلیقے اور فنی مہارت سے بدلتی ہوئی کیفیات، حالات اور واقعات اس کہانی کو سفرنامے سے زیادہ افسانہ اور ناول بنا کر پیش کرتے ہیں اور یہی وہ اصل نکتہ ہے جس

نے مستنصر حسین تارڑ کو ادبی دنیا میں سفر نامے کا "سپر مین" بنا دیا ہے جس کو دیکھنے کے لیے اور جس کی تحریریں پڑھنے کے لیے قارئین کا ایک وسیع حلقہ موجود ہے۔

مستنصر حسین تارڑ جہاں ایک کامیاب سفر نامہ نگار ہیں وہاں وہ ایک بہترین خاکہ نگار بھی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے سفر ناموں میں اپنے ہمراہ ساتھیوں کے ایسے زبردست خاکے کھینچے ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مستنصر سفر نامہ نگار ہیں یا خاکہ نگار ہیں۔ مستنصر کے ساتھ کے ٹو مہم پر جانے والوں میں بظاہر سات افراد ہیں مگر یہ سات افراد بذات خود سات کہانیاں ہیں جس کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے کے رنگ میں شامل کر کے اپنی کہانی کو اور زیادہ رنگین بنا دیا ہے۔ شاہد عزیز پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل ہیں جس کی ساری زندگی کورٹ روم اور قانون کی کتابوں کی ورق گردانی میں گزری ہے مگر اس وقت وہ بنفس نفیس مستنصر کے ساتھ کے ٹو کی سیر کے لیے مچل رہا ہے۔۔ مستنصر نے چند جملوں میں اس کا بڑا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے۔ مستنصر کا دوسرا ہم سفر عامر ہے جس کا تعلق ایک کاروباری خاندان سے ہے اور جن کی زندگی ایک مخصوص دائرے میں گھومتی ہے مگر عامر کبھی کبھار اس دائرے سے نکل کر آوارہ گردی پر نکل جایا کرتا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کے مطابق اُس کی انگلیوں کی کپکپاہٹ اُسے اپنے مخصوص اور محدود ماحول سے نکالنے پر مجبور کرتی تھی۔ مستنصر کا تیسرا ہم سفر نعمان مرزا تھا جس کا تعارف دلچسپ بھی ہے اور ادبیت کے رنگ میں رنگین بھی ہے۔ مستنصر کی زبان سے سنئیے:

> راولپنڈی کی مال روڈ پر واقع سٹیٹ لائف کی عمارت کی تیسری منزل پر نعمان مرزا نے میز پر بکھری فائلوں اور پالیسی ہولڈرز کی حسابات سے سر اُٹھایا ایک باریک سگار سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔ تمباکو کی نشہ آور مہک اس کے مختصر بدن کے ارد گرد پھیل گئی۔ وہ بے حد اپ سیٹ تھا اور زندگی سے ایسے بیزار تھا جیسے کسی نوجوان کی پہلی دوست لڑکی اسے ملنے کا وعدہ کر کے وقت مقررہ پر نہیں پہنچتی اور اس بجھے بجھے انتظار میں اس کے بال بکھر جاتے ہیں۔ اور کھڑے اس کی ٹانگیں سوکھ جاتی ہیں۔۔۔ اور پھر بارش شروع ہو جاتی ہے اور اس کے پاس برساتی نہیں ہوتی"۔ ۱۶۔

کے ٹو پر جانے والے گروپ کا چوتھا ہم سفر ایک ڈاکٹر تھا جس کے لیے باقاعدہ اخبار میں اشتہار دیا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں ڈاکٹر عمر اُن کا ساتھی بن گیا مگر مستنصر حسین تارڑ اور اُن کے گروپ کے ساتھ جانے کے لیے اُس نے اُن کی باقاعدہ انٹرویو کرنے کی شرط رکھی اور انٹرویو لیا بھی ایسا کہ قاری کو ان کے بارے میں جان کر ڈاکٹر کی ڈاکٹریٹ مشکوک نظر آنے لگ جاتی ہے۔ انٹرویو کی ذرا ایک جھلک تو ملاحظہ کیجیے:

(ڈاکٹر) کیا آپ نے کبھی خود کشی کرنے کی کوشش کی ہے؟
(مستنصر) جی بس اتفاق نہیں ہوا۔
۔۔۔ کمال ہے۔۔۔ اچھا کبھی خود کشی کے بارے میں سوچا بھی نہیں ؟
ہاں۔۔۔۔ سوچا تو ہے۔
سنجیدگی سے؟
ہاں۔۔۔۔ سنجیدگی سے۔۔۔۔۔
ڈاکٹر صاحب کھل گئے۔۔۔ پھر ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ کے ٹو کی مہم پر چلوں گا۔۔۔ آپ تو بہت عمدہ شخص ہیں"۔ ۱۷؎

مستنصر کے گروپ کا پانچواں ساتھی خالد تھا۔ چھٹا ہم سفر شاہد عزیز ایڈوکیٹ کے دوست میاں فرزند علی تھے ۔ ساتواں شخص خود مستنصر حسین تارڑ تھے جو کے ٹو مہم پر جانے والے گروپ کے سرخیل تھے۔ غرض مستنصر حسین تارڑ نے اپنی ٹیم میں جن کرداروں کو شامل کیا تھا وہ نارمل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک ابنارملٹی کا شکار بھی تھے۔ مستنصر نے آغاز میں اُن کا فرداً فرداً تعارف کرا کے قارئین کو ان کی نفسیات کے بارے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اِن متنوع کرداروں کی شمولیت سے سفر نامے میں ایسی جاذبیت، کشش، دلچسپی اور تحیر و سسپنس پیدا ہو گیا ہے کہ قاری گھنٹوں اس کے سحر میں کھویا رہتا ہے۔

طنز و مزاح

طنز و مزاح ایک ایسا ہتھیار ہیں کہ اگر ان کا استعمال سلیقے سے کیا جائے تو اس سے نہ صرف تحریر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تاثیر سے قاری گھنٹوں سر دھنتا ہے جبکہ اس کا بے جا استعمال طبیعت پر بوجھ اور تحریر پر ایک بد نما داغ ہوتا ہے۔ابن انشاء، عطاء الحق قاسمی اور ان جیسے دیگر ماہرینِ ادب نے طنز و مزاح کے ایسے شگوفے چھوڑے ہیں جن کی وجہ سے اُن کی تحریریں آج بھی زندۂ جاوید ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ بھی اُن نابغۂ روز گار ماہرین ادب میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں میں طنز و مزاح کا بڑا بر محل اور برجستہ استعمال کیا ہے۔بالخصوص سفر نامے میں اُنھوں نے ایسے انداز میں طنز کا حربہ آزمایا ہے جس سے نہ صرف سفر نامے کے حسن اور شگفتگی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اس سے قاری میں اصلاح کا جذبہ عود کر آتا ہے۔انہی حربوں اور وسیلوں سے مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے بھرے پڑے ہیں۔لکھتے ہیں:

> ”سادھوکے آیا تو اس کے آس پاس پھیلے وسیع تالابوں میں سفید کنول کے ہزاروں پیالے تیرتے تھے ۔ ان تالابوں کو آپ جوہڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔لیکن یہ خیال رہے کہ انگلستان میں بھی ذرا وسیع قسم کے جوہڑ ہیں جنہیں ہم لوگ بڑی عقیدت سے جھیلیں کہتے ہیں اور اِن کے کنارے کی جانے والی شاعری پر جھوم جھوم اُٹھتے ہیں۔میں بھی اُن پاکستانی ادیبوں میں سے ایک ہوں جو اپنے ملک کے موسموں، پھولوں، درختوں اور اُن میں رہنے اور اُڑنے والی مخلوق سے بے خبر ہیں ۔ہم ایران ، انگلستان اور ہندوستان کے زمینی جغرافیے سے تو واقف ہیں لیکن پاکستان کے کس خطے میں گندم کب سنہری ہوتی ہے اور ان دنوں گندم کی بالیوں میں کس قسم کی مہک ہوتی ہے اس بارے میں مکمل لاعلم ہیں۔۔۔بڑا ادب صرف زمین اور اُس کے باسیوں کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے اور اگر آپ اُنہیں نہیں جانتے تو قلم نہ اُٹھانا زیادہ بہتر ہے۔۔“۔ ۱۸؎

مستنصر حسین تارڑ کو جب بھی موقع ملتا ہے تو ہمیں آئینہ دکھانے میں ذرا بھی سستی نہیں دکھاتے۔وہ اگر کہیں پر حکمرانوں کی ناانصافیوں، اُن کی عوام دشمن پالیسیوں اور اُن کے منفی کردار کا ذکر کرتے ہیں تو وہیں۔عوام کو بھی طنز و تنقید کا نشانہ بنا کر اُن کی غلطیوں کو طشت از بام کرتے ہیں۔چونکہ ہم عرصۂ دراز تک انگریزوں کے غلام رہے ہیں اس لیے آزادی کے بعد بھی اپنے گورے آقاؤں کو نہیں بھولے ۔تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ اپنے ہیروز کی ناقدری کی اور غیروں کا ساتھ دے کر اپنے بہادروں کا پاؤں خود کاٹنے کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ مستنصر نے پورس اور انگریز جاسوس براؤن ہاورڈ کی مثال دہرا کر ہمیں ہمارا پھٹا ہوا گریبان دکھانے کوشش کی ہے اور تاریخ سے باقاعدہ حوالے دے کر ہمارے اس منفی کردار کو افشا کیا ہے۔

پورس پنجاب کا ایک نامور حکمران گزرا ہے جس کی ریاست دریائے جہلم اور چناب کے درمیان واقع تھی۔دریائے جہلم کے دوسری طرف اُس کے دشمن راجا امبھی کی حکمرانی تھی۔سکندر اعظم ہندوستان پر ۳۲۷ قبل مسیح میں حملہ آور ہوئے تو امبھی نے پورس کے ساتھ ذاتی عداوت کی وجہ سے سکندر اعظم کا ساتھ دیا۔زر و جواہر دینے کے ساتھ ساتھ امبھی نے ہزاروں مسلح افواج بھی پورس کو نیچا دکھانے کے لیے سکندر اعظم کی خدمت میں پیش کیے۔پورس سکندر اعظم کی اطاعت قبول کرنے پر کسی طرح تیار نہیں تھا نتیجتاً سکندر اعظم رات کی تاریکی میں حملہ آور ہوا اور پورس کے جنگی ہاتھیوں نے بوکھلا کر اپنے ہی لشکر کو روند ڈالا اور یوں اپنوں کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ کر پورس کو شکست ہوئی۔

مستنصر نے پورس کے علاوہ شمالی علاقہ جات کے پہلوان نامی مقامی ہیرو کا ذکر کیا ہے جس نے ایک انگریز جاسوس کو قتل کر کے ایک کارنامہ انجام دیا تھا مگر لوگ اس کے کارنامے کو ایک ' وحشیانہ کاروائی' قرار دے کر اُس انگریز کی موت کا سوگ منانے لگے۔ مستنصر کا منشا دراصل یہ ہے کہ ہمیں چاہییئے کہ اپنی تاریخ نہ دہرائیں۔پرانی غلطیوں سے سبق سیکھیں اور اپنے ہیروز کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کر کے اُن کو خراج تحسین پیش کریں۔وہ لکھتے ہیں:

> "اور وادئ یاسین کا قلعہ تھا۔راجہ گوہر امان کا قلعہ جس کے نامور بیٹے کا نام پہلوان تھا۔۔۔اسی پہلوان نے انگریز جاسوس ہاورڈ کو۔۔۔درکوت گاؤں کے آس پاس ایک خیمے میں۔۔۔جب کہ اُس کی میز پر روشن موم بتی کی موم پگھل کر اُس کے کاغذوں پر گرتی تھی اور سرد ہوا منجمد ہوتی تھی۔۔ قتل کروا دیا تھا۔

اور پھر پوری سرکارِ انگلشیہ اور اُس کے نمک خواروں نے اُس کا ماتم کیا تھا اور وہ نظم ہمیں ان علاقوں کے ہر سفر نامے میں ملتی ہے جو " درندہ صفت وحشیوں" کے ہاتھوں مارے جانے والے اس تہذیب یافتہ گورا لوگ پر لکھی گئی اور زبان زد عام ہوئی۔۔ آج بھی بہت سے براؤن ہاورڈ صاحب کی موت پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس کے طرفدار ہیں۔۔ مقامی ہیرو گوہر امان اور پہلوان کے۔۔۔ جو اپنی دور افتادہ ریاست میں امن و امان سے رہتا تھا۔۔ یا ہاورڈ کے جو ان وادیوں میں صرف اور صرف یونین جیک کی سربلندی کے لیے آیا تھا۔ چونکہ ہم مقامی ہیروز کو ناپسند کرتے ہیں اور پورس کے مقابلے میں سکندر کی طرفداری کرتے ہیں اس لیے یہاں بھی ہم ہاورڈ کے ہی وفادار ہیں۔"

۱۹۔

مستنصر حسین تارڑ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ انسان ہو یا حیوان، ذی روح ہو یا بے روح، چھوٹا ہو یا بڑا، معمولی اور بے وقعت چیز ہو یا غیر معمولی اور قد آور چیز ہو، ہر موضوع پر بے تکان لکھتے ہیں۔ اُن کے پاس معلومات کی کمی نہیں، ذخیرۂ الفاظ اُس کے راستے کی رکاوٹ نہیں، موضوعات کی اُس کے پاس کمی نہیں۔ وہ معمولی سے معمولی چیز پر جب لکھتے ہیں تو اسے اَمر کر دیتے ہیں۔ مستنصر کا قلم اُسے اتنا نمایاں کر دیتا ہے کہ وہ زبان زد خلائق ہو جاتا ہے۔ سید احمد شاہ پطرس بخاری نے مضمون " کتے " لکھ کر کتے جیسی حقیر مخلوق کو محفل کی جان بنا دیا جب بھی لوگ کتے کی بات لے بیٹھتے ہیں وہاں کتے کے بارے میں پطرس کی قصیدہ گوئی و ہجو گوئی کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ یہاں مستنصر حسین تارڑ اپنے سفر نامہ "راکاپوشی نگر" میں گدھے کی شان میں رطب اللسان ہیں اور بتایا ہے کہ جب گدھے کی رومانویت جاگ اُٹھتی ہے تو وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگ جاتا ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے ڈھینچوں ڈھینچوں کے جواب میں دو دوسرے گدھے بھی نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ ایک بات بالکل واضح ہے کہ مستنصر حسین تارڑ پطرس کے " کتے" سے متاثر ہوئے ہیں جبھی وہ پطرس کے طرز پر "گدھے" کا قصیدہ لکھ بیٹھے ہیں۔ بہر حال بات 'کتے' کی ہو یا 'گدھے' کی دونوں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے، دونوں اپنی اپنی کوششوں میں کامیاب رہے ہیں اور دونوں نے بے زبان مخلوق کے جذبات کی سچی ترجمانی کی ہے۔ ذیل میں دونوں کی تحریر کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

پہلے پطرس کے مضمون ''کتے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

'کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کردیا۔اب جناب ایک کہنہ مشق اُستاد کو جو غصہ آیا۔ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے 'اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتنے نے زوروں کی داد دی۔اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیئے کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ۲۰؎

مستنصر حسین تارڑ نے زیر نظر اقتباس میں نہ صرف گدھوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں بلکہ اُنھوں نے گدھوں کی ڈھینچوں ڈھینچوں کا آج کل کے پاپ سنگرز سے موازنہ کرکے اُن کی خوب خبر لی ہے۔

''گدھے کبھی بھی کُتّوں کی مانند کورس میں نہیں گاتے بلکہ وہ انفرادی گائیکی پر یقین رکھتے ہیں۔اگر ایک گدھا راکاپوشی کے گلیشیئر کے قریب کھڑا ہے اور یکدم رومانوی ہو کر اپنی کسی فیورٹ گدھی کی یاد میں تھوتھنی اُٹھا کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کردیتا ہے تو بقیہ گدھے جو پورے بیس کیمپ کے طول و عرض میں خرمستیاں کر رہے ہیں۔وہ نہایت تحمل سے اس برادر کی آہ وزاری سنیں گے۔ جونہی اُس گدھے کی گائیکی کے آخری سُر مدھم ہوتے ہیں تو فوراً ہی ایک اور گدھا نغمہ سرا ہو جاتا ہے اور بقیہ گدھے اپنے لامبے کان اُس کی آواز کی جانب سرکا کے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔میں آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ تمام گدھوں کی آواز ایک جیسی ہوتی ہے،وہ ایک ہی انداز میں بلند و آہنگ ہوتے ہیں جب کہ ہپاکن میں اور یہاں تاگافیری کی راتوں میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ انسانوں کی مانند گدھوں کی آوازیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔اُن میں کچھ کسی حد تک سُریلے

ہوتے ہیں، سُر کی پہچان رکھتے ہیں اور اونچے سُروں میں جانے کے باوجود اُن کی
آواز کی کوالٹی میں کچھ فرق نہیں پڑتا ،یعنی اُن میں بھی بڑے غلام علی خان
وغیرہ پائے جاتے ہیں اور اُن میں سے بیشتر پروفیشنل نہیں ہوتے عطائی ہوتے
ہیں، خاندانی نہیں ہوتے، یونہی فلمی گانے سُن سُن کر گائیک بن جاتے ہیں اس
کے باوجود وہ ہمارے پاپ سنگرز سے زیادہ سُریلے ہوتے ہیں کہ کم از کم اُن کی
آواز میں دکھ درد کی ایسی صدائیں ہوتی ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق جو گدھے
کرتوتوں کی کثرت سے قدرے ناتواں ہوجاتے ہیں وہ ہمیشہ دھیمے سُروں میں اور
ذرا وقفے وقفے سے ڈھینچوں کرتے ہیں مثلاً ایک بار ڈھیں کرتے ہیں تو اُن کا
سانس ساتھ نہیں دیتا اور وہ چُپ ہو جاتے ہیں اور پھر بہت دیر کے بعد وہ " چوں
" کرتے ہیں۔ ۲۱۔

مستنصر کی ایک بہترین خوبی یہ ہے کہ جو کچھ اُن کے دل میں ہوتا ہے وہی اُن کی زبان پر بھی ہوتا ہے وہ لگی لپٹی سے دور رہتے ہیں۔ وہ ایک بے رحم جراح کی طرح غیر جانبداری سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو اُس شخص کا نام تک لینے سے نہیں ہچکچاتے۔ بعض اوقات اشارے کنائے بھی استعمال کرتے ہیں مگر یہ اشارے کنائے بھی اتنے واضح اور غیر مبہم ہوتے ہیں کہ قاری مستنصر کے مقصد کو پالیتا ہے۔ زیرِ نظر اقتباس میں مستنصر نے اتنے واضح اشارے دیے ہیں کہ قاری کو زیادہ سوچ و فکر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ لکھتے ہیں :

پاپ سنگرز میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دھنوں پر میں سر دھنتا ہوں اُنہیں پسند
کرتا ہوں لیکن اُن میں ایک صاحب ایسے ہیں۔۔۔ آپ کبھی اگر ممکن ہو تو کسی
گدھے کو نہایت قریب ہو کر جبڑا کھول کر ڈھینچوں ڈھینچوں کا الاپ کرتے
دیکھیئے اور پھر اُن پاپ سنگر کو دیکھیئے، یقین کیجیے وہ بھی پھاڑ کر ایسے گاتے ہیں کہ
اُن کی نسبت گدھے زیادہ سُریلے لگتے ہیں۔ وہ اپنے تئیں گاتے ہیں اور جب
آواز ساتھ نہیں دیتی تو۔۔ جبڑا کھول کر ڈھیں ڈھیں کرنے لگتے ہیں۔ ۲۲۔

سفر نامہ " سفر شمال کے " میں مستنصر حسین تارڑ نے بیسیوں جگہوں پر نہ صرف طنز و مزاح کے رنگ بکھیرے ہیں بلکہ اپنے مخصوص اندازِ بیان کی بدولت قاری کو بار بار داد دینے پر مجبور بھی کیا ہے۔ سفر نامے کا آغاز ہی وہ ہلکے پھلکے مزاح سے کرتا ہے۔ کہتے ہیں :

"میں نیلی کار کو مکینک کے پاس لے گیا۔" اس نے پہاڑوں پر چڑھنا ہے اسے جو کچھ کر سکتے ہو کر دو"۔

"اس کی تو بریکیں ہی نہیں ہیں خاص طور پر ہینڈ بریک"۔ مکینک کہنے لگا۔ " اور پہاڑوں پر غالباً بریکوں کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے"۔ میں نے سر کھجا کر کہا۔ "

جی ہاں۔۔۔۔ غالباً۔۔۔۔"

اس نے نیلی کار کی ہینڈ بریک ایسے درست کی کہ اس کے لگتے ہی کار باقاعدہ منجمد ہو جاتی۔۔۔" ۲۳؎

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"کالاشاہ کاکو کی ہواؤں میں جو کیمیائی بُو تھی وہ کار کے اندر آئی تو بچوں نے ناگواری کے اظہار کے لیے اپنی اپنی سیدھی اور تیکھی ناکیں چڑھائیں اور کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے' ۲۴؎

ادبی تخلیقات کے لیے ضروری ہے کہ اُس میں ربطِ کلام اور تسلسل ہو۔ واقعات، کرداروں، موقع محل اور کسی نثر پارے کی ابتدا، عروج اور اختتام کا آپس میں مربوط میکنیزم ہو جس کے سہارے بات کو آگے بڑھایا جاسکے اور کہیں پر بھی یہ تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ اگر یہ شرط کسی ادبی تخلیق میں موجود ہے تو اس کی جاذبیت اور دلچسپی میں کلام نہیں بصورتِ دیگر بے ربط اور بے جوڑ تحریر سے قاری بہت جلد اُکتا جاتا ہے اور اُس کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کو اگر اس کسوٹی پر پرکھا جائے تو بلاشبہ اُس کی تمام تر تخلیقات میں یہ خوبی بدرجۂ اتم نظر آتی ہے کہ اُن میں ربطِ کلام اور تسلسل کا لحاظ ہر جگہ مد نظر رکھا گیا ہے بلکہ جس اچھوتے اور غیر محسوس انداز میں مستنصر حال کا رشتہ کبھی ماضی سے اور کبھی مستقبل سے جوڑتے ہیں، وہ قابل تعریف ہے۔ کہیں پر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کلام اور تحریر میں بے ربطی پیدا ہو گئی

ہے۔ سفر نامہ نگار کے لیے تو یہ چیز اس لیے بھی ضروری ہے کہ اُس کے بیان پر ہی اُس کی تحریر کی کامیابی کا دارومدار ہے ۔بیان میں جس قدر ربط و تسلسل زیادہ ہو گا اسی قدر اس میں قاری کی دلچسپی پیدا ہو گی۔ زیر نظر اقتباس میں حال سے ماضی اور پھر ماضی سے حال میں آنے کا قصہ ہے۔ مستنصر کی گاڑی خراب ہے۔ ڈرائیور اسلم اسے ٹھیک کرنے میں لگا ہوا ہے مگر اسے ٹھیک کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے تو مستنصر اس سے گاڑی کی بابت بات کرنے کے بعد ماضی کا قصہ سنانے لگ جاتا ہے اور ماضی سے حال کی طرف بڑے خوبصورت طریقے سے رجوع کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "مجھے یاد ہے جب بہت برس پہلے " نکلے تیری تلاش میں" کے زمانے میں میرے دوست ناصر، مظہر اور مصدق ایک فوکس واگن کے بوسیدہ ڈبے میں میرا پیچھا کرتے ہوئے بائی روڈ لندن پہنچ گئے اور وہاں پہنچتے ہی ناصر نے اس ڈبے کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا اور اُس کے پرزے، انجن، بیٹری ، مڈ گارڈ ، نشستیں ، تاریں وغیرہ کوئی نصف کلومیٹر کے علاقے میں بکھرے پڑے تھے۔۔۔۔ تو صدیق نے دہائی دی تھی " اوئے ناصر، یہ سینکڑوں پرزے تم کیسے دوبارہ اسمبل کرو گے۔ ناصر نے لاپروائی سے کہا، اوئے جوڑ لوں گا"۔۔۔۔۔۔ ناصر نے اُسی انجر پنجر کو صرف ایک ہفتے میں جوڑ جاڑ کر سٹارٹ کر لیا تھا۔۔۔۔۔۔ بہر حال اسلم نے کہا تھا کہ میں مک مکینک ہوں تو کل صبح تک پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنا مک مکینک ہے"۔ ۲۵۔

ہر سفر نامے میں واقعات ہوتے ہیں، مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں، تاریخ و ثقافت سے متعلق تاثرات ہوتے ہیں گویا سفر نامہ ایک دستاویزی تحریر ہوتا ہے مگر مستنصر حسین کے تارڑ کے ہاں سفر نامہ محض ایک دستاویزی تحریر کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل کہانی ہوتا ہے۔ مستنصر نے سفر نامے میں کہانی پن کے عنصر کو شامل کر کے اسے ادب کی ایک زندہ و تابندہ اور سدا بہار تخلیق کا رنگ دیا ہے۔ جس طرح کہانی میں کردار ایک ایک کر کے ظاہر ہوتے جاتے ہیں بالکل اسی طرح مستنصر کے سفر ناموں میں بھی کردار موقع محل کے مطابق خود بخود شامل ہوتے جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی ناول یا افسانے کے کردار آخر تک چلتے رہتے ہیں اور کہانی کے اختتام تک موجود رہتے ہیں مگر مستنصر کے کردار چونکہ

حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ موقع محل کے مطابق اپنا کردار نبھا کر پس پردہ چلے جاتے ہیں اور اُس کی جگہ نئے کردار آکر پرانے کرداروں کی جگہ پُر کر لیتے ہیں۔ مستنصر سفر ناموں کا آغاز بھی روایتی انداز کی بجائے جدید، انوکھے اور ڈرامائی انداز سے کرتے ہیں کبھی وہ سفر نامے کا آغاز اختتامی منظر سے کرتے ہیں۔ کبھی براہ راست اُس مقام کا ذکر چھیڑتے ہیں جہاں منزل مقصود ہوتی ہے اور کبھی ماضی کے سفر ناموں سے اس کا رشتہ اُستوار کر کے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی اس فنی خوبی یعنی کہانی پن کی وجہ سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں ورنہ آج کل کون سفر نامے پڑھتا ہے؟ مستنصر حسین تارڑ نے سفر نامے کو اُس ادبی معیار تک پہنچایا ہے جہاں قاری ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ سفر ناموں کا بھی مطالعہ کرنے لگا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں ادب کا ہر وہ حربہ آزمایا ہے جس سے کسی تحریر کے ادبی حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔اس میں افسانوی رنگ بھی شامل ہے اور ناول کی طرح اس میں متعدد کہانیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ اس میں ڈرامائی انداز بھی موجود ہے اور مکالماتی تکنیک کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ جاسوسی ناولوں کی طرح تحیر و سسپنس بھی موجود ہے اور کسی ماہر مصور کی طرح منظر نگاری کے رنگوں سے بھی مزیّن ہے۔ان تمام اوصاف کے امتزاج سے مستنصر کا سفر نامہ تخلیق ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری اُن کے سفر نامے پڑھ کر اطمینان کا ایسا گہرا سانس لیتا ہے جیسے کسی تشنہ لب شخص کو ویرانے میں ٹھنڈا پانی میسر آیا ہو جس کی تشنگی بالکل ختم ہو گئی ہو۔

"کیا کہا ہے میڈم؟"

"یہ دلال کا بچہ کہتا ہے کہ تم تارڑ کے ساتھ ہنس کر بات کیوں کرتی ہو۔

کوئی بات ہے اور یہ جو اے سی صاحب اور ایس پی صاحب اس کے واقف ہیں یہ ان کے ساتھ تمہارا سودا کر رہا ہے۔ یہ ایک عجیب اعزاز تھا جو زندگی میں پہلی بار مجھے نصیب ہو رہا تھا۔۔

"کیوں شیخ صاحب۔۔۔"

شیخ صاحب ایک ناتواں مرغی کے ہاتھوں بے عزت ہونے والے اصیل مرغ کی طرح سینہ پھلائے اپنی شرمندگی کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنہوں نے کرسی سے اُٹھ کر اس منحنی سینے پر ہاتھ مار کر کہا" لو جی ہم بھی کوئی

قلی نہیں ہیں۔"" سر میں نے تو قطعی طور پر یہ نہیں کہا کہ آپ قلی ہیں۔ قلی تو
ریلوے سٹیشنوں پر ہوتے ہیں"
""نہیں آپ سمجھتے ہو کہ ہم قلی ہیں۔ ہم باعزت لوگ ہیں۔ آپ تارڑ صاحب
ہوں گے۔ وہ اے سی صاحب ہوں گے۔ایس پی صاحب ہوں گے لیکن ہم
بھی قلی نہیں" جناب عالی میں نے کب کہا ہے کہ آپ قلی ہیں لیکن یہ آپ
کس قسم کے الزامات لگا رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس قسم
کا تاجر نہیں ہوں' کہ سودے کراتا پھروں۔ آپ آپ جان جی کو
سمجھائیں۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ یہ اگر واک آؤٹ کرتی ہیں تو ہمارے ڈرامے کا جہاز ڈوب جائے گا
۔۔پلیز۔۔۔"۔ ۲۶۔

سفر نامہ " نانگا پربت " کا آغاز بڑے دلچسپ اور پر مزاح انداز میں ہوا ہے۔ اس سفر میں مستنصر حسین کے ساتھ اُن کے دو دوست نظامی صاحب اور مطیع الرحمن تھے۔ نظامی صاحب سچ مچ مستنصر کے دوست ہیں یا مستنصر نے سفر نامے کو دلچسپ بنانے کے لیے اُن کو تخلیق کیا ہے بہر حال نظامی صاحب کی موجودگی سے مستنصر نے " نانگا پربت میں خوش طبعی و ظرافت کے وہ گل کھلائے ہیں جن کی خوشبو چند روزہ نہیں بلکہ ان کی مہک اور خوشبو سے ہر زمانے کا قاری لطف اندوز ہوتا رہے گا اوران کی چٹخارے دار گفتگو اور مستنصر کے ساتھ نوک جھوک سنجیدہ سے سنجیدہ قاری کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتی ہے۔ نظامی صاحب کا تکیہ کلام " اندازہ کرو" قاری کو بہت سے اندازے لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سفر نامہ پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مستنصر نے اپنے جبلی ذوق کی تسکین نظامی صاحب کے روپ میں آکر کی ہے۔ مستنصر جہاں قاری کے لبوں پر ہنسی دوڑا رہا ہے وہاں وہ انگریزی تہذیب کو بھی اپنے طنز و تیر کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اُسے مغرب کی برہنگی سے چڑ ہے۔ اُس کے خیال میں مغرب کی بے حیائی اور برہنگی نے مغرب کو اتنا ننگا اور برہنہ کر دیا ہے کہ جوان عورتیں تو جوان عورتیں، بڑی بوڑھیاں بھی اپنے جسم کی نمائش کرنے میں کسی جھجھک یا شرم کو خاطر میں نہیں لاتیں، مغرب کی بے لباسی اُنہیں عیب نہیں بلکہ خوبی نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ مغرب کی عورت دیس میں ہو یا پردیس میں، ہر جگہ اپنے جسم کی نمائش کرتی پھرتی ہے۔ مستنصر نے اُن کی اسی برہنگی، نیم برہنگی اور بے لباسی کو نشانہ بنایا ہے۔ مستنصر

اپنے دوستوں نظامی اور مطیع الرحمن کے ساتھ جہاز میں محوِ پرواز ہے۔اسی جہاز میں انگریز میمیں بھی ہیں جو نیکریں پہن کر ہمالین میراتھن دوڑ میں شرکت کرنے جارہی ہیں اور ساتھ ہی جہاز کی کھڑکی سے نانگا پربت کا نظارہ بھی کر رہی ہیں۔ مستنصر اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اندازہ کرو۔۔۔" نظامی صاحب خوش تھے اور بہت خوش تھے۔" ادھر نانگا پربت گزرتی جارہی ہے اور یہ میموں کی نیکریں دیکھ رہا ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ نشست سے اُٹھے اور دوسری قطار کی آخری نشست پر براجمان ،ایک ادھیڑ عمر، تھل تھل کرتی، کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے،نانگا پربت کو تلاش کرتی میم پر جاجھکے۔" ایکسکیوزمی۔۔۔۔ وہ مسکرائے۔میم نے ناک ہٹا کر اُنہیں دیکھا ۔۔۔۔۔۔۔ کیا میں نانگا پربت دیکھ لوں ؟" نظامی صاحب کی نظریں کھڑکی پر نہیں تھیں بلکہ میم کے فراخ اَن ڈھکے بوڑھے سینے پر تھیں۔۔۔۔ ۲۷۔

جزئیات نگاری

سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوب باریک بین ہو۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اُن کی نظر میں ہو۔وہ چیز چاہے غیر ضروری ہو یا ضروری، کام کی چیز ہو یا بے کار چیز ہو، سفر نامے میں اُس کی جگہ بنتی ہے یا نہیں بنتی، یہ سب ضمنی باتیں ہیں، اصل چیز سفر نامہ نگار کا مشاہدہ ہے کہ وہ قوی ہو،اُس کی عقابی نظریں دور بین کی طرح گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف ہو اور اُن کی نگاہوں کے حیطۂ عمل سے ایک تنکا بھی اوجھل نہ ہو تو ایسا سفر نامہ نگار اپنا فریضہ بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ مستنصر میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ وہ بیک وقت باتیں بھی کرتا ہے مگر اُس کا ذہن بیدار اور اُس کی آنکھیں ہمہ وقت کھلی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب وہ گاڑی میں سوار ایک چڑھائی چڑھ رہا تھا تو اُس کی نگاہ ایک تختی پر پڑتی ہے جس کے بارے میں وہ فوراً اپنے ساتھ بیٹھے ڈرائیور سے معلومات حاصل کرتا ہے نتیجتاً ایک تو اسے اس تختی کے لگانے کی وجوہات معلوم ہو جاتی ہیں دوسری بات اُنہیں 'برالڈو گورج' کی خطرناک چٹانوں میں سفر کرنے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

"یہ تختی ایلی سن ہار گریوز کی یاد میں تھی۔

ایلی سن ۔۔۔ پولینڈ کی داستانوی کوہ پیما خاتون وانڈا کے بعد دنیا کی دلیر خاتون کوہ پیما تھی۔۔۔۔ وہ انگریز تھی۔۔۔ دو بچوں کی ماں تھی اور گرمیوں میں پہاڑوں کی رفاقت کی اسیر ہو جاتی تھی۔۔۔ پچھلے برس اس نے تن تنہا یعنی سولو ماؤنٹ ایورسٹ پر قدم رکھا۔۔۔ پھر وہ ایک ناقابل یقین عالمی ریکارڈ قائم کرنے کی خواہش میں کے ٹو کی طرف گئی۔۔۔ کہا جاتا ہے وہ کے ٹو کی چوٹی پر پہنچ گئی تھی اور واپسی پر تیز تیز ہواؤں اور برفانی طوفان نے۔۔۔ اور یہ ہوائیں اور طوفان ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے کہ دو بچے۔۔۔ آپ کے منتظر ہیں۔۔۔ اور آپ ایک ماں ہیں اور کسی ملک میں آپ کے بغیر چولہا نہیں جلے گا۔۔۔۔ اسی لیے وہ ناقابل یقین ہواؤں کی زد میں آکر۔۔۔ ان کی لپیٹ میں آکر وہیں کہیں گم ہو گئی۔ اگلے برس اس کے دو بچے اپنے باپ کے ہمراہ اسی راستے سے گزر کر کے ٹو کے بیس کیمپ تک گئے تھے کیونکہ بچوں نے ماں کی موت کے بعد باپ سے کہا تھا۔ " ڈیڈی ہم ممی کا پہاڑ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ۲۸؎

بات میں سے بات نکالنا اور اپنی باتوں کے درمیان ربط و تعلق پیدا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جو لوگ محفلوں میں بیٹھے ہوتے ہیں، جنہوں نے زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا ہوتا ہے، جن لوگوں کا مشاہدہ قوی اور نظر دور رس ہوتی ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اور تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گئے ہوتے ہیں تو اُن کو یہ سلیقہ آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا شمار بھی اُن ہمہ رنگ اور ہمہ گیر شخصیات میں ہوتا ہے جو " عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں " کے مصداق ہوتے ہیں۔ ناول نگاری ہو یا افسانہ نگاری، کالم نگاری ہو یا مضمون نگاری، ڈرامہ نویسی ہو یا ٹیلی ویژن پر کردار نگاری، سفر نامہ نگاری ہو یا صحرا نوردی، گوروں کا دیس ہو یا اپنے وطن کی سوندھی سوندھی مٹی ہو، ہر جگہ اور ہر مقام پر مستنصر اپنی الگ شناخت کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر کو بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے، وہ بات میں سے بات نکالنا جانتے ہیں، اُن کے پاس زندگی کا تجربہ ہے، انسانوں کا تجربہ ہے، برفیلے پہاڑوں کا تجربہ ہے۔ وہ پتھروں، سنگریزوں، جھرنوں، بیابانوں، گلستانوں اور پھولوں کے شگوفوں تک سے باتیں کرتا ہے اور جب وہ ان سب رنگوں کو اپنے وجود میں سمو کر ان کا اظہار کرتا ہے تو الفاظ سچے موتی بن کر اُن کی زبان سے نکلتے ہیں اور فوراً دل پر اثر کرتے ہیں۔

> ’’کوہ نوردی کی ان گنت چارمز ہیں لیکن ان میں سے ایک چارم ایسی ہے جسے بیان کرنے سے شاید دوسرے کوہ نورد جھجھکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ بہر حال میں ہرگز نہیں جھجھکتا۔۔اور وہ ہے ’’ اوجھل جگہوں ‘‘کی ویرائٹی۔ جنہیں میں نے پاٹی پیلس کا نام دیا تھا۔ آپ اپنی نارمل اور شستہ زندگی میں ہر صبح بیدار ہوتے ہیں اور پھر قدرتی دباؤ کے تحت ایک ہی ۵ x 10 فٹ۔۔یا اس سے بڑے یا اس سے مختصر غسل خانے میں جاتے ہیں اور اپنی زندگی کا کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ وہاں گزارتے ہیں نہانے کے لیے، شیو کرنے کے لیے اور فراغت حاصل کرنے کے لیے۔برسوں تک۔ برس ہا برس تک اس تنگ قید خانے میں آپ فارغ ہوتے ہیں لیکن۔۔ کوہ نوردی میں، آوارہ گردی میں۔۔ ہر صبح۔۔ آپ ایک نئے اور اجنبی اور اکثر اوقات ششدر کر دینے والے منظر میں ’’ بیٹھتے‘‘ ہیں میرے لیے یہ ایک عجیب کشش ہے۔فیئری میڈوں کے جنگلوں میں، ٹاپ میدان میں، نانگا پربت کے فل وِیو کے سامنے، کوروفون کی ندیوں کے درمیان ،اردوکس کی گھاس پر، کنکورڈیا کے برف زاری کی ایک کلومیٹر گہری برف پر ،۔۔ کیا کوہ نوردی کا یہ ایک سراسر مختلف زاویہ نہیں وہاں اَن چھوئی ریت ہے، وہ ہوا ہے جو برف کو بوسے دیتی نیچے میرے بدن تک آتی ہے۔ شفاف تالاب اور رواں پانی ہے جو آپ کی نشست کو ڈسٹرب کئے بغیر گزر رہا ہے۔ ۲۹؎

خاص اور مشہور چیزوں کے بارے میں تو سبھی لوگ جانتے ہیں مگر جب عام چیز میں کوئی خاص رنگ، کوئی منفرد خاصیت، کوئی خاص ادا، کوئی نمایاں وصف دکھایا جائے تو اسے حقیقی معنوں میں مہارت کہتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ میں یہ صفت ہے کہ وہ عام کو خاص بناتے ہیں اور خاص بنا کر اُس کی ایسی فلسفیانہ توجیہہ کرتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انسان کا مشاہدہ جتنا قوی ہوگا اور جتنی باریک بینی سے وہ عام اشیاء کا مطالعہ کرے گا اُتنا ہی زیادہ اُس پر اُس چیز کی نئی جہتیں اور نئے زاویے آشکارا ہوں گے۔ سیب عام پھل ہے جسے سب لوگ جانتے بھی ہیں اور اسے استعمال بھی کرتے ہیں۔ بے شک اس کے طبی فوائد ہیں مگر طبی فوائد سے قطع نظر مستنصر نے سیب کے درخت کو عام سے خاص کر کے اسے رومانوی شہرت کا منبع قرار دیا ہے اور اس کی مہک میں اہل دل لوگوں کے لیے ایک سندیسہ بتایا ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

> ”سیب کے درخت اپنی رومانی شہرت اور ادبی دلکشی سے سراسر الگ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ادب میں گالزوردی کے ” سیب کا درخت “ کے اسیر ہوتے ہیں اور قاضی عبدالغفار کے ترجمے سے کسی اور جہان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔۔۔ وہ جب اصل زندگی میں سیب کے درختوں کو دیکھتے ہیں تو نہایت دل برداشتہ ہوتے ہیں۔۔۔ اس لیے کہ سیب کے درخت زیادہ پرکشش نہیں ہوتے بلکہ کسی حد تک درخت ہی نہیں ہوتے بلکہ واہیات اور بے ڈھنگے سے کچھ ہوتے ہیں لیکن یہ اُن کی مہک ہوتی ہے جو اُنہیں سب سے جدا کرتی ہے ۔ اُن کی مہک میں ایک عجیب ساسندیسہ ہوتا ہے۔۔جو صرف اُن تک پہنچتا ہے جو مہک کی طاقت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ۳۰؎

مستنصر حسین تارڑ کا انداز تحریر دوسرے سفر نامہ نگاروں سے یکسر مختلف ہے ۔ دوسرے سفر نامہ نگار کی نظر صرف ہدف پر ہوتی ہے ۔ وہ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اُدھر اُدھر دیکھنے کی بجائے ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہیں اور جو کچھ اُنہیں سامنے نظر آتا ہے اُنہیں قلم بند کرتے جاتے ہیں جبکہ مستنصر حسین تارڑ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اپنے ہدف تک پہنچنے کی جلدی نہیں کرتا۔ اُسے اس بات کی کوئی پریشانی نہیں کہ وہ اپنے ہدف تک بر وقت پہنچ سکے گا یا نہیں۔ وہ صرف آگے ہی نہیں دیکھتا بلکہ دائیں بائیں بھی ضرور دیکھتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو پیچھے کی طرف مڑنے سے دریغ نہیں کرتا۔

مستنصر کے پاس ذخیرۂ الفاظ کی کمی نہیں ۔ اُس کے پاس واقعات کی بھرمار ہے۔ ایک واقعہ لکھنے لگ جاتا ہے تو اُس سے دوسرا واقعہ جنم لیتا ہے۔ دوسرا ختم ہوتا ہے تو ماضی کی یادیں دہرانے لگ جاتا ہے۔ وہ سلسلہ ٹوٹتا ہے تو تاریخی واقعات سامنے آجاتے ہیں۔ دوسرے سفر نامہ نگار سفر نامہ لکھتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے جبکہ مستنصر سفر نامہ لکھتے ہوئے دو قدم آگے جاتے ہیں تو چار قدم پیچھے بھی جاتے ہیں۔ کبھی دائیں اتنا گھوم جاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ اپنے ہدف اور اپنے موضوع کو بھول گئے مگر اچانک ایسی مہارت سے واپس کا راستہ کا اختیار کر جاتے ہیں کہ یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ سفر نامہ نگار کب دائیں یا بائیں راستہ چھوڑ کر ناک کی سیدھ میں جانے لگا ہے۔ زیر نظر پیر گراف میں مستنصر کی یہی خوبی سامنے آئی ہے کہ وہ سفر تو 'سنولیک' کی جانب کر رہا ہے مگر بیچ میں اپنی مزدوری کا قصہ بھی بیان کر رہا ہے اور کہیں

پر سفر نامہ کا تسلسل بھی مجروح نہیں ہو رہا، یہی چیز مستنصر کو دوسرے سفر نامہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ مستنصر زیر نظر پیرا گراف میں اُن دنوں کا قصہ قلم بند کرتے ہیں وہ جب تعلیم کے سلسلے میں انگلستان میں قیام پذیر تھا۔ لکھتے ہیں:

"انگلستان میں گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں ایک اینٹوں کے بھٹّے
میں مزدوری کرنے گیا۔
فورمین نے کہا، ہاتھ آگے کرو۔
میں نے اپنی ہتھیلیاں اُس کے سامنے پھیلا دیں۔
وہ کہنے لگا، نہیں اُنہیں اُلٹا کرو۔۔۔۔
میں نے اُلٹا دیں۔
"تمہاری اُنگلیاں اس قابل نہیں کہ اینٹیں بنا سکیں اور کیچڑ سے بھری ٹارلی کھینچ سکیں۔۔۔"
کیا خرابی ہے ان انگلیوں میں؟"
تم خود تو توانا دکھائی دیتے ہو لیکن تمہاری انگلیاں بے حد نازک اور نسوانی ہیں۔'
میں نے بہت سماجت کرکے وہ مزدوری تو حاصل کرلی لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ کیسے ہر شب میں اپنی خون آلود انگلیوں کو ٹنکچر کے ساتھ صاف کرتا تھا اور اگلی صبح اُنہیں چھپانے کے لیے بھٹے پر دستانے پہن کر جاتا تھا۔۔۔ ۳۱؎

مستنصر سیاحت کے دوران بڑی باریکی بینی سے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہیں اور جو چیز بھی نظر آتی ہے اس پر بڑے نپے تلے انداز میں تبصرہ کرتے ہیں مثلاً حسین آباد نامی گاؤں کے حدود میں داخل ہوتے ہی مستنصر کو ایک بورڈ نظر آیا جس پر ایک قسم کا تنبیہی جملہ لکھا تھا" حسین آباد کی حدود میں خلاف شرع افعال خصوصاً موسیقی بجانا منع ہے" گویا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ یہاں کے باشندے کٹر مذہبی عقیدے کے مالک ہیں اور جہاں موسیقی اور اس قبیل کی چیزوں کو نہ صرف خرافات بلکہ ایک سنگین جرم سمجھا جاتا

تھا اس لیے مسافروں کو پیشگی تنبیہہ کی گئی تھی کہ وہ اس گاؤں کی حدود میں ان باتوں کا خیال رکھیں تا کہ اُن کے ساتھ کوئی ناخوشگوار صورت حال درپیش نہ ہو۔

مستنصر حسین تارڑ کی یہ فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے کہ وہ بات بات پر، قدم قدم پر کوئی عجوبہ، کوئی مضحکہ خیز چیز اور کوئی چونکا دینے والا کردار اچانک سفر نامے میں شامل کر دیتے ہیں جو نہ صرف قاری کا مرکز نگاہ بن جاتا ہے بلکہ مستنصر قاری کے حواس خمسہ کو قابو کر کے اُس کے ارد گرد ایک ایسا نادیدہ سحری حصار قائم کر لیتے ہیں کہ قاری کو آگے کا منظر بالکل دکھائی نہیں دیتا، اُنھیں وہی کچھ دکھائی اور سنائی دیتا ہے جو مستنصر سنانا چاہتے اور دکھانا چاہتے ہیں۔ مستنصر کا کمال یہ ہے کہ وہ اس کے لیے کوئی خاص قسم کا منظر تخلیق نہیں کرتے بلکہ ادھر ہی کہیں بیٹھے بیٹھے، چلتے پھرتے، کہیں پیٹ پوجا کرتے ہوئے یا گھومتے گھماتے ہوئے ہماری اُن سے ملاقات کرا دیتے ہیں جیسے ویگن میں سفر کرتے ہوئے اُس نے فلمی دنیا کے مشہور زمانہ اداکار "ولیم ہرٹ" سے ہمیں ملایا ہے جو سیر و تفریح کی غرض سے "کرس" کے پردے میں اپنی شناخت چھپائے شمالی علاقہ جات جانے کا خواہش مند ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے کس سادہ انداز سے 'ولیم ہارٹ' الموسوم بہ 'کرس' سے ہماری ملاقات کرائی، یہ اُس کی زبانی سنئیے۔ کہتے ہیں :

> "یہاں اُس گورے سے بھی ملاقات ہوئی جو ہماری ہی ویگن میں کہیں روپوش تھا جس کا ہاتھ مطیع صاحب کے ہاتھ میں بتایا جاتا تھا
>
> "بادشاہو اس کا نام کرس ہے"۔۔۔۔ نظامی ساحب نے متعارف کروایا" بڑا سمجھ دار اور نیک قسم کا گورا ہے۔۔۔ اور حیرت کی بات ہے کہ پڑھا لکھا ہے۔ ابھی ابھی میں نے ذرا رعب ڈالنے کے لیے شیکسپیئر کے ڈرامے " ٹولتھ نائٹ " کا ذکر کیا تو اس نے آدھا ڈرامہ سنا دیا۔۔۔ شاعر بھی ہے۔
>
> میں نے کرس سے ایک عدد ہاؤ ڈو یو ڈو کیا اور ہاتھ ملایا" چلڈرن آف اے لیسر گاڈ" اور " کس آف دی سپائڈر وومن " کا باکمال اداکار ولیم ہرٹ۔
>
> "کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تم کرس ہو؟"

"میں انگلینڈ سے چلا تھا تو کرس تھا۔ اب بھی اُصولی طور پر مجھے کرس ہی ہونا چاہیئے۔۔۔" اس نے اپنے سنہرے بالوں کو فراخ پیشانی سے لپیٹا اور ہنسنے لگا۔۔۔۔یقیناًوہ اپنی شہرت چھپا رہا تھا اور سب کی نظروں سے دور الگ ہو کر سفر کر رہا تھا۔۔ ۳۲؎

کتوں کی خصلت کا تذکرہ ہو یا گلہری نما مارمیٹ جانور پر تبصرہ ہو، مستنصر کا قلم ایسے چلتا ہے جیسے اُنہوں نے سچ مچ شعبۂ حیوانات میں کوئی ڈگری لی ہو۔زیر نظر اقتباس میں مستنصر نے وائلڈ لائف کے ایک افسر کی زبان سے برفانی ریچھوں کے بارے میں ایسی مفید اور ناقابل یقین معلومات دی ہیں کہ قاری حیوانات کے بارے میں مستنصر کے علم کا قائل ہو جاتا ہے۔رفیق صاحب کی زبانی ریچھ کا احوال سنیئے:

"ہمالین براؤن بیئر اکتوبر کے وسط میں دیوسائی سے اتر کر شیلا کے علاقے میں جو غاریں ہیں،ان میں جا کر سوتا ہے۔۔۔وہ اپریل کے مہینے تک ۔۔جب برف پگھلنے لگتی ہے اور دیوسائی میں پہلی ہریاول پھوٹتی ہے تب تک مسلسل سوتا رہتا ہے"۔۔۔اور چھے مہینے سوتا رہتا ہے۔

اس کی کھال کے نیچے چربی کی جو دبیز تہہ ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ پگھلتی رہتی ہے اور خوابیدہ حالت میں اسے توانائی دیتی ہے اور زندہ رکھتی ہے اور جب وہ چھے ماہ کی نیند کے بعد موسم بہار میں شیلا کی غاروں سے باہر آتا ہے تو قابل فہم طور پر بے حد ناتواں ہوتا ہے۔۔۔۔

پاکستان میں اور خاص طور پر دوست ملک چین میں کچھ حکیم حضرات ہیں جو ریچھ کی چربی کو کشتوں میں استعمال کرتے ہیں۔اور اس غریب کا وہ حصہ جو نسل بڑھانے کے کام آتا ہے،اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرتے ہیں کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق اس کا سفوف پھانکنے سے ستر برس کا بوڑھا بھی ٹن ٹن کرنے لگتا ہے ،اس لیے ریچھ کو مارتے ہیں"۔ ۳۳؎

شعری تراکیب کا استعمال

مستنصر حسین تارڑ اپنی نثر کو سحر آفریں اور دلنشیں بنانے کے لیے مختلف وسیلوں کا سہارا لیتے ہیں کبھی وہ اپنی رنگین نثر سے قاری کا دل مٹھی میں کرتے ہیں تو کبھی وہ اشعار کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو دلچسپ اور جاذب نظر بناتے ہیں۔ وہ ایسی ہنر مندی سے نثر میں اشعار کا استعمال کرتے ہیں جیسے کسی ماہر کاریگر نے کسی ہار میں نگینے پروئے ہوں یوں وہ قاری کو سیاحت کے مزے لوٹنے کے ساتھ ساتھ اشعار کے مزے سے بھی آشنا کر دیتے ہیں نتیجتاً قاری تخلیق کار کی فنکارانہ پختگی کا دل سے قائل ہو کر اُسے داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مستنصر کے اُسلوب کا یہ پہلو اُس کے جمالیاتی ذوق کا مظہر ہے۔ وہ اشعار کی میناکاری سے اپنے اُسلوب کو ایسا جاندار بنا دیتے ہیں کہ قاری کو سر اُٹھانے اور ادھر اُدھر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا اور وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو کر، تحریر کی لذت میں کھو جاتا ہے۔ مستنصر لکھتے ہیں:

"جھیل میں پانی کی سیڑھیاں ہیں جو میرے بوجھ سے کھلتی جاتی ہیں اور میں کوشش میں ہوں کہ اُن کی تہہ کو چھولوں۔۔۔ یہ سیڑھیاں قدموں سے نا آشنا ہیں اور ہر سیڑھی پر میرا نام لکھا ہے اور میں تہہ سے ٹکرا جاتا ہوں۔۔۔۔ میرا بدن چھِل جاتا ہے اور مجھے سانس نہیں آرہا اور اس خوابِ مسلسل کا کوئی انجام نہیں۔

؎ خواب میں جو کچھ دیکھ رہا تھا اُس کا بتانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھِلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے [۳۴]

دنیا کی تقریباً ہر زبان میں قصے کہانیاں بھی لکھی جاتی ہیں اور شعر و شاعری بھی کی جاتی ہے۔ اُن میں زلف و رخسار کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور حسن یار کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے بھی ملایے جاتے ہیں۔ بے شک اُن زبانوں میں موضوعات اور خیالات ایک جیسے ہوں مگر ہر زبان کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے اور ہر زبان کی اپنی ایک مٹھاس ہوتی ہے جو اسے دوسری تمام زبانوں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ مستنصر نے بھی اس انفرادیت اور خاصیت کو محسوس کیا ہے اس لیے اُس نے جہاں اُردو شعراء کے اشعار کو موقع محل کے مطابق گاہے بگاہے جگہ دی ہے وہاں اُنھوں نے شنا زبان میں خیالی محبوبہ کی شان میں کہے ہوئے اشعار کا بھی ذکر کیا ہے جس میں اُس زبان کی مٹھاس اور شیرینی زبانِ حال سے اپنی

موجودگی کا پتہ دے رہی ہے۔ شاید خیالات کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ جس انداز میں اور جس سلیقے سے خیال کو پیش کو جاتا ہے وہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ شنا زبان میں شاعر جس طرح ندی نالوں اور گلیشئر سے مخاطب ہو کر اپنے محبوب کی آمد کے بارے میں گفتگو کرتا ہے یقیناً یہ نہایت منفرد اور دل چھونے لینے والا انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر جیسا صاحب دل ادیب بھی اس جذبے سے متاثر ہوا ہو اور اس نے اس کا اردو ترجمہ قارئین کی نذر کیا ہو۔ ملاحظہ کیجیے:

"ندی تم نے جھوٹ بولا تھا۔۔۔۔

اے گلیشئر کی بیٹی تم نے جھوٹ بولا تھا۔۔۔۔

میں تمھارے کناروں پر۔۔۔۔ برسوں رویا اور تم نے کہا وہ نہیں آئے گی۔۔۔

بلندیوں پر جو مارخور تھے وہ مجھے دیکھتے تھے اور غم زدہ ہوتے تھے ۔۔۔۔۔

اور تم نے کہا۔۔۔ وہ نہیں آئے گی۔۔۔۔ اور وہ آئی۔۔۔۔۔

اور میں اُسے یہاں ۔۔۔ مترن داس میں تمہارے کناروں پر لے آیا۔۔۔

اُس کے بدن میں وصل کی مہک تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہتی تھی۔۔۔۔۔

پامیر کی بلندیاں گواہ ہیں۔

لیکن آبشاروں اور ندیوں کے شور میں اُس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچتی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ گہنوں سے لدی تھی اور ایک شہزادی کی طرح تھی۔۔۔۔

اے گلیشئر کی بیٹی تم نے جھوٹ بولا تھا۔۔۔۔ ۳۵ ۔

سفرنامہ " راکاپوشی نگر" کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے جگہ بہ جگہ موقع محل کی مناسبت سے اشعار کے ٹانکے لگائے ہیں جس کی وجہ سے اس واقعے اور اس کے پس منظر و پیش منظر کی اہمیت و دلکشی کھل کر سامنے آئی ہے اور اُن اشعار کی موزونیت اور برجستگی دیکھ کر ایسا لگتا

ہے جیسے کسی نے واقعتاً موتی پروئے ہیں۔راکاپوشی کی چوٹی پر چڑھنے کے دوران ایک جگہ سیاچن جنگلی گلاب کی ایک جھاڑی دکھائی دی جو پھولوں سے بھری ہوئی تھی اور جس کی ہر شاخ گلابوں کے بوجھ سے جھکی جاتی تھی اس موقع پر مستنصر حسین تارڑ نے گلابوں کے متعلق مجید امجد کی پوری نظم لکھی ہے۔ ملاحظہ کریں:

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول، ارغواں گلاب کے پھول
اُفق اُفق پہ زمانوں کی دھند سے اُبھرے
طیّور ، نغمے، ندی، تتلیاں، گلاب کے پھول
خیالِ یار ، ترے سلسلے نشوں کی رُتیں
جمالِ یار ، تری جھلکیاں ، گلاب کے پھول
سلگتے جاتے ہیں ، چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں گلاب کے پھول
کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ
مری لحد پہ کھلیں جاوداں ، گلاب کے پھول ۳۶؎

اس طرح ایک رات راکاپوشی کے برفوں کے اوپر چودھویں کا چاند نکل کر اپنی سنہری کرنیں چہار سو پھیلا رہا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ اور اُس کے ساتھی خیموں سے باہر نکل آئے اور چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ مستنصر حسین تارڑ اس منظر سے اتنا مسحور ہوا کہ اُس کی لبوں پر قاسمی صاحب کے شعر کا یہ مصرعہ بار بار تھرکنے لگا،

؎ یہ سلاخوں میں چمکتا چاند میرے آنگن میں بھی نکلا ہو گا۔۔۔۔ ۳۷؎

اس کے بعد ابن انشاء کی مشہور زمانہ غزل ”کل چودھویں کی رات تھی“ کا مقبول عام شعر تھوڑے سے تصرف کے ساتھ بار بار گنگناتا رہا،

آج چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا ۳۸؎

راکاپوشی کے برفوں میں چودھویں رات کا منظر مستنصر کو کچھ ایسا بھایا تھا کہ وہ اس کی تعریف میں مختلف حوالے دے دے کر رطب اللسان تھا۔ چینی زبان کا مشہور شاعر لی پو گزرا ہے جو مستنصر حسین تارڑ کا پسندیدہ شاعر بھی ہے۔ وہ چودھویں چاند کے حسن سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ نے موقع کی مناسبت سے لی پو کا واقعہ یہاں نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

> "میرا پسندیدہ قدیم چینی شاعر لی پو ایک شب خمار میں، ایک کشتی میں، کشتی ایک نیلی جھیل میں ڈولتی تھی۔ جب اُسے پانیوں میں چاند کا عکس نظر آیا۔ وہ اُسے حاصل کرنے کے لیے بے اختیار ہوا۔ چاند کے عکس پر چھلانگ لگا دی اور ڈوب گیا۔ ۳۹

چاند کی چاندنی ہر شئے کو منور کر رہی تھی، ہر سمت رنگ و نور کا سماں تھا۔ مستنصر حسین تارڑ اس رنگ و نور کو اپنے قلب و جاں میں اُتار رہا تھا اور ہر جانب چھائی روشنیوں کو نئے نئے معنی پہنا رہا تھا۔ وہ یوں رقم طراز ہیں:

> "چودھویں کا پورا چاند ۔۔۔ ایک سنہری تھال کی صورت ۔۔۔ ایک سنہری چھاج کی صورت ۔۔۔ ایک ایسا چھاج جسے محبوب کو قید کرنے کے لیے ۔۔۔ کہیں وہ چلا نہ جائے۔ اس خدشے کے تحت صحن کی دیواریں اونچی کرنے کے بعد اُس چھاج کو بتاشوں سے بھر کر اُچھال دیا جائے۔ ایسا سنہری چھاج راکاپوشی کی اُس شب میں اُبھرتا، ہر پتھر، گھاس کے ہر تنکے، برفانی ندیوں کے پانیوں کی ہر بوند کو جنم دیتا ہے اُس کی برفوں کی ہر کرچی کو منور کرتا تھا۔" ۴۰

سفر نامہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات کا انتخاب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور کہانی مختلف واقعات کے ربط و بُنت سے آگے بڑھتی ہے۔ اب یہ سفر نامہ نگار کی اہلیت اور مہارت پر منحصر ہے کہ وہ کون سے واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور کون سے چھوڑتا ہے نیز ایک اچھے سفر نامہ نگار کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن واقعات کی بنیاد پر اُنہوں نے سفر نامے کی عمارت کھڑی کی ہے وہ کتنی دیرپا اور ایک عام قاری کی نظر میں کتنی قابل قبول ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو سفر نامے کی بنیادی ضروریات کا علم ہے جبھی وہ ایسے واقعات سفر نامے میں شامل کرتا ہے اور اپنے تجربات میں قاری کو شریک کرتا ہے جس سے سفر نامے میں دلچسپی کا عنصر فزوں تر ہو جاتا ہے۔ مستنصر بات سے بات نکالتا ہے، واقعہ سے واقعہ جوڑتا ہے اور ان سب میں ایسا تعلق پیدا کرتا ہے کہ کہیں پر بھی قاری کو کسی واقعے

کی مصنوعیت اور بے ربطی کا پتہ نہیں چلتا۔ جس طرح کوئی ماہر معمار عمارت بناتے وقت جب اینٹ رکھتا ہے تو اُس کے چار اطراف کا جائزہ لے کر اُس کے تناسب، اُس کی اُٹھان اور اُس کے توازن کو پرکھتا ہے۔ اینٹ کی نوک پلک سنوارتا ہے تب اس کے اوپر دوسری اینٹ رکھتا ہے۔ اس طرح جو عمارت وجود میں آتی ہے وہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر دیتی ہیں۔ اس طرح مستنصر سفر نامے لکھتے وقت نہ صرف واقعات کے چناؤ اور انتخاب کا خیال رکھتے ہیں بلکہ اُن واقعات کی ترتیب بھی اُن کے ذہن میں ہوتی ہے تاکہ کہیں پر بھی بے ربطی یا واقعات میں جھول نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر کے سفر نامے لوگ افسانوں اور ناولوں کی طرح شوق سے پڑھتے ہیں اور آئے روز اُن کی قارئین اور چاہنے والوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

> ''ہشام ایک اشبیلیہ تھا جس کا وادی الکبیر دریائے سندھ تھا اور جس کے کناروں پر کوئی رمیکہ نہ تھی۔
>
> ایک شب اشبیلیہ کا خلیفہ معتمد اور اُس کا شاعر دوست عمار بھیس بدلے چاندنی چوک میں جاری '' پاسیو'' میں شامل ہے معتمد دریائے وادئ الکبیر کی لہروں کے جال کو دیکھ کر فی البدیہہ کہتا ہے '' بادِ نسیم کے جھونکوں سے موجیں ایک ذرّہ بکتر کی طرح اُبھر رہی ہیں''
>
> بن، عمار کہ شاعر ہے ابھی دوسرے مصرعے کی تلاش میں ذہن پر زور دے رہا ہے کہ لب دریا کپڑے دھوتی ہوئی ریمک کی لونڈی متوجہ ہوئے بغیر کہتی ہے '' اگر یہ موجیں منجمد ہو جائیں تو ایک بہادر کے لیے کیا خوب ذرہ بن جائے'' ۔ معتمد اس مصرعے پر پھڑک کر خچر ہانکنے والی لونڈی رمیکیہ کو خرید کر اپنی ملکہ بنالیتا ہے۔ ۴۱؎

مبالغہ آرائی

قصے کہانی میں جب تک مبالغے کا عنصر شامل نہ ہو اُس وقت تک وہ پھیکی دال کی طرح لگتی ہے مگر حد سے زیادہ مبالغہ آرائی بھی قصے کہانی کے وجود کو ریت کا گھروندہ بنا دیتی ہے جو معمولی دھکے سے دھڑام سے گر جاتا ہے۔ لہٰذا مبالغہ کے استعمال میں اعتدال اور میانہ روی بہت ضروری ہے۔ مستنصر حسین تارڑ پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ سفر نامہ لکھتے ہوئے حدِ اعتدال بھول جاتے ہیں اور کسی منظر، کسی

شخص یا کسی واقعہ کے بیان میں اتنی زیادہ مبالغہ آرائی کر جاتے ہیں کہ اس سے نہ صرف نثر پارے کی ادبیت مجروح ہو جاتی ہے بلکہ اُس کی بات جھوٹ کی حدود کو چھو لیتی ہے۔حالانکہ یہ سراسر الزام ہے جس میں کوئی صداقت نہیں۔ مستنصر کے ہاں مبالغہ آرائی ضرور ہے مگر ایسی بھی نہیں کہ اس سے کسی ادب پارے کا ادبی حسن مجروح ہو۔ دراصل لوگوں کو مستنصر کے احساسات کی اُٹھان کا ادراک نہیں۔اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ دو آدمی کسی سانپ کو گھر میں دیکھ لیتے ہیں۔اب دونوں آدمی جب گھر میں سانپ کی موجودگی کا واقعہ بیان کریں گے تو ہر ایک کے بیان میں واضح فرق نظر آئے گا۔اب اگر ان میں سے ایک شخص زیادہ حساس طبیعت کا مالک ہو اور اُس نے زندگی میں پہلی بار کسی سانپ کو اتنے قریب سے دیکھا ہو تو اُس کی گفتگو اپنے دوسرے ساتھی سے یکسر مختلف ہو گی۔ یہی حال مستنصر کا ہے کہ وہ حد سے زیادہ حساس اور جذباتی ہیں اور دوسری سب سے بڑی یہ کہ وہ کائنات کی رنگینیوں اور مظاہر قدرت کو ایک عاشق کی نظر سے دیکھتا ہے اب ایک عاشق کے بیان میں اور ایک شوقین کے بیان میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق لوگوں کو مستنصر کی تحریروں میں نظر آتا ہے جسے وہ مبالغے کا نام دیتے ہیں حالانکہ یہ مبالغہ نہیں ایک عاشق کا اپنی معشوق کے حسن کو بیان کرنے کا ایک خاص ادا اور جداگانہ انداز ہے۔زیر نظر اقتباس اگرچہ مستنصر اور اُس کی بیوی کے درمیان ایک مکالمہ ہے مگر حقیقت میں مستنصر اُن لوگوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں تو اس کی تخلیقات پر مبالغے کی قدغن لگاتے ہیں، جو اُنہیں اداکار ہونے کا طعنہ دیتے ہیں، جو اُن کی الفاظ کی سچائی، جذبات کی گہرائی اور اُن کی باطنی کیفیات کا مذاق اُڑاتے ہیں، مستنصر نے ایسے لوگوں کو منہ توڑ جواب دیا ہے اور کسی کی بات پر کان نہ دھر کر اپنا مشن جاری رکھنے کا عزم صمیم کیے اپنی منزل کی جانب رواں دواں نظر آتا ہے۔لکھتے ہیں:

> "آپ ہر شے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عادی ہیں ۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فیئری میڈو اتنا خوبصورت ہے جتنا آپ بیان کرتے ہیں "۔۔۔ بیگم اگرچہ ناگواری کے انداز میں کہتیں لیکن مجھے شک گزرتا کہ اس میں کہیں حسنِ طلب پوشیدہ ہے۔
>
> ایک ادیب ہونا، ایک اداکار ہونا زندگی کے حساس لمحوں میں اکثر انتہائی مہلک ثابت ہوتا ہے۔۔۔ آپ کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا کیونکہ لفظ اور اظہار آپ کا پیشہ ہے۔ مجھ پر بھی حسن کو، محبت کو، دُکھ کو، سکھ کو بڑھا

چڑھا کر بیان کرنے کا الزام عائد ہوتا ہے۔اپنے احساسات کو جذباتی سطح پر سامنے لانے پر اداکار ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔۔۔تو ایک ادیب اور ایک اداکار زندگی کے کسی لمحے میں یہ کیسے ثابت کرے کہ وہ مخلص ہے ۔اُس کے لفظ سچے ہیں۔اُس کی آنکھوں میں جو نمی ہے اُس میں اُس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا ہر گز عمل دخل نہیں۔۔۔ میں بے شک ذہنی آزردگی اور شکستگی کے اُس عالم میں ہوں جب میں سو فیصد سنجیدگی سے زہر کی ایک پڑیا پھانک کر اپنے آپ کو قبر کی زینت بنانے پر تُلا ہوں تو بھی ایک مسکراہٹ کے ساتھ یہی الزام دہرایا جائے گا کہ تم ایک اچھے اداکار ہو ۔۔۔ بھول جاؤ کہ ہم تمہاری اس دھمکی کو سنجیدگی سے لیتے ہیں ۔۔۔ایسی صورت حال میں ایک شخص کیا کر سکتا ہے؟یہی کر سکتا ہے ناں کہ فی الفور خودکشی کا ارادہ ترک کر دے اور پھانکے گئے زہر کا تریاق تلاش کرے۔۔۔ کہ کیا فائدہ ایسے فوت ہو جانے سے کہ کوئی آپ کی موت کو سنجیدگی سے نہ لے۔ ۴۲؎

ہر ادیب کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی تعریف ہو، لوگ اُس کے کام کو سراہیں ، اُس کی تخلیقات پڑھ کر اُسے بے تحاشا داد دیں اور اُسے شاباشی کا سرٹیفیکیٹ دیں۔ کبھی کبھار یہ خواہش اتنی بڑھ جاتی ہے کہ افسانہ نگار، شاعر، ناول نگار، سفر نامہ نامہ نگار غرض کسی بھی صنفِ ادب کا تخلیق کار اپنی تخلیقات میں اپنی اور اپنی تخلیق کی تعریف کرنے لگ جاتا ہے ظاہر ہے کہ یہ کوئی بری بات نہیں مگر حد سے زیادہ خود ستائشی انسان کو دوسروں کی نظروں میں چھوٹا کر دیتی ہے کیونکہ کوئی انسان جتنا بھی بڑا ہو، جتنا بھی مقبول خاص و عام ہو اور جتنا بھی بڑا لکھاری ہو ،اگر وہ اپنی زبان سے اپنی بڑائی اور عظمت کے گیت گائے گا تو لوگوں کو تھوڑا بہت تردّد ضرور ہو گا۔ مستنصر حسین تارڑ فی الواقع پاکستان کا نامی گرامی ادیب، اعلیٰ پایے کا ڈرامہ نگار، ایک معتبر شخصیت اور اُردو سفر نامے کے ایک عظیم محسن ہیں اور لوگ اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں مگر غالباً اُسے بھی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا نفسیاتی عارضہ لاحق ہے کہ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، بار بار اور بے شمار بار اُنھوں نے اپنی سفری تخلیقات میں اپنی اور اپنے سفر ناموں کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے جو کبھی کبھی مبالغہ آمیز ہی نہیں بلکہ ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ چلو اسے

بھی ایک حد تک مان لیتے ہیں کہ اُس کے سفر ناموں کا سیٹ لوگ جہیز میں دیتے ہیں مگر زیرِ نظر اقتباس میں اُنہوں نے جس لڑکی کا قصہ بیان کیا ہے کہ وہ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے پڑھ پڑھ کر 'کے ٹو، نانگا پربت کی سیر کے لیے گھر سے بھاگ گئی، بالکل غیر حقیقی، بعید از عقل، حد سے زیادہ مبالغہ آمیز اور افسانوی لگتا ہے اگرچہ مستنصر نے بعد کے جملوں میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ کسی جذبۂ تفاخر سے یہ کہانی نہیں سنا رہا مگر اُس کی یہ توجیہہ اُس کی مبالغہ آرائی کا بدل نہیں۔ مستنصر کی زبان سے وہ کہانی ملاحظہ کیجیئے:

> "راولپنڈی سے طویل مسافت کے بعد۔۔۔ سکر دو کا شہر تھا تو وہاں حسب معمول بس کے مسافروں کی چیکنگ ہوئی۔ان کے شناختی کارڈ چیک کئے گئے تو مسافروں میں ایک تنہا نوجوان لڑکی بھی تھی جو اپنی شناخت کا ثبوت نہ دے سکی اور اُس نے کہا کہ وہ سکر دو میں اپنے ماموں سے ملاقات کے لیے آئی ہے۔اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ ماموں سکر دو میں کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔بس کے ڈرائیور نے سوچا کہ رات کے اس پہر اس نوجوان لڑکی کو تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا، اس لیے وہ اسے مشابرم سروس کے مالکان کے گھر لے گیا۔ اُنہوں نے اُسے ایک بیٹی کی طرح خوش آمدید کہا، اگلے چند روز اسے سکر دو کی سیر کرواتے رہے۔ جھیل صد پارہ اور کچورا پر لے گئے۔ دیوسائی جانے والا راستہ دکھایا اور حیرت انگیز طور پر وہ ان مقامات سے پہلے سے واقف تھی بلکہ فرمائش کرتی تھی کہ مجھے اب وادیٔ شگر دکھادیں۔اوپر کھر فوچے قلعے تک لے چلیں۔صد پارہ جھیل کے کنارے وہ کون سا چشمہ ہے جس کے پانیوں میں سونے کی آمیزش ہے۔اس کے میزبانوں نے ایک روز اسے کہا کہ بی بی آپ بہت دنوں سے ہمارے ہاں مقیم ہیں۔آپ کے ماموں کا سراغ نہیں ملتا۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ آپ کون ہیں۔ہو سکتا ہے آپ کوئی مجرم یا مخدوش کردار کی حامل کوئی خاتون ہوں، اس لیے بابا یا تو آپ اپنا پتہ بتلایئے۔۔اپنی شناخت کروائیں ورنہ ہم پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔۔۔اس خفیہ دھمکی کے زیر اثر اس لڑکی نے کہا کہ میں پشاور کی رہنے والی ہوں اور ہمارا فون نمبر یہ۔۔۔ہے۔اس نمبر پر فون کیا گیا تو ادھر سے جواب آیا کہ ہم نے تو اخباروں میں اشتہار دیے، شریکوں کے خلاف رپورٹیں درج کروائیں کہ یہ بچی بہت دنوں سے غائب تھی۔ ہم سکر دو آرہے ہیں۔اگلے روز اس بچی کے دو ماموں اور والدہ

صاحبہ سکردو پہنچ گئے اور اسے دیکھ کر اس کی والدہ نے کہا ۔۔۔اور میں سکردو کا ایک حوالہ دیتا ہوں ۔۔۔ کہ ۔۔ میں کہتی تھی ناں کہ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے نہ پڑھا کرو ۔۔۔۔۔ ہماری عزت خاک میں ملادی ہے ناں ۔۔۔۔ لعنت ہو اس تارڑ پر ۔۔۔۔ اس بی بی نے اپنی والدہ کو الٹی میٹم دیا تھا کہ یا تو مجھے وہاں لے چلو جہاں "کے ٹو کہانی" ہے ۔ نانگا پربت ہے ۔۔ یا میں گھر سے بھاگ جاؤں گی ۔" ۴۳؎

کسی نقاد نے مستنصر حسین تارڑ کے متعلق کچھ نامناسب باتیں کی تھیں جس کے رد عمل میں مستنصر نے اُن کا نام لیے بغیر اُن کی خوب خبر لی ہے اور اُنھیں آئینہ دکھایا ہے کہ وہ اس کی تائید و تعریف کے بغیر بھی ہر دلعزیز اور عوام میں مقبول ہیں ۔ اس بارے میں مستنصر حسین تارڑ کا رد عمل ملاحظہ کریں، لکھتے ہیں:

"پچھلے دنوں ایک ادبی جریدہ میں ایک زائد المیعاد ہو چکے زہریلے نقاد نے ۔۔۔ اور وہ بقول وارث شاہ، ایک موئے ہوئے سانپ کی مانند، بِس گھولتا تھا یہ کہا کہ ہم نقاد ہی کسی ادیب کی ادبی قامت کا تعین کر کے اُسے ادب کے راج سنگھاسن پر بٹھا سکتے ہیں اور یہ جو مستنصر حسین تارڑ ہے اس نے آج تک مجھے اپنی کوئی کتاب ریویو کے لیے نہیں بھیجی اسی لیے وہ ایک پسندیدہ ادیب تو ہے لیکن ایک بڑا ادیب نہیں ہے ۔ ۴۴؎

علمِ بیان اور دیگر صنعتوں کا استعمال

مستنصر حسین تارڑ صرف سفر نامہ نہیں لکھتا، اُس کے ہاں تشبیہات کا ایک وافر ذخیرہ ہے ۔ استعارات و کنایات کا ایک وسیع سمندر ہے ۔ اُس کے پاس ایک فلسفیانہ فکر ہے ۔ اُس میں اشیاء کا موازنے کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے ۔ اُس کی ذہنی سطح اتنی بلند اور اتنی ہمہ جہت ہے کہ وہ کسی چیز کو بیسیوں زاویے سے پرکھتے ہیں ۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو جذبات کی آنچ دے کر قاری کے سامنے ایسے تقابلی انداز میں پیش کرتا ہے کہ قاری نہ صرف اُس کی گہرائی و گیرائی کو سمجھ جاتا ہے بلکہ وہ متنوع موضوعات سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے ۔

مستنصر نے 'پاک سرائے' کا آغاز 'محبت' جیسے لافانی لفظ سے کیا جس کی گہرائی و گیرائی ناپنے کے لیے بے شمار دانشور اور اہلِ خرد غوطہ زن رہے مگر کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا ۔ مستنصر نے مختلف

تشبیہات و استعارات اور تقابلی موازنے سے محبت کی گہرائی ماپنے کی سعی کی ہے اور قارئین کے سامنے اس کی مختلف جہتیں سامنے رکھ کر اُن کے قلبی و باطنی مسرت کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ توف اور مستنصر حسین تارڑ کے درمیان محبت اور عشق کے بارے میں مکالمہ ملاحظہ کریں:

"رسول: مجھے یہ بتاؤ محبت کیا ہے؟"

"محبت مائی فرینڈ۔۔۔ ایک داغستانی عقاب ہے جو صرف ایک بار کسی ایسی چٹان پر بیٹھتا ہے جہاں وہ صرف ایک پھول دیکھتا ہے جو زرد ہے اور ایک ایسی جھیل کو دیکھتا ہے جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔۔۔۔ ایک نادیدہ جھیل اور ایک محبت میں مبتلا عورت میں فرق نہیں ہوتا۔۔۔۔

"کیا ہر شخص کے نصیب میں محبت ہوتی ہے"؟

"نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ کوئی ایک شخص ہوتا ہے جس کے نصیب میں ایک عشقِ خاص آتا ہے"

"عشقِ خاص؟"

"ہاں۔۔۔ یہ ایک۔۔۔۔۔۔ داغستانی غنجر ہے جو نصیب والوں کے دل میں اُترتا ہے۔ یہ ایک مشکی گھوڑا ہے جو داغستان کی چاندنی راتوں میں ایک پہاڑی آبشار کے پہلو میں تمہارا منتظر ہے۔۔۔۔ یہ کوباچی کی ایک منقّش صراحی ہے جسے ایک کاریگر سونے چاندی سے نہیں بلکہ اپنے سونے ایسے ہاتھوں سے بناتا ہے اور پھر اُس کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔۔" ۴۵؎

اچھے ادیبوں کی طرح مستنصر حسین تارڑ بھی اس فن سے آگاہ ہیں کہ تشبیہہ اور استعارے کا استعمال نہ صرف تحریر کا ادبی حسن بڑھاتا ہے بلکہ اس سے اُس چیز جس سے تشبیہہ دی جاتی ہے، کی وضاحت اچھی طرح ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جگہ بجگہ تشبیہہ و استعارے کا سہارا لے کر نہ صرف اپنی تحریر کی لفظی و معنوی خوبی بڑھاتا ہے بلکہ وہ دو تین الفاظ میں ایسی تاریخی معلومات دے جاتا ہے کہ انسان کی زبان سے داد و تحسین کے الفاظ نکلتے ہیں۔ سفر نامہ شمشال بے مثال میں ایک جگہ پر مستنصر حسین تارڑ نے کوہ قارون کا ذکر کیا ہے جو بذاتِ خود ایک تاریخی حوالہ رکھتا ہے اس پر مستزاد کہ کوہ

قارون کو تبت کے مقدس کوہ کیلاش سے تشبیہہ دے کر نہ صرف خود اس کی معنویت میں اضافہ کیا ہے بلکہ قاری کوہ کیلاش کا نام سن کر اس کی تاریخی اہمیت جاننے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے ' سنولیک ' کا آغاز بڑے رومانوی انداز میں کیا ہے اور مستنصر کے ہاں رومان کا آغاز عورت کے حسن و جمال سے شروع ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے 'اسکولے' کی عورتوں کے بدن کو یاک کے دودھ سے تشبیہہ دے کر اُن کے حسن کو وہ خراج تحسین پیش کیا ہے جس کی مثال اُردو ادب میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے اور اسی پر بس نہیں، مستنصر کہتا ہے کہ ان عورتوں کے حسن سے صرف اپنی آنکھیں ہی ٹھنڈی کی جاسکتی ہیں ان کو چھوا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ عورتیں اتنی نازک اندام ہیں کہ انسانی ہاتھوں کی لمس سے اُن کے دودھیا بدن پر نیل پڑتے ہیں۔ عورت کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مستنصر نے عورت کے زیر استعمال زیورات، مارخور کے چمڑے اور بھیڑ کے اون سے بنی بلتی ٹوپیوں اور ان پر بیل بوٹے دار سلائی کڑھائی کا ذکر کر کے اگر ایک طرف بلتی عورتوں کے لباس و پوشاک کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف بڑے غیر محسوس طریقے سے مقامی ثقافت کو بھی اُجاگر کیا ہے نیز مستنصر نے یہاں کے لوگوں کی امن پسندی، سادہ لوحی اور اخلاص کا ذکر کر کے گویا قاری کو اُن کے اعلیٰ انسانی اقدار اور شائستہ اوصاف سے روشناس کیا ہے جن کا وجود آج کل مہذب دنیا میں بھی عنقا ہے۔ مستنصر یوں رقم طراز ہے:

> "میں نے سنا ہے کہ اسکولے کی عورتوں کے بدن یاک کے دودھ کے ہیں اور چھونے سے اُن کے بدن پر پہلے نیل پڑتے ہیں اور پھر وہ پگھلتی ہیں اس طرح کہ اُن کے بدن اسکولے کے کھیتوں کو سیر اب کرنے والی برفانی نالیوں میں بہہ جاتے ہیں اور اُن کے زیور اور خوش نما دھاگوں کی بلتی ٹوپیاں اور پاؤں کے پہناوے جو مارخور کے چمڑے اور بھیڑوں کی اون سے بنے ہوتے ہیں اور اس اُون پر اُن پھولوں کے بھڑکیلے رنگوں کے دھاگوں سے کڑھائی کی جاتی ہے اور ایسے پھول بوٹے ہوتے ہیں جو اسکولے کے کھیتوں میں ایسے سر اُٹھاتے ہیں کہ برف کے سفید پس منظر میں وہ سرخ، گلابی اور پیلے دھبّوں کی صورت میں نمایاں ہو کر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔۔ تو جب اُن

کے بدن ہاتھ لگانے سے پگھل کر ان نالیوں میں بہتے ہیں تو صرف یہی
۔۔۔زیور، ٹوپیاں اور پہناوے باقی رہ جاتے ہیں اور اُن کا بدن برفانی
نالیوں میں بہہ جاتا ہے اور اُن پانیوں کا رنگ بھی دودھیا ہو جاتا
ہے۔۔۔۔۔میں نے سنا ہے کہ ہماری ریاست نگر سے دس روز کی
برف ہی برف مسافت پر۔۔۔۔ایک گاؤں ہے۔۔۔جس کے باسی
اتنے بھولے اور اَمن والے ہیں کہ وہ اپنا شہد، پنیر مارخور کی کھالیں،
مکھن اور جَو کے توڑے جنگ کیے بغیر ہم نگر والوں کے حوالے
کر دیتے ہیں۔ ۴۶؎

مستنصر حسین تارڑ مہم جویانہ طبعیت کے مالک ہیں کبھی وہ کے ٹو کی بلندیوں کو زیر کرتا ہے تو کبھی برفیلی بلندیوں کو سر کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ کبھی نانگا پربت کے کوہساروں اور سبزہ زاروں کی تڑپ میں نکلتا ہے تو کبھی رتی گلی کی جھیل سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔ اس بار مستنصر کے جی میں کیا آیا کہ اُنہوں نے دیوؤں کی سرزمین یعنی دیوسائی جیسے مشکل اور دشوار گزار سفر کا ارادہ کیا۔ دیوسائی مہم سے مستنصر اتنا متاثر نظر آتا ہے کہ اُنہوں نے دیوسائی کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے " میں دیوسائی کا ایک ریچھ ہوں"" میں دیوسائی کا ایک پھول ہوں" میں دیوسائی کا بادل ہوں" میں دنیا کا بلند ترین میدان ہوں" جیسی اصطلاحیں وضع کر کے دیوسائی کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اس سے پہلے مستنصر نے بے شمار مہمات میں حصہ لیا ہے مگر ایسی گرم جوشی اور جذبے کی ایسی اُٹھان مستنصر کے ہاں پہلے کبھی نظر نہیں آئی ہے۔ مستنصر دیوسائی کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

"میں جو دیوسائی کا دیومالائی ریچھ ہوں" دیوسائی" کا دیو کہلاتا ہوں۔ ہمالیائی براؤن بیئر کہلاتا ہوں۔ مجھے ہمالیہ کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ میں دنیا کا سب سے بڑا گوشت خور جانور ہوں۔ دیوسائی کے تیز ترین دھارے بڑے پانی کے پار رہتا ہوں اور کسی کو اپنی سلطنت کے اندر آنے کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں دیوسائی کا وہ پھول ہوں جس کی اقسام، رنگ اور شکلیں ابھی دریافت نہیں ہوئیں میں سربلند وجود کے تکبر میں سر نہیں اُٹھاتا کہ دنیا مجھے دیکھے۔۔۔صرف وہ مجھے دیکھ سکتے ہیں جو جھک کر نیچے دیکھتے ہیں۔ میں وہ پھول ہوں جو کسی کتاب میں نہیں، کسی

شعر، کسی داستان میں نہیں، کسی تصویر میں نہیں۔۔۔میں دنیا کا بلند ترین میدان
ہوں۔۔کم از کم تیرہ ہزار اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر۔۔۔
میرے چاروں طرف چوٹیاں ہیں۔۔میں چھتیس کلومیٹر طویل ہوں اور چوڑائی میں
چوبیس کلومیٹر سے تجاوز کرتا ہوں۔میرے نشیب و فراز میں گھاس کے میدان ہیں۔
پھول ہیں اور رنگ رنگ کے بوٹے اور جھلیں ہیں۔" ۴۷؎

مستنصر حسین تارڑ کی نظر میں 'شمال' اُس کی کمزوری بن چکا ہے، اُس کا محبوب بن چکا ہے ایک ایسا محبوب جس کا سال دو سال میں دیدار نہ کیا جائے تو زندگی بے کیف و بے چین گزرتی ہے۔لوگ محلات کی سیر کرتے ہیں، محفلوں سے لطف واندوز ہوتے ہیں، جدید عمارات دیکھنے کے شوقین ہوتے ہیں جبکہ مستنصر حسین تارڑ کا شوق ان سب کے بالکل برعکس ہے۔اُنہیں پہاڑوں کی بلندیاں پسند ہیں، اُن کا جی تنہائیوں میں لگتا ہے اور اُس کی روح برفیلی موسموں میں پر سکون رہتی ہے۔درۂ شمشال کا سفر موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا مگر مستنصر نے موت کے اس کنویں کو ایک نظر دیکھنے کا قصد کیا تھا یہی وجہ تھی کہ ہزار مشکلات اور جسم کی ناتوانی کے باوجود وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وادیٔ شمشال کی جانب محوسفر تھا۔لاہور سے اس سفر کا آغاز ہوا تھا پھر گلگت، گلگت سے کریم آباد اور گل مِت اور آخر میں پسّو اور پسّو سے یک دم نوے درجے کے زاویے پر دائیں جانب ایک طویل سفر جس کا اختتام درۂ شمشال پر ہوتا ہے جو بظاہر تو دنیا سے الگ تھلگ اور ایک چٹیل پہاڑ نظر آتا ہے مگر وہاں پہنچ کر احساس ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے رنگ شمشال میں جمع ہو گئے ہیں جنہوں نے وادیٔ شمشال کو گلاب رنگ بنا دیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں درۂ شمشال ایک ہیبت ناک قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔جب ہنزہ کے میر مجرموں اور اپنے مخالفین کو کوئی خوفناک سزا دینا چاہتے تھے تو اسے شمشال بھیج دیا کرتے تھے گویا یہ 'کالا پانی' تھا جس کے نام سے مجرم کانپتے تھے۔

مستنصر حسین تارڑ جیسے ہی درۂ شمشال میں داخل ہوا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ اُردن کے صحراؤں میں پوشیدہ پیٹرا کے رومی شہر کے قدیم گلابی کھنڈر کا نظارہ کر رہا ہو کیونکہ وہاں کی ہر چٹان اُجڑی ہوئی رومی

محل تھی یا کسی دیوی کا ویران معبد تھی، جہاں خزانہ جمع کرنے کا ایک کمرہ تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح اُردن کے صحراؤں میں اس تاریخی شہر کے کھنڈرات صدیوں تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے اور کسی گڈریے کے اچانک وہاں جانے اور وہاں چٹانوں کی آغوش میں صدیوں سے ویران پیٹرا کا شہر موجود تھا یہاں بھی ویسی صورت حال تھی، درّہ شمشال میں ابھی تک ایک دوسرا پیٹرا مخفی تھا جس سے بیرونی دنیا لاعلم تھی اور ہماری مثال بھی اُس گڈریے کی طرح تھی جو کوہ نوردی کی گم شدہ بھیڑ کی تلاش میں اتفاقاً ادھر آنکلے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ درّہ شمشال کے حسن اور ہیبت ناکی اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے:

> ''اُس کی پر ہیبت اور بڑی شان والی بلند چٹانیں گلابی ہو رہی تھیں۔۔۔ جیسے خالص پاسے کے سونے کے منجمد اہرام بلند ہو رہے ہوں۔ سونے کے یہ اہرام، یہ گلابی عبادت گاہیں حجم اور مسافت میں اتنے عظیم تھے کہ ہمیں ہماری جیپ کو حقیر اور بے وقعت کرتے تھے۔۔۔ اور یہ اُن کی فراخ دلی تھی کہ وہ ہمیں اپنی پوشیدہ سلطنت میں سے گزر جانے دے رہے تھے۔ درۂ شمشال کا گلاب۔ پتھریلا اور سنگدل۔۔۔ شمشال روڈ پر رواں جیپ کے اوپر کھلتا جا رہا تھا۔'' ۴۸؎

مستنصر حسین تارڑ کو درّہ شمشال کی چٹانوں، بلند و بالا چوٹیوں اور گلاب رنگ گردوپیش اور اس پر مستزاد سورج کے کرنوں کی صنم تراشی نے اتنا مسحور کیا تھا کہ کبھی ڈرّے کی چٹانی حصار کو سیمسن کے مندروں سے تشبیہہ دیتا تھا تو کبھی ابو سنبل کے معبد کہہ رہا تھا، کبھی اُن کوہان نما چوٹیوں پر ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کے گنبد کا گمان ہو رہا تھا تو کبھی اُسے کسی مدرسے کے سر بریدہ مینار کہہ رہا تھا۔

'' درّے کے چٹانی حصار سیمسن کے مندر کے ستونوں میں بدلتے تھے۔

کبھی ابو سنبل کے معبد دکھائی دیتے تھے۔ یہ ہرات کی صبح میں تیمور کی ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کے گنبد تھے۔ مدرسے کے سر بریدہ مینار تھے جن پر روشنی ہو رہی تھی۔ یونانی دیومالا

کے سمندروں میں، شاعر ہومر کی بیان کی گئی صبحوں میں ۔۔۔ ان سب جگہوں پر جتنے بھی آفتاب اُبھرے تھے وہ سارے کے سارے اس لمحے درّہ شمشال کی چٹانوں پر اتر رہے تھے۔ منتظر کب سے ہیں ماہتاب۔۔۔ نہیں، آفتاب اُبھرے۔۔۔ اگرچہ وہ اُبھر چکا تھا لیکن نظروں سے ابھی اوجھل تھا۔۔۔۔۔ وہ درے کی تنگنائی میں اُتر نہ سکتا تھا۔۔۔ صرف اس کی کرنیں کھوج لگاتی اندر تک آتی تھیں اور اُن چٹانوں سے ان دیکھے صنم تراشتی تھی۔

پیٹرا تو ایک شہر تھا۔۔۔ یہاں کئی شہر آباد تھے۔" ۴۹؎

حوالہ جات

نمبر	کتاب	مصنف	صفحہ
ا۔	سفر شمال کے	مستنصر حسین تارڑ	ص :۲۱
۲۔	ایضاً		ص :۲۲
۳۔	دیوسائی	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۲۷۔۱۲۸
۴۔	شمشال بے مثال	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۳
۵۔	ایضاً		ص :۱۴
۶۔	ایضاً		ص :۱۷۴۔۱۷۵
۷۔	راکاپوشی	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۳۸
۸۔	سنولیک	مستنصر حسین تارڑ	ص :۶۵
۹۔	ہنزہ داستان	مستنصر حسین تارڑ	ص :۴
۱۰۔	یاک سرائے	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۷
۱۱۔	شمشال بے مثال	مستنصر حسین تارڑ	ص :۶۷
۱۲۔	چترال داستان	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۰۰۔۱۰۱۔۱۰۲
۱۳۔	برفیلی بلندیاں	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۳
۱۴۔	سفر شمال کے	مستنصر حسین تارڑ	ص :۲۹
۱۵۔	ایضاً		ص :۳۲
۱۶۔	کے ٹو کہانی	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۸
۱۷۔	ایضاً		ص :۲۰
۱۸۔	سفر شمال کے	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۷
۱۹۔	چترال داستان	مستنصر حسین تارڑ	ص :۲۳
۲۰۔	کتے (مضمون)	سید احمد شاہ پطرس بخاری	ص :۴۴
۲۱۔	راکاپوشی	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۶۵
۲۲۔	ایضاً		ص :۱۸۰

۲۳۔ سفر شمال کے مستنصر حسین تارڑ ص :۱۵

۲۴۔ ایضاً ص :۱۶

۲۵۔ چترال داستان مستنصر حسین تارڑ ص :۵۰۔۵۱

۲۶۔ ایضاً ص :۲۱۴۔215

۲۷۔ نانگا پربت مستنصر حسین تارڑ ص :۱۲

۲۸۔ سنولیک مستنصر حسین تارڑ ص :۱۰۷

۲۹۔ یاک سرائے مستنصر حسین تارڑ ص :۱۰۷

۳۰۔ ایضاً ص :۷۲

۳۱۔ سنولیک مستنصر حسین تارڑ ص :۴۷

۳۲۔ نانگا پربت مستنصر حسین تارڑ ص :۴۳

۳۳۔ دیوسائی مستنصر حسین تارڑ ص :۲۰۶۔۲۰۷

۳۴۔ یاک سرائے مستنصر حسین تارڑ ص :۳۶

۳۵۔ ایضاً ص :۱۲۹

۳۶۔ راکاپوشی مستنصر حسین تارڑ ص :۹۹

۳۷۔ ایضاً ص :۱۳۹

۳۸۔ ایضاً ص :۱۴۵

۳۹۔ ایضاً ص :۱۴۰

۴۰۔ ایضاً ص :۱۳۸

۴۱۔ سنولیک مستنصر حسین تارڑ ص:۳۸

۴۲۔ یاک سرائے مستنصر حسین تارڑ ص :۴۸

۴۳۔ دیوسائی مستنصر حسین تارڑ ص :۲۶۔۲۷

۴۴۔ راکاپوشی مستنصر حسین تارڑ ص :۶۶

۴۵۔ یاک سرائے مستنصر حسین تارڑ ص :۱۰

۴۶۔ سنولیک مستنصر حسین تارڑ ص :۱۱

۴۷۔ دیوسائی	مستنصر حسین تارڑ	ص :۷۔۸۔۱۰
۴۸۔ شمشال بے مثال	مستنصر حسین تارڑ	ص :۱۳
۴۹۔ ایضاً		ص :۱۴

باب پنجم

مجموعی جائزہ/حاصلِ تحقیق

ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی ادب کا سُوتا بھی پھوٹا یہی وجہ ہے کہ ادب کا دامن زندگی کے گوناگوں رنگوں سے بھرا پڑا ہے اور انسان ادب کی تخلیق میں ایک روحانی سرور اور انبساط محسوس کرتا ہے۔ انسان فطری طور پر اپنے جذبات و احساسات کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک تلاطم خیز جذبہ رکھتا ہے اور ادب انسان کو یہ فریضہ انجام دینے کا گُر اور سلیقہ سکھاتا ہے گویا ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان کا مکمل سراپا نظر آتا ہے۔ اُس کا ماضی، حال، مستقبل، اُس کا ذہنی، جذباتی، نفسیاتی پس منظر و پیش منظر، اُس کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی دائرے، اُس کے وصل و فراق کے فسانے اور اُس کے آفاقی تخیّل کی اُڑان، سب کچھ بڑی وسعت و وضاحت کے ساتھ ادب میں دکھائی دیتا ہے۔ انسان نے ادب کے وسیلے سے کائنات کی بے کناریاں اور مشرق و مغرب کی وسعتیں مقیّد کرلی ہیں جس کی وجہ سے اگر ادب کا دامن ایک طرف عالمگیر خزانے سے مالا مال ہو گیا ہے تو دوسری طرف انسان کی تخیئلی، اختراعی، تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں میں بھی وسعت و اضافہ ہو گیا ہے اور اُس کی یہ صلاحیتیں، شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور سفرنامہ جیسے متنوع رنگوں میں ظہور پذیر ہو کر سب سے اپنی داد کی طالب نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب کے سب رنگ انسانی زندگی کے بہت قریب تر ہیں اور انسان نے ان رنگوں میں سے جس رنگ کو بھی چُنا ہے، اُنہوں نے اپنی عظیم فنکارانہ اور مصورانہ صلاحیتوں کی بدولت اس رنگ سے کائنات کی بڑی حسین اور جامع تصویر کشی کی ہے۔

گلستانِ ادب کے ان حسین ترین رنگوں میں سے ایک رنگ سفرنامے کا بھی ہے جو انسانی زندگی کو بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک جگہ پر کہیں نہیں ٹکتا، اُس کی متلون مزاجی اسے نِت نئے جہانوں کی دریافت پر اُکساتی ہے اور اُسے نئی منزلوں، نئی راہوں اور زندگی کے نئے رنگوں سے روشناس کراتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان ہر وقت منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا رواں دواں اور متحرک نظر آتا ہے۔

سفرنامہ ایک جاندار اور متحرک ادبی صنف ہے یہ محض الفاظ، مشاہدات اور تجربات کی بازیگری نہیں بلکہ اس میں ایک کائنات مقید ہوتا ہے۔ اس میں تاریخ دوبارہ زندہ و تابندہ ہو کر انسان کو اپنے دور کی سیر کراتا ہے۔ اس میں تہذیبی اور ثقافتی اقدار انسان کو شناخت عطا کرتے ہیں۔ یہ مقامیت اور عالمگیریت کے درمیان ایک پُل کا کام کرتا ہے اور انسان کے سامنے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب

کے فاصلوں کو ماپ کر اس کے بند دَر کھول دیتا ہے۔ مظہر فریدی نے سفر نامے کی بڑی جامعیت کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”سفر نامہ نہ صرف متعلقہ علاقوں کے پیچ و خم بیان کرتا ہے بلکہ گیسوئے وقت کے گرہوں اور کنڈیوں کو سہلانے کی سعی لاحاصل بھی، رومان سے لے کر پھکڑپن تک، تہذیب و تمدن اور اقدار و روایات سے لے کر ثقافت کی ثقالت تک، خطوں کی تاریخ سے لے کر لوگوں کے جغرافیہ تک، رہن سہن سے رسوم و رواج تک، سیاسی و سماجی جبر سے فکری و اخلاقی استحصال تک، فطرت کی گود میں کھلنے والے مدھر پھولوں کی باس سے ذہنِ انسانی کی گنجلک نفسیاتی پیچیدگیوں تک، مایا کی روانی سے بے بسی کی ارزانی تک اور کئی ایک نادیدہ و شنیدہ واقعات کے تسلسل تک کو اپنے دامنِ دل اور رُخِ آئینہ پر سفر کی دھول کی طرح سجائے ساری دنیا کو سفر نامہ نگار رازداں کر لیتا ہے۔ ۱؎

سفر نامہ اُردو ادب کی وہ واحد صنف ہے جس میں مختلف اصناف کی متنوع کیفیات اور فنی لوازمات موجود ہیں۔ یہ کسی عہد کی تاریخ بھی دہراتی ہے اور کسی ملک کا جغرافیائی نقشہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس میں داستانوں کا رنگ بھی موجود ہے اور ناولوں کی ہمہ رنگی، طوالت، ضخامت اور کثیر الجہتی بھی نظر آتی ہے۔ اس میں افسانے کی فسوں کاری بھی کارفرما ہے اور آپ بیتی اور جگ بیتی کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ اس میں رپورتاژ کی شخصی جھلکیاں بھی ہیں اور روداد نگاری کا مشاہداتی عنصر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ الغرض اس صنفِ ادب کو بقول غفور شاہ قاسم ” اُم الاصناف کہا جائے تو بے جانہ ہو گا۔ غفور شاہ قاسم اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

”سفر نامہ لاعلمی کے حصار میں کھلنے والی ایک ایسی کھڑکی ہے جس میں جھانک کر قاری اپنے آپ کو نئی معلومات، نئے علاقوں اور نئے علوم سے آشنا کرتا ہے ۔۔۔۔ سفر نامے میں چونکہ رپورتاژ، افسانے، روزنامچے، خطوط، ناول، خودنوشت اور داستان جیسی اصناف کا تھوڑا تھوڑا ذائقہ موجود رہتا ہے، لہٰذا سفر نامے کو ” اُم الاصناف “ کہنا بے جانہ ہو گا“۔ ۲؎

ہر ادب کا کچھ نہ کچھ افادی پہلو ہوتا ہے جو اس کی افادیت اور مقبولیت کا ضامن بنتا ہے۔اس تناظر میں اگر سفر نامے کو لیا جائے تو وہ بھی اس حوالے سے کسی سے پیچھے نہیں۔سفر نامہ اگرچہ بظاہر مشاہدات ، تجربات، حالات و واقعات اور سفری تاثرات کا ایک تحریری دستاویز ہے مگر اصلاً سفر نامہ مختلف علاقوں، تمدنوں، ثقافتوں اور تہذیبوں کو قریب تر لاتا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار و روایات کو اُجاگر کر کے اُن کا پرچار کرتا ہے۔انسان میں وسعتِ فکر و نظر اور ذہنی بالیدگی و پختگی پیدا کرتا ہے۔ انسان کو گروہی، علاقائی اور لسانی تعصبات کے محدود دائرے سے نکال کر اور اُنہیں دوسرے انسانوں کے قریب تر لا کر انھیں آفاقی محبت کا درس دیتا ہوا نظر آتا ہے۔اس کے لیے لازم ہے کہ سفر نامہ نگار کا مشاہداتی ذوق و شوق فن کے اس معراج پر ہو کہ وہ اپنی تخلیق کے فنی لوازمات کو بطریقِ احسن نباہ سکے۔جس طرح ایک ماہر مصور اپنی تصویر میں رنگ بھرنے کے تمام مراحل جانتا ہے بالکل اسی طرح ایک تخلیق کار کو بھی اپنی تخلیق کی تمام مبادیات کا علم از بر ہونا ضروری ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر انور سدید نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ”سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور اس مشاہدے کو سفر نامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کے تحرک کو محسوس کر لیتا ہے اور اس میں مکمل کامیابی اسے اس وقت ہوتی ہے جب سفر نامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو“۔ ۳؎

سفر نامے میں مرکزی کردار سفر نامہ نگار کا ہوتا ہے وہ اپنی ذات اور شخصیت کے حوالے سے اپنے اوپر گزرنے والے احوال اور روداد بیان کرتا ہے اس لیے اس میں دوسرے اصناف نثر کی نسبت نِت نئے تجربات کی گنجائش کم ہوتی ہے۔البتہ ایک اچھا تخلیق کار اپنی تخلیق کو مؤثر بنانے کے لیے ایسا طریقہ اپنا لیتا ہے جو سفر نامے کے عین مزاج کے مطابق ہوتا ہے،وہ طریقہ اور اندازِ تحریر سفر نامے کی تکنیک بن جاتی ہے۔قدیم اور جدید سفر ناموں میں یہ چیز مشترک رہی ہے کہ تمام اسفار کو بیانیہ انداز میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ بعض سفر نامہ نگاروں کے ہاں سفر ناموں کو دلچسپ اور پر تاثیر بنانے کے لیے کچھ نئے تجربات بھی سامنے آئے ہیں مثلاً کسی نے اپنی یادداشتوں کو ڈائری یا روزنامچے کی صورت میں لکھ کر جوں کا توں قاری کے سامنے پیش کر دیا۔ کسی نے اپنا سفر نامہ خطوط کی صورت میں قلم بند کیا تو بعض نے

زمانۂ ماضی میں جا کر اپنی سوچوں اور یادوں کو مجتمع کرنے کا طریقہ اپنایا مگر دوسرے تمام تجربات کی نسبت سفر نامے میں بیانیہ تکنیک کو قارئین کی جانب سے بڑی پذیرائی ملی ہے اور اُن کے ایک بڑے حلقے نے بیانیہ طرزِ تحریر کو پسند کیا ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم و جدید سفر ناموں میں جن سفر ناموں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے ان سب میں بیانیہ طرز مشترک رہا ہے۔

ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اُس دور میں موجود لوگوں کی اپنی ضروریات اور ترجیحات ہوتی ہیں لٰہذا ہر دور کا ادیب اپنے زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ایسی تخلیقات تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے جو لوگوں کے مزاجوں سے ہم آہنگ ہو۔ چونکہ گزرے ہوئے زمانوں میں زمانۂ جدید کے مقابلے میں انسانوں کی ذہنی سطح اور علمی استعداد نسبتاً کم رہا ہے اس لیے اُس زمانے کے ادیبوں کے ہاں یہ چیز بہت واضح نظر آتی ہے۔ صنفِ سفر نامہ نگاری پر بھی اس چیز کا اثر و نفوذ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم سفر نامہ نگاروں کی طرزِ تحریر میں ایک بے کیفی اور سپاٹ پن ملتا ہے۔ وہ داخل سے زیادہ خارج پر توجہ دیتے ہیں اور اُن کی تخلیقات کے پس پردہ مقصدی پہلو اُس کی تخلیق کی روح کو مجروح کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدید دور کا سفر نامہ نگار آج کے قاری کی ترجیحات، اُن کی علمی استعداد اور اُن کی فکری و نظری کشادگی سے واقف ہے اس لیے وہ افسانوی اور مَن گھڑت قصے کہانیوں پر وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ وہ حقائق پر توجہ دیتا ہے اور اُن کو پوری ذمہ داری اور صحت و قطعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ سفر نامے میں ان تبدیلیوں کی جانب مظہر فریدی اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "زمانے نے کروٹ لی، سائنس اور ٹیکنالوجی نے اساطیری اور دیومالائی کہانیوں کو پسِ پشت ڈال کر حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کا نیا طرز بیدار کیا۔ وقت کی کمی نے طویل داستانوں کو پڑھنے سے باز رکھا۔ لٰہذا افسانے مقبول ہوئے اور اب " سفر نامہ " اپنی افادیت مسلّم کرتا نظر آتا ہے۔ جہاں سفر نامے میں متعلقہ علاقہ جات کے مناظر، رسوم ورواج، عقائد وغیرہ ہوتے ہیں وہیں ہر انسانی کمزوری کے سب سامان حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر بھی ہوئے ہیں۔ ہر علاقے کی منفرد اور دلکش و دل فریب رسومات کے علاوہ حسن کی چیرہ دستیاں بھی اپنا سکّہ جماتی ہیں اور " جدید سفر نامے " میں یہ عنصر نمایاں ہے۔ [۴]

انگریزوں کی آمد کے بعد جہاں اُردو ادب کے دوسرے اصناف کو فروغ ملا وہاں اُردو سفر نامے نے بھی کروٹ لی اور وہ جدید اور متنوع موضوعات کو قبول کرنے لگا۔ سفر نامہ نگار کی نگاہیں خارج سے ہٹ کر داخل کی جانب مبذول ہوئیں۔وہ انسان کے باطن میں جھانک کر نفسیاتی گتھیاں سلجھانے لگا۔ سفر نامہ نگار کا مزاج تحقیقی اور تخلیقی بن گیا۔ اُنھوں نے تخیل کی رنگ آمیزی سے حقائق کو ایسے شگفتہ اور پر کشش انداز میں پیش کیا کہ جس نے نہ صرف قاری کے ذوقِ جمالیات کی تسکین کی بلکہ اُن کے جذبات و احساسات میں طوفان برپا کر اُنہیں نئے تجربات اور نئے جذبوں سے آشنا کیا یہی وجہ ہے کہ آج کا جدید سفر نامہ ہمہ رنگ، ہمہ جہت ہونے کے ساتھ گذشتہ ادوار کے سفر ناموں سے بالکل ایک بدلے ہوئے انداز میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"قدیم سفر نامہ زیادہ تر خارجی کوائف جمع کرتا تھا لیکن جدید سفر نامے نے خارج اور داخل دونوں جہتوں کا احاطہ کیا ہے اور اب سفر نامہ ایک ایسی صنف کی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں داستان، کہانی اور آپ بیتی کے بیشتر عناصر شامل ہیں۔ تخلیقی اُسلوب کی آمیزش نے اس میں شعری کیفیت بھی پیدا کر دی ہے چنانچہ سفر نامہ صرف نئے ملکوں اور براعظموں کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ سیاح کے داخل میں آباد دنیا کی بھی دریافت ہے اور اب یہ دو دنیاؤں کے سنگم پر تخلیق ہو رہا ہے۔ ۵ ؎

جدید دور کے صفِ اوّل کے سفر نامہ نگاروں کی فہرست پر نظر دوڑائی جائے تو اس میں مستنصر حسین تارڑ کا نام بھی ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اُردو سفر نامے کو ایک ایسی جہت سے آشنا کیا اور اُنہیں ایک ایسا طرز اور اُسلوب دیا جس نے ناول، افسانے اور ڈرامے کی طرح سفر نامے کو بھی مقبولِ عام بنا دیا۔ مستنصر سے پہلے اُردو سفر نامہ موجود تو تھا اور گاہے بگاہے اسے لکھا بھی جاتا تھا مگر اُس کا قاری نہ ہونے کے برابر تھا، یہی وجہ تھی کہ سفر نامہ اُردو ادب میں ایک بے جان صنف کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور اسے سوتیلی ماں کا درجہ دیا جاتا تھا مگر یہ مستنصر حسین تارڑ ہی ہیں جو اپنے قلم کی نیرنگی سے، تصورات و تخیلات کی چاشنی سے، اپنے اُسلوب کی شگفتگی سے اور اپنے الفاظ کی جادو بیانی سے سفر ناموں کی دنیا میں ایک ایسا انقلاب لائے جس نے قاری کے مَن کی دنیا بدل دی، جس نے قاری

کے مزاج اور نفسیات کو بدل دیا اور جس نے سفر نامے کو قابل مطالعہ تحریر کا درجہ دے کر اُردو ادب پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ڈاکٹر رشید امجد اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''سفر نامہ نگار کی حیثیت سے مستنصر حسین تارڑ کا نام ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔اُن کے سفر نامے کی دو بنیادی خصوصیات اُن کا اُسلوب اور سفر نامے کی ثقافتی عکاسی ہے جو اُن کو دوسرے سفر نامہ نگاروں سے ممتاز بناتی ہے''۔ ۶؎

مستنصر حسین تارڑ نے ہر صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔انہوں نے ڈرامے لکھے بھی ہیں اور اُن میں بطور اداکار کام کرکے، اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ناول نگاری میں بھی اپنے فن کا جادو جگایا ہے۔ افسانہ نویسی میں لوگوں سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور صحافیانہ زندگی میں ایسے کالموں کی بنیاد ڈالی جس میں معاشرہ کا اصلی چہرہ بے نقاب نظر آتا ہے مگر مستنصر تارڑ کا اصلی ادبی میدان سفر نامہ نگاری ہے جس نے مستنصر کو ملکی ادیبوں کی صف سے اُٹھا کر بین الاقوامی ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ سفر نامہ '' نکلے تری تلاش میں '' سے آغاز ہوا اور تیس سفر ناموں کے اختتام پر بھی 'تلاش' ابھی تک جاری ہے۔اسی تلاش کی جستجو نے مستنصر کو شمالی علاقہ جات کی جانب مائل کیا جہاں محبوب کو تلاش کرتے کرتے 'کے ٹو'، 'نانگا پربت' ، ' سنولیک '' برفیلی بلندیاں' 'راکاپوشی' اور ' دیوسائی' کی خاک چھاننے لگے تو کبھی 'چترال'، 'ہنزہ'، کاغان اور سوات کی جانب جانکلے کہ شاید 'تلاش' کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے مگر شمالی علاقہ جات کے درجنوں بار سفر کرنے کے باوجود مستنصر ابھی تک 'تلاش یار' میں ہے۔جب بھی وہ کسے نئے خطے، نئی جھیل اور نئی بلندیوں کے بارے میں سنتا ہے تو اُس کی روح بے قرار ہو جاتی ہے اور اُس پر جنون اور دیوانگی کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جنون اور دیوانگی کی یہ حالت اُس وقت تک طاری رہتی ہے جب تک وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہ کرلے۔اس سیاحتی جنون کے بارے میں مستنصر حسین تارڑر قم طراز ہیں:

''شہباز خان کام کے آدمی نکلے، وہ سوات پر بہت سا کام کر چکے تھے اور میں سوات کے کام آگیا تھا یعنی کشتۂ سوات تھا۔ کہہ لیجئے کہ مجھے اِن دنوں سوات ہو گیا تھا جیسے لوگوں کو عشق ہو جاتا ہے۔ایسے ہی مجھے بھی کسی مقام کے ساتھ آشنائی کے بعد کچھ ہو جاتا ہے، کبھی ہنزہ ہو جاتا ہے، کبھی دریائے گھاگرا ہو جاتا ہے، تو جیسے ان دنوں مجھے نانگا پربت ہو چکا ہے، اُن دنوں سوات ہو گیا تھا۔ شہباز خان نے میرے زخموں پر مرہم رکھا اور سوات کی طرف سے

افاقہ ہوا تو مجھے گندھارا ہو گیا۔۔اس کا علاج بہت سارے لوگوں نے کیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ۷؎

مستنصر حسین تارڑ اُردو ادب میں ایک ایسے سفر نامہ نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں جن کی نظر میں سیاحت محض دل لگی نہی بلکہ عشق کی بازی ہے جسے وہ ہر حال میں جیتنا چاہتے ہیں۔ اُسے گھر کا آرام دہ بستر پسند نہیں۔ نت نئی دنیاؤں کی دریافت اور سیاحت اُن کا مشغلہ ہے۔ وہ پہاڑوں، پتھروں، سنگریزوں اور بلندیوں کے عاشق ہیں۔ یہی وجہ ہے اُنہوں نے اپنے معشوق کو پانے کے لیے ہر سختی، ہر تکلیف، ہر دشواری اور ہر ستم جھیلا۔ جس طرح ایک عاشق اپنے معشوق کا وصال حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی قربانی دیتا ہے بالکل وہی قربانی مستنصر نے بھی پیش کی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ انہی، سختیوں، کھٹنائیوں، دشواریوں، قربانیوں اور محبوب کے ہجر و وصال کی کہانیوں سے عبارت ہے جسے پڑھ کر آج کا قاری بھی ان کیفیات کو ایسے محسوس کرتا ہے جیسے یہ سب کچھ اُن پر گزرا ہو۔

مستنصر حسین تارڑ بظاہر تو پتھروں، پہاڑوں، کھیتوں اور بے جان چیزوں کا ذکر کرتے ہیں مگر بباطن ان سب بے جان چیزوں کو گویائی دے کر انسان سے ہم کلام کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں انسان کی اہمیت ہے اس لیے وہ فطرت کو انسان کے قریب تر لایا ہے۔ اُن کے سفر ناموں میں فطرت خود بول کر اپنی آپ بیتی سناتی ہے اور انسان ان آپ بیتیوں کو سن کر اپنی مَن کی دنیا آباد کرتا ہے۔ مستنصر کا کمال دیکھیئے کہ وہ خارج سے باطن تک کا سفر اور باطن سے خارج تک کا سفر ایسے غیر محسوس طریقے سے کرتے ہیں کہ قاری کے لیے زماں و مکاں کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہ ہپناٹزم کی کیفیت میں ان تمام مراحل سے گزرتا ہے مگر کہیں پر بھی اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، کہیں پر بھی وہ ٹھوکر نہیں کھاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مستنصر کے ساتھ قاری کا شعوری اور لاشعوری رابطہ ہوتا ہے۔ وہ قاری کو انگلی سے پکڑ کر نگر نگر گھماتا ہے، مناظر فطرت اور مظاہر فطرت کے جلوے دکھاتا ہے، جھرنوں اور چشموں کی گنگناہٹ سناتا ہے۔ کبھی تاریخ کو آواز دے کر واپس بلاتا ہے تو کبھی مختلف تہذیبوں کے رنگ دکھا کر اُن کو ورطۂ حیرت میں ڈالتا ہے۔ کبھی جلوۂ نسواں سے قاری کی نگاہیں خیرہ کرتا ہے تو کبھی انسان کا استحصالی رویہ دکھا کر قاری کی نفسیات جھنجھوڑتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ مردم شناس بھی ہیں اور نبض شناس بھی۔ وہ قاری کی نفسیات کو سمجھتا ہے۔ اُسے انسان ہونے کے ناطے قاری کی ضروریات اور ترجیحات کا پتہ ہے۔ وہ اپنے سفر ناموں میں جنس کا

موضوع کسی بے حیائی کی وجہ سے نہیں چھیڑتے بلکہ وہ اسے انسانی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اُس کی نظر میں جنسی رویہ ایک فطری اور قدرتی عمل ہے۔ اُس کے خیال میں اس سے اغماض برتنا یا چشم پوشی اختیار کرنا انسانی نفسیات کو کچلنے کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے گاہے بگاہے جنسی موضوع کو اپنی تخلیقات میں شامل کر کے قاری کی نفسیاتی اور جمالیاتی تسکین کا سامان کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں :

> "نفسیات کے مطالعہ نے ہمارے لکھنے والوں کو یہ احساس دلایا کہ جنس جذبہ خیر اور برکت کی چیز ہے۔ قدیم معاشرتی اقدار میں سب سے زیادہ اس رجحان کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی تھی اب علم نفسیات کی ترقی نے اسے زندگی کی بنیادی قدروں میں شامل کر دیا ہے"۔ ۸؎

مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر نامے گنجینۂ معلومات ہیں۔ اس میں تاریخی حوالوں کا بھی ذکر ملتا ہے اور گندھارا تہذیب کی کہانیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بدھ ازم کے بارے میں مستنصر کا مطالعہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُنہوں نے بدھا تہذیب و ثقافت اور اُن کی مذہبی عبادت کے بارے میں تفصیلاً لکھا ہے۔ قدیم تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ مستنصر حسین تارڑ نے مقامی اور علاقائی رسوم و رواج اور ثقافت کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ شمالی علاقہ جات کے لوگوں کی عادات، اُن کے پوشاک، اُن کے بولنے کا انداز، اُن کا معاشرتی رویہ، اُن کی مہمان نوازی، پیروں اور بزرگوں سے اُن کی عقیدت، اُن کے خلوت و جلوت کے قصے، عرس و مزارات، غرض ان علاقوں سے متعلق مستنصر نے ایک ایک بات بتائی ہے۔ وہ مقامی لوگوں سے گھلا ملا ہے۔ اُن کا مہمان بنا ہے۔ اُن کے ساتھ لین دین کی ہے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں اُن کا رقص، اُن کی مہارت اور موسیقی سے اُن کا لگاؤ دیکھا ہے۔ مستنصر نے خود بعض بزرگوں کے مزاروں پر جا کر حاضری دی ہے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ مستنصر نے مقامی عورتوں کو بھی نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ جہاں اُنہوں نے اُن کے حسن کے قصیدے لکھے ہیں وہاں اُنہوں نے عورتوں سے متعلق بعض مسائل کی نشان دہی بھی ہے۔ مستنصر نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اس میں پورا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ اس ضمن میں اشفاق احمد لکھتے ہیں :

"مستنصر کے قلم میں بڑا زور ہے۔ فقروں کی بناوٹ میں بڑا حسن ہے۔ بات کرنے میں بڑی شوخی ہے، پر اس کی سوچ ابھی جوان ہے۔۔۔۔۔ اس نے بہت سے سفر کیے ہیں اور بہت کچھ دیکھا ہے اور پرکھا ہے۔ اس پر بہت کچھ بیتا ہے پر یہ ابھی تک لکھتا کتاب و شنید سے ہے۔ ان ذاتی خزانوں کے بدلے میں غیروں کے پھلیاں بتاشے لے کر اُنہیں کڑکاتا ہے اور اپنا لہو پسینہ بہا کر پیسہ بناتا ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ یہ خرابی ہم سب میں موجود ہے کہ ہم کتاب بہ کتاب شاعر بنتے ہیں اور کتاب بہ کتاب قصہ گو، لیکن مستنصر کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو بہت چلتا پھرتا آدمی ہے، بہت میل ملاپ والا جوان ہے"۔۹۔

سفر نامے عمومی طور پر مشاہدات اور واقعات کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں مگر مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے واقعات اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ کرداروں کے حوالے سے بھی اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ جب بھی سیاحت پر نکلے ہیں تو انہوں نے اپنی ٹیم میں ایسے کرداروں کو شامل کیا ہے جو ہوتے تو عام لوگ ہیں اور حقیقی دنیا سے اُن کا تعلق بھی ہوتا ہے مگر اُن کی ذات میں ہمہ رنگ خوبیاں ہوتی ہیں۔ کون ہے جو "نانگا پربت" کے زندہ جاوید کردار نظامی صاحب، مطیع اور خواجہ صاحب کو بھول سکتا ہے یا پھر "کے ٹو کہانی" میں ڈاکٹر کی تلاش میں اخبار میں اشتہار دینا اور ڈاکٹر عمر جیسے کردار کا مل جانا جہاں سفر نامے کی فضا پر خوشگوار اثرات مرتب کر پایا ہے وہاں ڈاکٹر عمر کی ذاتی زندگی کے کئی پرت بھی کھل کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ہر بار سفر نامے میں تقریباً نئے کردار ہی سامنے لائے ہیں اور اپنے کمالِ فن سے ہر کردار کا ایسا شخصی خاکہ کھینچا ہے کہ قاری کی یاداشت میں اُس کردار کا ناک نقشہ پوری طرح بیٹھ جاتا ہے اور مستنصر اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ سیاحت کے دوران جس سے بھی ملاقات ہوتی ہے، وہ اس کردار کے حوالے سے کچھ ایسا خاص کہہ جاتا ہے کہ قاری کے ذہن سے اُس کی یاد محو نہیں ہوتی۔ پسّو کے ماسٹر حقیقت سے مستنصر اتنا متاثر ہوا ہے کہ وہ اپنے سفر ناموں میں اسے متعدد بار لاتے رہے ہیں یا بالفاظ دیگر مستنصر کی اُن سے ملاقات ہوتی رہی ہے یہاں تک کہ ماسٹر حقیقت کی موت کے بعد سفر نامہ " دیوسائی" میں اُس کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے بھی گئے ہیں۔ سفر نامے میں کرداروں اور واقعات کی ترتیب دے کر پہلے تو ان پر کسی ناول یا افسانہ کا گمان ہوتا ہے کیونکہ ان کے آغاز، عروج اور اختتام میں ایک توازن نظر آتا ہے لیکن جب ہم ان چیزوں سے

ہٹ کر دیگر عوامل اور عناصر کا جائزہ لیتے ہیں تو پھر ہمیں اپنا خیال تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ غرض مستنصر نے اپنے سفر ناموں میں حقیقی کرداروں سے جس طرح کام لیا ہے اور اُن کی شخصیت اور کردار کے مطابق اُن سب کو جس طرح آگے بڑھایا ہے اور سیاحت کے دوران جن افراد کو مستنصر نے متعارف کرایا ہے، ان سب کے اشتراک سے مستنصر نے سفر نامہ کی جو ہیئت اور جو ڈھانچہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے ان پر آپ بیتی اور جگ بیتی کے ساتھ ساتھ ناول اور افسانے کا گمان بھی ہوتا ہے۔

مستنصر کے سفر ناموں کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں جگہ بجگہ ایسے پُر مغز جملے اور اقوال زرّیں نظر آئیں گے کہ عقل حیران اور فکر انگشتِ بدنداں رہ جاتی ہے۔ ان مختصر الفاظ و تراکیب سے جہاں عقل و دانش کو جِلا ملتی ہے اور انسان کی بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کے دَر واہوتے ہیں وہاں مستنصر کی اعلیٰ ذہانت، اُن کی دور بینی اور اُن کی دانشوری کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ عام سیاح اور عام سفر نامہ نگار کا کام نہیں، یہ ملکہ، یہ استعداد اور عقل و دانش کا یہ معراج سال دو سال کی مشقت سے نہیں ملتا، بلکہ اس کے لیے برسوں پر محیط کٹھن ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اور بقول اقبال ہزاروں سال نرگس کو اپنی بے نوری پر رونا پڑتا ہے تب خاک کے پردے سے دیدہ وَر نکلتے ہیں۔ مستنصر کا شمار بھی اُن دیدہ وَروں میں ہوتا ہے۔ ذیل میں اُن کے سفر ناموں سے چند ایسے اقوالِ زریں پیش کیے جاتے ہیں جو مستنصر حسین تارڑ کی دیدہ وری کے ثبوت بھی ہیں اور اُن کے سیاحتی زندگی کے تجربات کا نچوڑ بھی۔ لکھتے ہیں:

> ”سفر ایک ایسی چھلنی ہے جس پر انسان کی تمام تر کمینگی اوپر آجاتی ہے۔ اُس کے تمام خول اُتر جاتے ہیں اور وہ قدرے اریجنل ہو جاتا ہے“۔ ۱۰؎

> ”آوارہ گرد اور کوہ پیما اس سیارے کی مخلوق نہیں ہوتے کیونکہ زمینی مخلوق کی طرح ان کی زندگی کا جواز مالی منفعت کے پیمانے میں تولا نہیں جاسکتا۔ اُن کے پاس اپنی اس ”بے مصرف“ زندگی کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ ۱۱؎

> ”آپ ہر اس شئے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو تجربہ کار ہو چاہے وہ ایک بوٹ ہو یا عورت“ ۱۲؎

> ”جنس مخالف ۔۔زن۔۔ عورت یا لڑکی کا جہاں کہیں بھی شائبہ ہو جائے وہاں موسم اور مزاج بدلتے ہیں اور لوگ چہکنے لگتے ہیں اگر نہیں چہکتے تو وہ یقیناً تیسرے جنس سے تعلق رکھتے ہیں“۔ ۱۳؎

طنز و مزاح ایک ایسا حربہ ہے کہ اگر ان کا استعمال صحیح طریقے سے کیا جائے تو اس سے کسی نثر پارے کی دل کشی اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس میں شگفتگی کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں طنز و مزاح کے عنصر کا جائزہ لیا جائے تو اُس کی تحریر میں یہ طنز و مزاح بالکل ایسا مزہ دیتا ہے جیسے کسی مزیدار ڈش میں نمک حسب ذائقہ ملایا گیا ہو۔ مستنصر نے الفاظ و محاورات کے بر محل استعمال سے اپنی تحریروں میں ایسی مزاحیہ کیفیت پیدا کی ہے کہ قاری کے ہونٹوں پر خود بخود ہنسی دوڑ جاتی ہے۔ مستنصر کا مزاح خود ساختہ نہیں بے ساختہ ہے۔وہ جانتا ہے کہ کون سا موقع مزاحیہ گفتگو کے لیے موزوں ہے اور یہ موقع محل مستنصر کے سفر ناموں میں خود بخود دَر آتا ہے اور وہ باتوں باتوں میں ایسی مزاح کی باتیں کر جاتے ہیں کہ قاری اپنی ہنسی کو روک نہیں پاتا۔ مستنصر کا کمال یہ ہے کہ وہ الفاظ کے ساتھ ساتھ کرداروں کے حرکات و سکنات سے بھی مزاح کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اُن کے کرداروں کی ہلکی پھلکی شرارتیں سفر نامے کی فضا پر ایسی خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہیں کہ قاری گھنٹوں اس خوشگوار کیفیت اور سرور سے نکل نہیں پاتا۔ سفر نامہ ”نانگا پربت“ میں نظامی صاحب کا تکیہ کلام ” اندازہ کرو“ کے بر محل استعمال سے مزاح کا وہ اعلیٰ معیار اپنے سفر ناموں میں اپنایا ہے جنہیں عالمی ادب میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیش کیا جاسکتا ہے۔ مزاح کے ساتھ ساتھ مستنصر نے ’طنز‘ کا بھی بڑی باقاعدگی سے استعمال کیا ہے۔ اُن کے طنز کی کاٹ چھری کی کاٹ سے زیادہ تیز ہے۔ مستنصر کے ہاں منافقت نہیں وہ جیسا باہر سے نظر آتا ہے ویسا ہی اس کا باطن بھی ہے اس لیے اُن کو معاشرے میں جہاں بھی اونچ نیچ نظر آئی ہے تو اُنہوں نے بغیر لگی لپٹی کے اُن پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ مارشلائی حکومتیں ہوں، سیاست دانوں کی منافقت اور عوام دشمنی ہو، انگریز میموں کے حیا سوز مناظر ہوں، مردوں کا عورتوں کے ساتھ ہتک آمیز سلوک ہو یا پورٹروں اور مزدوروں کا استحصالی رویہ ہو، ان میں سے کوئی بھی مستنصر کے قلم سے نہیں بچا ہے حتیٰ کہ مستنصر نے جا بجا اپنی ذات کو بھی طنز اور تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مستنصر کا طنز ایک زندہ اور مثبت شخص کا طنز ہے۔ اس کی طنز میں نفرت کا عنصر نہیں بلکہ اصلاح کا جذبہ شامل ہے۔ الغرض

مستنصر نے طنز اور مزاح دونوں کے ملاپ سے سفر ناموں کو وہ زبان عطا کی ہے جسے قاری جتنا پڑھتا ہے اتنا ہی وہ چٹخارے لیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں مثبت اور تعمیری جذبات بھی پروان چڑھتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ ایک محب وطن ادیب ہیں اور حب الوطنی کا یہ جذبہ اُن کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں سے واضح طور پر جھلکتا ہے۔ وہ شمال کے چپے چپے سے پیار کرتا ہے۔ وہ شمال کے پہاڑوں، بیابانوں، جنگلوں، برفوں، دریاؤں، جانوروں اور کھیتوں کھلیانوں کا تذکرہ ایسے پیار سے کرتا ہے جیسے کوئی عاشق صادق اپنے معشوق کا ذکر کرتا ہے۔ وہ شمالی مردوزن کی تعریفیں کرتا ہے۔ اُن کے امن دوستی کے قصے سناتا ہے۔ اُن کی محبتوں اور مہمان نوازی کی مثالیں دیتا ہے۔ مستنصر کی حب الوطنی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے شمالی علاقہ جات کا ملک کے دوسرے علاقوں سے فاصلے مٹادیے ہیں۔ ہزاروں لوگ صرف مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے پڑھ کر شمال کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور وہاں کی رنگارنگی، حسین مناظر اور وہاں کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مستنصر کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

کسی منظر کی الفاظ میں تصویر کھینچنے کو محاکات کہا جاتا ہے۔ مصور مختلف رنگوں کے امتزاج سے کسی چیز کی شبیہہ یا تصویر بناتا ہے جبکہ اس کے برعکس ادیب الفاظ کا سہارا لے کر کسی منظر کی لفظی تصویر کھینچتا ہے۔ اگر مصور اور ادیب دونوں اپنے اپنے کاموں میں مہارت رکھتے ہوں تو مصور کی بنائی ہوئی تصویر اور کسی ادیب کی الفاظ میں کھینچی ہوئی تصویر میں چنداں فرق نہیں ہوتا۔ مستنصر کا نام بھی اِن ہی ادیبوں میں شامل ہے جن کی محاکاتی مہارت مسلّم ہے۔ پھولوں کا بیان ہو یا برفیلی ہواؤں کا، وسیع و عریض سبزہ زاروں کی بات ہو رہی ہو یا سنگلاخ چٹانوں اور نوکیلے پتھروں کا، حوا کی بیٹی کے حسن کا تذکرہ ہو یا قدرت کے حسین نظاروں کا، ان تمام مناظر کی منظر کشی اور عکس بندی کرتے وقت مستنصر کا قلم ایسے چلتا ہے جیسے کسی ماہر مصور کا بُرش۔ مستنصر شوخ الفاظ کی بازیگری سے ایسا سماں کھینچتے ہیں کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر میں ہر چیز واضح اور ہر منظر خود دعوت نظارہ دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ مستنصر کی لفظی تصویریں اتنی جاندار اور واضح نظر آتی ہیں کہ قاری جوں جوں ان مناظر کا بیان پڑھتا ہے، اُس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کے سین کی طرح یہ سب مناظر ایک ایک کر کے دکھائی دیتے ہیں اور قاری ان مناظر کے حسن و جمال میں کھو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ مستنصر کے پاس ایک بیدار ذہن اور جذبات و احساسات سے بھرا ایک دل ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی منظر کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں تو صرف

ذہن اُن کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ اُن کا حساس دل بھی مستنصر کی رہنمائی کرتا ہے اور جب دل و دماغ کے اشتراک سے کسی منظر کا عکس اُبھرتا ہے تو اُس پر دل و جان سے فدا ہو جانے کو جی کرتا ہے اور یہی مستنصر کی کامیاب منظر نگاری کا راز ہے۔

مستنصر حسین تارڑ بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور سفر نامہ نگار گزرے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ تمام رنگ اُن کے سفر ناموں میں واضح طور پر جھلکتے ہیں۔ کرداروں اور واقعات کی متوازن ترتیب اسے ناول سے قریب تر لاتا ہے۔ سفر نامے میں موجود کہانی پَن سے اُس پر افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ مکالماتی اور موازناتی انداز تحریر سے ڈرامے کا تاثر اُبھرتا ہے اور مختلف مقامات کی سیاحت اور مختلف مناظر کی عکس بندی اُسے سفر نامے کا نام دیتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو مد نظر رکھ کر یہ بات بلاشک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ مستنصر کی سفری تخلیقات ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈراما نگاری اور سفر نامہ نگاری کا ایک ایسا آمیزہ ہے جس میں چاروں رنگوں کی آمیزش کے باوجود ہر رنگ کا الگ الگ اثر محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس سے لطف اُٹھا جا سکتا ہے۔ مستنصر کے سفر نامے پڑھ کر جہاں اس میں آپ بیتی کا مزہ ملتا ہے وہاں جگ بیتی بھی یہ مزا دوبالا کرنے کے لیے موجود ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے مستنصر کی آپ بیتی میں جگ بیتی پنہاں ہے اور اُس کی جگ بیتی سے اُس کی آپ بیتی مکمل ہوتی ہے تو بے جانہ ہو گا کیونکہ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ مستنصر نے دونوں کے امتزاج سے ایسی منفرد طرز تحریر تخلیق کی ہے کہ قاری کو ایک ہی سفر نامے میں دونوں رنگوں سے حظ اُٹھانے کا موقع میسر آتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے اندرون ملک لکھے گئے سفر ناموں کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں قاری کے جذبۂ تجسس کو مہمیز ملتا ہے۔ سفر نامہ میں ہر پل صورت حال اتنی تیزی سے بدلتی ہے کہ قاری سوچتا ہے کہ نجانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ خاص کر جب مستنصر کسی خطرناک آبی نالے کو عبور کرتے ہیں یا کسی تنگ و تاریک درّے میں سے ہو کر نکلتے ہیں جہاں معمولی سی غلطی انسان کو ہزاروں میٹر نیچے گہرائی میں گرا کر موت سے ہمکنار کر سکتی ہے اس وقت کا بیان اس قدر تجسس اور سسپنس سے بھرا ہوتا ہے کہ قاری کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے اور اُس کی سانس کی رفتار اُس وقت تک بحال نہیں ہوتی جب تک کہ سفر نامہ نگار خطرے سے باہر نکل نہیں جاتا۔ اس قسم کی طرز تحریر اکثر جاسوسی ناولوں میں نظر آتا ہے جہاں صورت حال ناقابل یقین رفتار سے بدلتی ہے اور ہر لمحہ نئی سچویشنز پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی اپنے سفر ناموں میں تحیر، تجسس، انکشاف، خوف اور سسپنس داخل کر کے اُنہیں

قاری کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ کر دیا ہے۔اس قسم کی طرز تحریر سے اُردو سفر نامے میں اتنی جان آگئی ہے کہ یہ دوسری اصناف ادب کے ساتھ مقابلے میں آگئی ہے۔وہ صنف ادب جسے پڑھنا تو در کنار آج تک کوئی درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا مستنصر کے منفرد طرز تحریر کی بدولت اتنا جاندار ہو گیا ہے کہ اُردو ادب میں ایک مستقل اور پائیدار صنف کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا ہے۔

شمالی علاقہ جات کے بارے میں دوسرے مصنفین نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس بارے میں متعدد سفر نامے دیکھنے کو ملتے ہیں مگر ہر سفر نامہ نگار کی کوشش صرف ایک ہی سفر نامے تک محدود ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے شمالی علاقہ جات کے بارے میں تواتر کے ساتھ بارہ سفر نامے لکھ کر عوام و خواص کے ساتھ ساتھ ادب کے ماہرین کو بھی حیران ہونے پر مجبور کر دیا ہے کیونکہ ایک ہی خطے کے بارے میں بار بار لکھنا اور ہر تخلیق میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ قاری ایک جیسی چیزوں اور ایک جیسی طرز تحریر کو پڑھ کر بہت جلد اُکتاہٹ اور بوریت کا شکار ہو جاتا ہے مگر مستنصر نے کمالِ مہارت سے اپنے تمام سفر ناموں میں اُن تمام لوازمات اور ترجیحات کا خیال رکھا ہے جو آج کے قاری کی ضرورت ہے۔دراصل مستنصر جدید دور کے قاری کی نفسیات سے آگاہ ہے۔ اُنھوں نے قاری کے لاشعور میں جھانک کر اُس کا انتہائی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔اُنہیں آج کے قاری کی جذبات و احساسات کا پیمانہ بھی معلوم ہے اور اُن کی پیچیدگیوں کا ادراک بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے سفر نامہ لکھتے ہوئے ان تمام باتوں کو مد نظر رکھا۔ جہاں تاریخی معلومات دینے کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں اُنھوں نے وہ ضرورت پوری کی۔ جہاں عوام کی نجی، معاشرتی اور ثقافتی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا چاہا وہاں اُنھوں نے اُنہی چیزوں کو بتانے پر اکتفا کیا جو قاری چاہتا ہے۔ چوٹیوں، جھیلوں، چشموں، برفانی تودوں، کھیتوں، کھلیانوں، سبزہ زاروں، مرغزاروں، پھولوں، پھلوں، دستکاریوں، مقامی غذاؤں، پوشاکوں، دستوروں، وہم پرستیوں، زبانوں، مذہبی عقیدوں، مختلف مسلکوں، انسانی مزاجوں، اُن کی چالاکیوں، مکاریوں اور عیاریوں، مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جنسی رویوں، انگریز میموں، اُن کی خصلتوں اور روّیوں، مختلف تہذیبوں، غرض مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں ہر اُس چیز کا ذکر کیا جن کا کسی نہ کسی حوالے سے انسان سے تعلق ہے۔ اُنھوں نے پتھروں اور بے جان اشیاء کو بھی قوتِ گویائی دے کر انسان سے ہم کلام کرایا ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کو بیان کر کے اُس کا حسین پہلو انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستنصر کو حسن سے پیار ہے اور ہر جگہ اسے

حسن کی تلاش رہتی ہے۔وہ کانٹوں میں بھی حسن دیکھنے کا متمنی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کا زندگی کا بیشتر وقت مکروہاتِ دنیا سے بہت دور پہاڑوں اور بیابانوں کی خاک چھانتے گزرا ہے اور وہاں وہ حسن کے جُویا ہوئے ہیں۔یہی وہ حسن ہے جس کا پر تو مستنصر کی تخلیقات میں سُچے موتیوں کی طرح جابجا بکھرا نظر آتا ہے۔

مستنصر کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا مطالعہ کرنے سے مجموعی تاثر یہ نکلتا ہے کہ اُن کی کامیابی کا زیادہ تر سہرا اُن کے اُسلوب اور طرزِ نگارش کو جاتا ہے کیونکہ کسی چیز کے بارے میں معلومات تو ہر ایک کے پاس ہوتی ہیں مگر محض معلومات کے حصول سے کام نہیں چلتا،اصل چیز اُن معلومات کو ایسے انداز، ایسے طریقے اور ایسے سلیقے سے پیش کرنا ہوتا ہے کہ دوسروں کے لیے اس میں کشش اور جاذبیت ہو،اُس میں کچھ ایسا جادو ہو جو سر چڑھ کر بولے ، اس میں ایسا نشہ ہو کہ قاری اسے پڑھتے ہوئے مخمور ہو جائے اور اس میں ایسی گہرائی اورایسی بلندی ہو کہ قاری کا سر چکرا جائے ، تبھی معلومات کے حصول کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ادب کے اس فارمولے سے اچھی طرح آگاہ تھے اس لیے اُنہوں نے سفر نامہ لکھنے کے لیے ایسا طرز تحریر اورایسا اُسلوب اپنایا جو نہ صرف اُس کی کامیابی کا ضامن بنا بلکہ اُنہوں نے اس منفرد اُسلوب کی بدولت اُردو سفر نامے کو وہ جدید رنگ عطا کیا جس سے اُردو ادب آج تک محروم تھا۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ شمالی علاقہ جات کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اُنہوں نے شمالی علاقہ جات کے بارے میں سفر ناموں کی شکل میں آج کے قاری کو ایک ایسی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور معلوماتی دستاویز مہیا کی ہے جسے اگر عام زبان میں شمالی علاقہ جات کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

حوالہ جات

۱۔	چند سفر نامہ نگار۔ ایک سرسری جائزہ	مظہر فریدی	ص:۱۲۲
۲۔	پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء سے تاحال	غفور شاہ قاسم	ص:۹۴۰
۳۔	ادب کہانی ۱۹۹۷ء	ڈاکٹر انور سدید	ص:۱۸۵
۴۔	چند سفر نامہ نگار ایک سرسری جائزہ	مظہر فریدی	ص:۸۷
۵۔	اُردو ادب میں سفر نامہ	ڈاکٹر انور سدید	ص:۴۷
۶۔	سیاہ ' آنکھ میں تصویر '	ڈاکٹر رشید امجد،	ص:۹۸
۷۔	سفر شمال کے	مستنصر حسین تارڑ	ص:۹
۸۔	عشق مستیاں	ڈاکٹر وحید قریشی	ص:۷
۹۔	مستنصر حسین تارڑ کا پکھیرو	اشفاق احمد	ص:۹۷
۱۰۔	نانگا پربت	مستنصر حسین تارڑ	ص:۲۶
۱۱۔	ایضاً		ص:۲۸
۱۲۔	سنولیک	مستنصر حسین تارڑ	ص:۴۹
۱۳۔	ایضاً		ص:۶۲

کتابیات

(BIBLOGRAPHY)

بنیادی مآخذ :

کتاب/سفر نامہ	مصنف	ناشر	سن اشاعت
برفیلی بلندیاں	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۲۰۰۴ء
چترال داستان	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۱۹۹۴ء
دیوسائی	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۲۰۰۲ء
راکاپوشی	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۲۰۰۴ء
رتّی گلی	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۲۰۰۶ء
سفر شمال کے	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۱۹۸۷ء
سنولیک	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۲۰۰۰ء
شمشال بے مثال	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۲۰۰۰ء
کے ٹو کہانی	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۱۹۹۳ء
نانگا پربت	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۱۹۹۱ء
ہنزہ داستان	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۱۹۸۵ء
یاک سرائے	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنزلاہور	۱۹۹۷ء

ثانوی مآخذ:

کتاب	مصنف	ناشر	سن اشاعت
آج کا اُردو ادب	ابو اللیث صدیقی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۶ء
آوارہ گرد کی ڈائری	ابن انشاء	مکتبہ دانیال، کراچی	۱۹۷۶ء
الاسکا ہائی وے	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
اندلس میں اجنبی	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر خالد محمود	قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۱ء
اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	اورینٹ پبلشرز لاہور	۲۰۱۴ ء
اُردو سفر نامے بیسویں صدی میں	ڈاکٹر قدسیہ قریشی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱۹۸۷ء
اردو ادب میں سفر نامہ	ڈاکٹر انور سدید	مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی لاہور	۱۹۸۹ء
آج کا اُردو ادب	ابو اللیث صدیقی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۶ء
ادبی نثر کا ارتقاء	ڈاکٹر شہناز انجم	پروگریسیو بک لاہور	۱۹۸۹ء
اردو ادب بیسویں صدی میں	پروفیسر حق نواز	مقبول اکیڈیمی لاہور	۱۹۸۸ء
اردو ادب بیسویں صدی میں	رشید امجد گوریجہ	علمی کتب خانہ لاہور	۱۹۹۹ء
اردو ادب بیسویں صدی میں	ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی	اُردو اکیڈیمی سندھ کراچی	۱۹۸۸ء
اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	ڈاکٹر سلیم اختر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۳ء
اُردو کے شاہکار سفر نامے	ضیاء ساجد	معراج الدین پرنٹرز، لاہور	۱۹۸۷ء
اُردو نثر کا فنی جائزہ	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اُردو اکیڈیمی، کراچی	۱۹۸۹ء
اُردو انشائیے کے ابتدائی نقوش	لطیف ساحل شرکت	پرنٹنگ پریس، لاہور	۱۹۹۴ء
اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سنبل نگار	دار النوادر، لاہور	۲۰۰۳ء
ارض پاک سے دیار فرنگ تک	ڈاکٹر عبادت بریلوی	گلوب پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۶۳ء
اصناف ادب کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر عطش درانی	میری لائبریری لاہور	۱۹۸۲ء
اصناف ادب	رفیع الدین ہاشمی	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۰ء
ادب کہانی	ڈاکٹر انور سدید	مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی لاہور	۱۹۹۷ء
اُسلوب	سید عابد علی عابد	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۱ء
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	ابن انشاء	لاہور اکیڈیمی لاہور	۱۹۷۴ء
اٹک کے اُس پار	فارغ بخاری، رضا ہمدانی	انشاء پریس لاہور	۲۰۱۰ء
ادبیات سرحد (جلد سوم)	فارغ بخاری	نیا مکتبہ، پشاور	۱۹۵۵ء
ادبی مطالعہ	عبد الشکور	گوشہ ادب لاہور	۱۹۵۶ء

ادبی مقالات	آل احمد سرور	کلیم وسیع اللہ پرنٹرز آگرہ	۱۹۴۳ء
اردو ادب ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۵ء	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبہ خیابان لاہور	۱۹۹۷ء
اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۸۵ء
اردو ادب کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر انور سدید	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۱ء
افسانے کی حمایت میں	شمس الرحمان فاروقی	دی سمیع سنز پرنٹرز کراچی	۲۰۰۴ء
اک طرفہ تماشا	غلام الثقلین نقوی	مکتبہ فکر و خیال لاہور	۱۹۸۶ء
اے بنی اسرائیل	قدرت اللہ شہاب	مکتبہ نقوش لاہور	۱۹۶۰ء
ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ	۱۹۵۶ء
افکار و مسائل	احتشام حسین سید	نعیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۶۳ء
اُردو میں تنقید	احسن فاروقی	ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
اُردو نثر میں طنز و مزاح	اشفاق احمد ورک	بیت الحکمت، لاہور	۲۰۰۴ء
ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	۱۹۹۳ء
انسان اور آدمی	حسن عسکری	مکتبہ جدید، لاہور	۱۹۵۳ء
ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	مکتبہ دانیال، کراچی	۱۹۷۵ء
اُردو میں اُصول تحقیق (جلد اول)	سلطانہ بخش	ڈویژن پبلشرز اسلام آباد	۱۹۸۹ء
ارباب سیف و قلم	آئی آر صدیقی	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد	۱۹۹۷ء
اُردو کے اہم مزاح نگار	اسد اللہ نیاز	کتاب سرائے لاہور	۲۰۱۲ء
اشاراتِ تنقید	ڈاکٹر سید عبداللہ	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۴ء
بجنگ آمد	کرنل محمد خان	مکتبہ جدید لاہور	۱۹۹۸ء
بر سبیل تنقید	انور سدید	مقبول اکیڈیمی لاہور	۱۹۹۰ء
بنگال میں اجنبی	ابراہیم جلیس	لارک پبلی کیشنز کراچی	۱۶۹۱ء
بیس نامور ادبی شخصیات	جاوید اختر بھٹی	مکتبہ عربیہ لاہور	۲۰۰۴ء
براہ راست	بشریٰ رحمن	ادارہ وطن دوست، لاہور	۱۹۸۳ء
پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال	ڈاکٹر سلیم اختر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۸ء
پاکستان میں اُردو کے خدوخال	ڈاکٹر عطش درانی	مکتبہ میری لائبریری لاہور	۱۹۹۷ء
پاکستانی اردو ادب کی تاریخ	ڈاکٹر انیس ناگی	جمالیات پاکستان	۲۰۰۴ء
پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء سے تاحال	غفور شاہ	قاسم بک ٹاک لاہور	۱۹۹۵ء
پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا	ایڈیٹر: عکسی مفتی	الفیصل ناشران، اُردو بازار لاہور	۲۰۰۴ء
پتلی پیکنگ کی	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۳ء

تاثرات و تجربات	پروفیسر صادق زاہد	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۱ء
تاریخ ادبِ اُردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی	مجلس ترقی ادب لاہور	۲۰۰۵ء
تاریخ ادب اُردو	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	راج کمار پریس لکھنؤ	۱۹۸۲ء
تاریخ ادب اُردو	محمد سہیل بھٹی	پاک ویژنز پرنٹر لاہور	۲۰۰۵ء
تحقیق و تنقید	اختر اورینوی	شاد بک ڈپو پٹنہ	س۔ن
تحقیق و تنقید	ڈاکٹر عبد السلام	اکیڈمی لائبریری کراچی	۱۹۶۵ء
تفہیم و تنقید	ڈاکٹر حامد کاشمیری	امجد پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۹ء
تاریخ صوبہ سرحد	شفیع صابر	یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور	۱۹۸۶ء
تحقیق و تنقید	فرمان فتح پوری	ماڈرن پبلی کیشنز، کراچی	۱۹۶۳ء
تحقیق کا فن	گیان چند	مقتدرہ قومی زبان اُردو	۱۹۹۴ء
تقابلی جائزے	عبد العلیم صدیقی	مکتبۂ عالیہ، لاہور	۱۹۷۹ء
تلاش و تنقید	پروفیسر کامل قریشی	انڈین کلچرل انسٹی ٹیوٹ ہاؤس	۱۹۹۳ء
تماشا میرے آگے	جمیل الدین عالی	غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۷۵ء
تنقید و تجزیہ	ڈاکٹر نعیم نقوی	غضنفر اکیڈمی پاکستان	۱۹۸۵ء
تنقیدی مقالات	پروفیسر منور رؤف	تاج کتب خانہ پشاور	۱۹۹۴ء
تنقیدی مقالات	ڈاکٹر طاہر تونسوی	طاہر اسلم کورا لاہور	۱۹۹۵ء
تمدنِ ہند	مترجم مولوی سید	بلگرامی اکیڈمی لائبریری کراچی	۱۹۸۳ء
ترکی میں دو سال	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ادارہ ادب و تنقید لاہور	۱۹۸۶ء
جدید ادبی اور لسانی تحریکیں	یونس خان ایڈوکیٹ	دعا پبلیکشنز لاہور	۲۰۰۳ء
جدید پاکستان ادب	خالد احمد	مکتبہ بیاض، لاہور	۱۹۹۶ء
چلتے ہو تو چین کو چلیئے	ابن انشاء	مکتبۂ دانیال کراچی	۱۹۶۷ء
حیاتِ جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	مکتبۂ عالیہ، لاہور	۱۹۸۲ء
خانہ بدوش	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
داستان تاریخ رپور تاژ نگاری	ڈاکٹر ظہور احمد اعوان	ادارہ علم و فن پاکستان	۱۹۹۹ء
دھنک پر قدم	بیگم اختر ریاض الدین	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۱۲ء
رضا ہمدانی ایک ادبی عہد ایک تحریک	ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار	نیو اتفاق پرنٹنگ پریس لاہور	۲۰۰۶ء
زمین اور فلک اور	انتظار حسین	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۷۴ء
'سخن چند، دیکھ لیا ایران'	افضل علوی	لاہور اکادمی لاہور	۱۹۷۳ء
سفر نامۂ پنجاب	سر سید احمد خان	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۱ء

سفر زمینِ حافظ وخیام	مقبول بیگ بدخشانی	مکتبۂ اسلوب، کراچی	۱۹۷۷ء
سفرنامہ روم ومصروشام	مولانا شبلی نعمانی	پولیمر پبلی کیشن، لاہور	۱۹۷۱ء
سیر ایران	مولانا محمد حسین آزاد	ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ	۱۹۷۴ء
سیاہ آنکھ میں تصویر	ڈاکٹر رشید امجد	ادارہ ادب وتنقید لاہور	۲۰۰۳ء
چند سفر نامہ نگار۔ایک سرسری جائزہ	مظہر فریدی	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۲ء
شندور کی کالی جھیل	شمیم حسن خان	ڈائریکٹوریٹ آف کلچر، خیبر پختونخوا	۲۰۱۲ء
ظرافت اور تنقید	احمد جمال پاشا	بہار اُردو اکیڈمی، بہار	۱۹۸۲ء
عجائباتِ فرنگ	مرتب تحسین فاروقی	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۵ء
غارِ حرا میں ایک رات	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
عشق مستیاں	ڈاکٹر وحید قریشی	ادارہ علم وفن پاکستان	۲۰۰۳ء
کشاف تنقیدی اصطلاحات	ابوالاعجاز صدیقی	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۵ء
کالاش (ڈرامائی سفر نامہ)	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
کاروان سرائے	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
لوح غیر محفوظ	فارغ بخاری	ادارہ علم وفن پاکستان	۱۹۸۷ء
ماسکو کی سفید راتیں	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
منہ وَل کعبے شریف	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
موسموں کا عکس	مشفق خواجہ	مکتبہ انجم لاہور	۱۹۹۱ء
مسافرانِ لندن	سر سید احمد خان	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۱ء
مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں تکنیک کے تجربات	سلمیٰ اسلم چترالی	پی ایچ ڈی مقالہ (غیر مطبوعہ)	۱۹۰۴ء
مستنصر حسین تارڑ کا پکھیرو	اشفاق احمد	مشمولہ، عالمی فروغ اُردو ادب ایوارڈ	۱۹۹۹ء
نانگا پربت کے حضور	اجمل سعید پراچہ	علم وعرفان پبلشرز، لاہور	۲۰۰۳ء
نانگا پربت	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
نکلے تیری تلاش میں	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
نیپال نگری	مستنصر حسین تارڑ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۰۴ء
نظر نامہ	محمود نظامی	گوشۂ ادب لاہور	۱۹۵۸ء
ہمالیہ کے اس پار	مرزا ادیب	مکتبہ انجم لاہور	۱۹۸۳ء
ہندوستان عربوں کی نظر میں	معین الدین ندوی	ماڈرن پبلی کیشنز، کراچی	۱۹۹۳ء

ہمارا ادب	آل احمد سرور	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۸ء
ہمارے عہد کا ادب اور ادیب	ابو الخیر کشفی	قمر کتاب گھر، کراچی	۱۹۷۱ء
ہزار داستان	آفتاب عالم صدیقی	نیا آرٹ پریس، پشاور	۱۹۸۸ء
ہمالیہ کے اُس پار	مرزا ادیب	مکتبہ انجم لاہور	۱۹۸۳ء

رسائل و جرائد

۱۔	ادب لطیف	سالنامہ جنوری	لاہور	۱۹۳۹ء
۲۔	ادبیات	شمارہ ۱۶	اسلام آباد	۱۹۹۱ء
۳۔	اوراق	جنوری فروری شمارہ	لاہور	۱۹۷۸ء
۴۔	اُردو ڈائجسٹ	ماہنامہ	لاہور	۱۹۷۵ء
۵۔	اوراق	جنوری شمارہ	لاہور	۱۹۸۹ء
۶۔	بیاض	شمارہ ۱۱	لاہور	۱۹۸۰ء
۷۔	خیابان	پاکستان میں اُردو ادب	پشاور	۱۹۶۵ء
۸۔	خیابان	ششماہی تحقیقی مجلہ	پشاور	۲۰۱۰ء
۹۔	روایت	بیادِ سلیم اختر	لاہور	۱۹۸۷ء
۱۰۔	قومی زبان	شمارہ ۷	اسلام آباد	۲۰۰۸ء
۱۱۔	معاصر	عطاء الحق قاسمی نمبر	لاہور	۲۰۰۰ء
۱۲۔	معیار	شمارہ ۸	اسلام آباد	۲۰۱۲ء
۱۳۔	نقوش	طنز و مزاح نمبر	لاہور	۱۹۷۱ء
۱۴۔	نقوش	خاص نمبر	لاہور	۱۹۶۹ء
۱۵۔	نگار	اصناف ادب نمبر	کراچی	۱۹۶۶ء

اُردو اخبارات

☆	جنگ سنڈے میگزین	لاہور	۲۴/اپریل ۲۰۰۵
☆	روزنامہ اوصاف	راولپنڈی	۱۴جون ۲۰۰۴ء
☆	روزنامہ سیاست	لاہور	۲۴/اپریل ۲۰۰۵ء
☆	روزنامہ جنگ	لاہور	۱۱/اکتوبر ۱۹۹۹ء
☆	سنڈے پاکستان	لاہور	۷/مارچ ۱۹۹۹ء
☆	عزم (ہفت روزہ)	لاہور	اگست ۲۰۰۶ء

لغات / انسائیکلوپیڈیا

☆ جامع اُردو لغات، بک کارنر شوروم جہلم۔ ۲۰۰۹ء

☆ علمی اُردو لغت، علمی کتاب خانہ لاہور، ۱۹۸۰ء

☆ فرہنگ آصفیہ، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ لاہور، جلد چہارم طبع دوم ۱۹۷۴ء

☆ فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد طبع اول۔ ۱۹۸۹ء

☆ فیروز اللغات، نیا ایڈیشن فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۵ء

☆ کتابستان ڈکشنری، مرکزی اُردو بورڈ لاہور۔ ۱۹۹۵ء

☆ نور اللغات، نیا ایڈیشن، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور۔ ۱۹۸۵ء

English Dictionaries

* **Dictionary of World Literature , World Publishing Company, 1990**
* **Oxford Dictionaries of English, Oxford Press , 1926**
* **Oxford English Urdu Dictionary Edited by Shanul Haq Haqqee Oxford University Press 2003.**
* **The Oxford Guide to English Language , Tokyo Oxford Press , 1987.**

* The New Oxford Dictionary of English Edited by Judy Pearsell Oxford Clarendon Press 1998.
* Webster's Dictionary, World Publishing Company, 1996.

انٹرنیٹ ویب سائٹس:

i: *beta.dawn.com/interview-mustansar*

ii: *hamariweb.com/dictionaries*

iii: *www.urdudost.com*

iv: *www.urdughar.com*

v: *www.kitabghar.com.*

vi: *www.urdupoint.com*

vii: *www.ebook.com*

viii: *www.urdustan.com*

ix: *www.bbcurdu.com*

x: *wikipeadia.org/mustansar_hussainTarar*

xi: *www.urdubooks.com*

xii: *www.vebidoo.com/mustansar+shahzad*

xiii: *www.dunyaurdu/mustansar-hussain-Tarar*